خشونت سنگھ
رنجیت سنگھ
پنجاب کا مہاراجا
ترجمہ: زبیر قریشی

خشونت سنگھ

خشونت سنگھ کا شمار ہندوستان کے معروف ترین لکھاریوں میں ہوتا ہے۔ وہ ملک کے مشہور جریدے 'یوجنا' کے بانی مدیر کی حیثیت سے بھی کام کرتے رہے۔ اس کے علاوہ 'السٹریٹڈ ویکلی آف انڈیا'، (Illustrated Weekly of India)، "نیشنل ہیرالڈ" (The National Herald) اور "ہندوستان ٹائمز" (Hindustan Times) سمیت دیگر کئی موقر جریدوں کے مدیر کی حیثیت سے ذمہ داریاں نبھائیں۔ خشونت سنگھ کئی کتب کے مصنف تھے جن میں اُن کے پانچ ناول "اے ٹرین ٹو پاکستان"، (A Train to Pakistan) "آئی شل ناٹ ہیئر دا نائٹینگیل"، (I Shall not Hear the Nightingale) "دہلی"، "ان دا کمپنی آف ویمن" (In the Company of Women) اور "بیریل ایٹ سی"، (Burial at Sea) دو تحقیقاتی کتب "اے ہسٹری آف سکھ (دو جلدیں)" (A History of the Sikhs) اور بہت سے تراجم شامل ہیں۔ نان فکشن میں خشونت سنگھ نے سکھ مذہب اور ثقافت کے حوالے سے بہت سی شہرہ آفاق کتب تحریر کی ہیں۔ ان کی تحقیقاتی کتب کے دیگر موضوعات میں دہلی شہر اس کی تاریخی حیثیت، رسوم و رواج اور اردو شاعری شامل ہیں۔ خشونت سنگھ کی سوانح 'ٹروتھ، لو اینڈ اے لٹل میلس' کو کلاسیک کا درجہ حاصل ہے۔ یہ کتاب 2002 میں شائع ہوئی۔

خشونت سنگھ 1980 تا 1986 بھارتی پارلیمان کے رکن رہے۔ 1974 میں انھیں ہندوستان کا اعلیٰ سول اعزاز پدم بھوشن دیا گیا جسے انھوں نے 1986 میں سکھوں کے مقدس ترین مقام گولڈن ٹیمپل امرتسر میں ہونے والے فوجی آپریشن کے خلاف احتجاجاً بھارتی حکومت کو لوٹا دیا۔ بھارتی حکومت نے 2007ء میں ایک بار پھر انھیں پدم وبھوشن کے اعزاز سے نوازا۔ برِصغیر کے اس بڑے ادیب کا 99 برس کی عمر میں 20 / مارچ 2014 کو دہلی میں انتقال ہوا۔

عقل مند شخص کبھی اپنے آقا کی حکم عدولی نہیں کرتا بلکہ ہمیشہ اس کا وفادار رہتا ہے اور جانتا ہے کہ اس خوبی کی بدولت وہ شہرت اور کامیابی کی بلندیوں کو چھو لے گا۔ جبکہ جھوٹ کسی بھی شخص کے لئے شرمندگی کا باعث ہوتا ہے۔ دروغ گو شخص کے لب اپنے مالک کے لئے خفت کا باعث بنتے ہیں۔ پس جو تمہارے مقدر میں لکھا ہے اس پر صبر شکر کرو؛ ہمیشہ سچ بولو، ایمانداری سے کام کرو تم دیکھو گے کہ لوگ تمہاری تعریف کریں گے اور میں ہمیشہ تمہاری حمایت اور مدد کروں گا؛ غریبوں سے معاملات طے کرتے ہوئے ان پر کبھی ظلم نہ کرو بلکہ آخرت کے بارے میں سوچو کہ جب سب لوگ دنیا سے گذر جائیں تو بھی تمہارا نام باقی رہے۔

مہاراجا رنجیت سنگھ کا دربارِ لاہور کے ایک افسر کے نام پیغام

(پنجاب کا مہاراجا)

خشونت سنگھ

ترجمہ

زبیر قریشی

عکاس پبلی کیشنز، اسلام آباد

دسمبر 2014ء

کتاب: رنجیت سنگھ (پنجاب کا مہاراجا)
مصنف: خشونت سنگھ
ترجمہ: زبیر قریشی
ناشر: عکاس پبلی کیشنز اسلام آباد
فون۔051.4442835
اہتمام: طارق نعیم
آئی ایس بی این نمبر: 978-969-8267-42-1
قیمت: 500 روپے

جڑواں شہروں

لاہور

اور

امرتسر کے نام

فہرست

عرضِ مترجم	------------	زبیر قریشی	09
تعارف	------------	خشونت سنگھ	13
ابتدائیہ: سکھ	------------		17
1	------------	رنجیت سنگھ کے آباؤ اجداد، پیدائش، اور شروع کے سال	23
2	------------	پنجاب اور افغان لشکر کشی	28
3	------------	پنجاب کا مہاراجا	37
4	------------	امرتسر پر قبضہ اور فوج کا انتظامِ نو	52
5	------------	انگریز اور مراٹھے	57
6	------------	پیشے کے لحاظ سے ایک سپاہی	62
7	------------	دوست اور دریا	67
8	------------	کانگڑہ پر قبضہ اور مغربی پنجاب کا انضمام	87
9	------------	ایک پنجابی شادی	94
10	------------	کشمیر اور کوہِ نور	96
11	------------	اٹک میں فتح کشمیر میں شکست	102
12	------------	ملتان پر قبضہ	110
13	------------	پشاور اور کشمیر پر قبضہ	116

14	-------------	رنجیت سنگھ اور اس کے فرنگی	125
15	-------------	جنگِ نوشہرہ (نوشہرہ کے مقام پر جنگ)	135
16	-------------	دوستی کی کونپل اور اُس کی آبیاری	143
17	-------------	سندھ: سنہرے پیرہن کی سرزمین	150
18	-------------	برطانوی حصار کی ٹوٹ پھوٹ	168
19	-------------	شہزادہ نونہال کی شادی اور ہولی کا جشن	175
20	-------------	سندھ کی فوج	181
21	-------------	آخری باب	190
	-------------	حوالہ جات	199
	رنجیت سنگھ: پنجاب کا مہاراجا---	نجیبہ عارف	225

عرضِ مترجم

پنجاب کے مہاراجا رنجیت سنگھ (پیدائش: 1780، وفات: 1839) کے بارے میں خشونت سنگھ کی انگریزی میں لکھی گئی اس شہرہ آفاق کتاب کو پڑھنے کے بعد میں اس کا اردو ترجمہ کرنے پر مجبور ہو گیا۔ ایسا کرنے کی دو وجوہات ہیں۔ پہلی وجہ تو یہ کہ اس کتاب میں انیسویں صدی کے اوائل (یعنی جب پنجاب پر سکھوں کی حکومت تھی) کے شہروں مثلاً لاہور، راولپنڈی، قصور، ملتان، پشاور، گوجرانوالہ، جھنگ، لیہ، بھکر، میانوالی، عیسیٰ خیل، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازیخان، کوٹ مٹھن، روجھان، بنوں، پنڈی بھٹیاں، گجرات، خوشاب، نارووال، سرگودھا، منکیرہ اور دیگر کا ذکر بار بار ملتا ہے۔ یہ تمام شہر میرے اپنے ہیں ان کی فضاؤں میں مجھے سانس لینے کا موقع ملا ہے۔ ان شہروں سے میری خوشگوار یادیں وابستہ ہیں۔ میں جاننا چاہتا تھا کہ انگریزوں کے اس خطے پر قبضے سے پہلے یہاں کے لوگوں کی بود و باش کیا تھی اور مہاراجا رنجیت سنگھ نے اتنے بڑے رقبے پر پھیلے ان شہروں کا نظم و نسق آخر کیسے چلایا، آخر کیا وجہ تھی کہ یہاں کی آبادی کی اکثریت مسلمان ہونے کے باوجود مطمئن اور شاد زندگی گزارتی رہی اور کسی بھی موقع پر سکھوں کے خلاف اٹھ کھڑی نہیں ہوئی۔

اس کتاب میں ان تمام سوالوں کا جواب موجود ہے۔ حقیقت تو یہ ہے کہ لاہور دربار کی فوج میں نہ صرف دوسرے علاقوں سے لوگوں کی بڑی تعداد بھرتی ہونے آئی یورپ خصوصاً فرانس کے سپاہیوں نے تو جوق در جوق دربار کی فوج میں شمولیت اختیار کی۔ دریائے ستلج کے پار دہلی جہاں انگریزوں کی حکومت قائم تھی سے بھی بڑی تعداد میں ہندوستانی سپاہی و افسران لاہور آ کر مہاراجا کے دربار سے وابستہ ہوتے رہے۔ 1801 میں لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد 1839 تک مہاراجا رنجیت سنگھ زندہ رہا اور اس دوران اس کی فوجی قوت میں مسلسل اضافہ ہوتا رہا۔ یہ دور سکھ سلطنت کے عروج کا دور تھا۔

پاکستان کے ایک عام قاری کے پاس دستیاب معلومات انیسویں صدی کے وسط کے بعد کے ہندوستان کی ہیں اور وہ بھی 1857 کی جنگِ آزادی کے بعد کی۔ اگر چہ اس علاقے پر سکھ کم و بیش پچاس برس حکومت کرتے رہے اور ان کی تہذیب و تمدن کے نشان آج بھی یہاں ملتے ہیں مگر افسوس ہماری درسی کتب اس حوالے سے خاموش ہیں اور مورخین کی اکثریت تو اس

حقیقت کو تسلیم کرنے سے بھی ہچکچاتی ہے۔ ہماری درسی کتب میں 711 عیسوی میں محمد بن قاسم کے سندھ پر حملوں کا ذکر تو موجود ہے مگر رنجیت سنگھ کے 1801 میں لاہور پر قبضے سے لیکر اسکی وفات یعنی 27 جون 1839 تک اس تمام خطے پر رونما ہونے والے ثرات کے بارے میں کچھ نہیں بتایا گیا۔ میں نے سوچا شاید اس کتاب کے مطالعہ سے قاری کو انگریزوں کے قبضے سے پہلے کے لاہور، کشمیر، پشاور اور بڑی حد تک کابل کی ایک جھلک دیکھنے کو مل جائے۔ دوسری اہم وجہ اُس غلط فہمی کا ازالہ کرنا ہے جو روایتی طور پر رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت سے جڑی ہے۔ جس کے مطابق وہ ایک ایسا راجہ جو نہ صرف بدہیئت تھا (وہ ایک آنکھ سے کانا، قد کا چھوٹا تھا اور اس کا چہرہ چیچک کے داغوں سے بھرا ہوا تھا) بلکہ اس کے دورِ حکومت میں پنجاب شدید بدانتظامی اور ناانصافی کا شکار تھا۔ حقیقت اس کے برعکس ہے رنجیت سنگھ اس خطے میں غالباً واحد حکمران گزرا ہے جس کے دورِ حکومت میں ایک قیدی کو بھی پھانسی کی سزا نہیں دی گئی اس کے علاوہ اس کے دربار میں مسلم، ہندو، سکھ اور حتیٰ کہ انگریزوں کو بھی برابر کی جگہ ملتی۔ رنجیت سنگھ کے دربار کے دو اہم ترین وزیر، وزیر خارجہ فقیر عزیز الدین اور میاں غوثا مسلمان ہی تھے۔ رنجیت سنگھ مسلسل سیاسی انتظامی اور فوجی ارتقا سے گزرتا رہا اس کے دن کا بیشتر حصہ فوجی مشقوں کا معائنہ کرتے، مشیروں وزیروں سے صلاح مشورہ کرتے گزرتا۔ دربار سے وابستہ یہ دانشور اور سیاسی مدبر مہاراجا کو بہترین طریقے سے امورِ سلطنت چلانے کا مشورہ دیتے۔ انھیں معلوم تھا کہ قریب ہی دلی میں بیٹھا انگریز للچائی نظروں سے لاہور کی جانب دیکھ رہا ہے ذرا سی بھی سیاسی و انتظامی غلطی یا ایک عقیدے کے ماننے والوں کا استحصال مقامی آبادی کو دربار لاہور سے متنفر کر سکتا ہے اور انگریز ایسے ہی کسی موقع کے منتظر ہیں۔ اس لئے رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت سے سیاسی بدانتظامی کو جوڑنا دراصل اس مخصوص ذہن کی پیداوار ہے جو قیامِ پاکستان کے بعد سے ہی یہاں کے کلچر اور تہذیب کو اسلامی رنگ دینا چاہتا ہے اور اس حقیقت سے صرفِ نظر کرتا آرہا ہے کہ سکھوں اور ہندوؤں کا بھی اس علاقے کی تمدنی ترقی میں کوئی کردار رہا ہے۔

یہ غلط فہمی ہمارے معاشرے میں اس حد تک سرایت کر گئی ہے کہ ابھی چند روز پہلے سابق چیف جسٹس پاکستان افتخار محمد چوہدری نے ایک مقدمے کی سماعت کے دوران حکومتی عمال کو خبردار کیا کہ وہ خود کو ٹھیک کر لیں ورنہ ملکی حالات اتنے خراب ہو جائیں گے کہ رنجیت سنگھ کا زمانہ لوٹ آئے گا۔ مجھے یقین ہے فاضل چیف جسٹس نے بے خبری میں یہ جملہ کس دیا ہوگا ورنہ رنجیت سنگھ کے زمانے میں پنجاب میں امن و امان اور خوشحالی کا دور دورہ تھا۔ لوگ رات کو چین کی نیند سوتے تھے چوری ڈاکے کی اکا دکا وارداتیں ہوتیں اور ایسی وارداتیں کرنے والے قانون کے شکنجے سے بچ نہ پاتے۔ مالی و انتظامی بدعنوانی کا تصور بھی نہیں تھا۔ جسٹس صاحب کے ریمارکس کے برعکس آج کے پاکستان کے مہنگائی، بھوک اور مفلسی کے مارے لوگوں کی تو یہ دعا

ہوگی کہ کاش رنجیت سنگھ کا وہ دور لوٹ آئے جب انسان کی قدر کا پیمانہ اس کا ہنر تھا، نہ کہ مذہب یا عقیدہ۔ بیرونی محاذ پر رنجیت سنگھ نے افغانستان کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں کا راستہ روکا۔ اس سے قبل بدمست افغان حکمران طاقت کے نشے میں چور پشاور اور پھر اٹک کے راستے پنجاب میں داخل ہوتے اور دلی تک راستے میں موجود آبادیوں، فصلوں، مال مویشی کو روندتے، لوٹتے اور قتلِ عام کرتے چلے جاتے۔ رنجیت سنگھ کے اقتدار سنبھالنے کے بعد احمد شاہ ابدالی کے پوتوں پڑپوتوں کو حسرت ہی رہ گئی کہ کسی طرح دلی پہنچ کر پھر سے ہاتھیوں اور اونٹوں پر سونا چاندی لاد کر واپس کابل لے جائیں۔ راستے میں پڑنے والے پنجاب کی الہڑ مٹیاریں اور لہلہاتی کھیتیاں بھی کچھ کم پرکشش نہیں تھیں مگر ''برا'' ہو رنجیت سنگھ کا جس نے نہ صرف ان کی لشکر کشی کے سامنے لاہور دربار کی فوج کی آہنی دیوار کھڑی کر دی بلکہ الٹا اپنی سلطنت کو وسعت دے کر پہلے پشاور اور پھر کابل تک لے گیا۔ افغان سرداروں نے کئی بار مقامی آبادی کو اکسایا کہ ان ''کافر'' سکھوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں مگر اس وقت لوگ آج کے سادہ لوح عوام سے کہیں زیادہ ہشیار تھے وہ جانتے تھے کہ حکومت یا ریاست کا کوئی مذہب نہیں ہوتا وہ تو ایک ماں کی مانند اپنے تمام ہندو، مسلم، سکھ عیسائی بچوں کا برابر خیال رکھتی ہے۔ لہٰذا وہ ایسے کسی کھوکھلے نعرے میں نہیں آئے اور رنجیت سنگھ نے اُس وقت کے طالبان کو شکست فاش دی۔ آج بھی خیبر پختونخواہ اور قبائلی علاقوں میں سکھوں کی بستیاں رنجیت سنگھ کے سنہری دور کی یاد دلاتی ہیں اور وہاں کے مقامی لوگ شکر گزاری کے جذبہ کے تحت ان مٹھی بھر سکھوں کی حفاظت کا بیڑہ اٹھائے ہوئے ہیں۔

اس کتاب میں ہمیں سکھ دھرم کے بارے میں بھی سرسری مگر مفید معلومات ملتی ہیں۔ پاکستانی پنجاب کی دھرتی کو یہ اعزاز حاصل ہے کہ سکھ دھرم کے پیشوا بابا گرونانک نے یہاں آنکھ کھولی۔ انھوں نے نہ صرف ایک نئے عقیدے کی بنیاد رکھی بلکہ پنجاب میں بسنے والوں کو توقیر بخشی، پنجابی زبان کو ایک الہامی زبان کا درجہ دیا۔

میری خواہش تھی کہ اِس کتاب کا ایک نسخہ ہندوستان کے عظیم لکھاری اور اس کتاب کے مصنف خشونت سنگھ کی خدمت میں پیش کروں مگر افسوس وقت نے ہمیں مہلت نہیں دی۔

یہاں میں اپنی شریکِ سفر افشاں فاروقی کا شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جس نے نہایت صبر اور خندہ پیشانی کے ساتھ میری اس مصروفیت کو برداشت کیا۔ اکثر ایسا ہوا کہ میں اخبار کے دفتر سے رات گئے واپس گھر لوٹتا اور آتے ہی ترجمے میں مصروف ہو جاتا۔ اس دوران مجھے خبر بھی نہ ہوتی کب ہمارا بیٹا احمد نیند سے جاگا اور روتے ہوئے دودھ کا مطالبہ کرنا شروع کر دیا۔ احمد کے جاگنے پر وہ مجھے آواز دیئے بغیر خود ہی اٹھ کر کچن میں جاتی اور اس کے لیے دودھ بنا لاتی۔ مشکل گھڑی میں ساتھ دینے پر

میں اُس کا شکر گزار ہوں۔

آخر میں بس یہ کہنا چاہوں گا کہ آج وطنِ عزیز ایک نازک دور سے گزر رہا ہے (یہ جملہ ہمارے ملک میں شاید سب سے زیادہ سُنا بولا اور لکھا جاتا ہے مگر شاید آج کی حقیقت بھی یہی ہے)۔ بدقسمتی سے اس خطے کی تاریخ سے نظریں چرانے والے اور اس پر ناز کرنے والے دو واضح گروہوں میں تقسیم نظر آتے ہیں۔ معلومات کی رسائی کے شہابِ ثاقب۔۔ گوگل، وکی پیڈیا، ای بکس، سوشل میڈیا کی (اور اب تین جی اور چار جی سپیکٹرم بھی ان میں شامل ہو گئے ہیں) شکل میں پے در پے ہمارے سروں پر گر رہے ہیں۔ ان حالات میں دوسری قوموں اور عقیدوں سے نظریں چرانا یا اس خطے کی تعمیر و ترقی میں ان کے کردار کو نظر انداز کرنا یا ان کے خلاف کسی قسم کا بغض دلوں میں رکھنا نہ صرف ہمارے تہذیبی تشخص کے لیے خطرناک ہے بلکہ مذہبِ اسلام بھی اس سے منع فرماتا ہے۔ کب تک ہم کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر کے حقائق کو جھٹلاتے رہیں گے۔ ہمیں یہ حقیقت تسلیم کرنے میں کوئی عار نہیں ہونا چاہئے کہ سکھ قوم، مسلمانوں، ہندوؤں، مسیحوں، پارسیوں اور دیگر مذاہب کے ماننے والوں کی طرح اس خطے کے پاسداروں میں شامل ہے۔ اسے صرف اپنے عقیدے پر ہی ناز نہیں بلکہ وہ خود کو بجا طور پر اس مٹی کا (پاکستانی اور بھارتی پنجاب) وارث کہتی ہے۔ لاہور، شیخوپورہ، ننکانہ صاحب، گوجرانوالہ، راولپنڈی حسن ابدال، نارووال اور دیگر کئی پاکستانی شہروں سے ان کی جذباتی عقیدت دیدنی ہے۔ ایک مضبوط پاکستان کے لیے ضروری ہے کہ ہم یہاں بسنے والی اور اس سرزمین سے جڑے رہنے کی خواہش رکھنی والی تمام اقلیتی قوموں کے لیے اپنے دل کے دروازے کھول دیں اور ترقی اور خوشحالی کا سفر ان کے ساتھ مل کر طے کریں۔

خیر اندیش
زبیر قریشی
پاکستان آبزرور
اسلام آباد
نومبر-2014
0345-5236327

تعارف

ایک ماہر خطاط نے کئی برس قرآن کی خطاطی میں صرف کیے اور پھر ہندوستان کے طول وعرض میں واقع مسلم ریاستوں اور راجواڑوں کے راجوں اور شاہزادوں کے سامنے اپنے فن کا نمونہ پیش کیا مگر کہیں بھی اسے خاطر خواہ پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔ ہر جگہ سے مایوس ہونے کے بعد بالآخر وہ لاہور مہاراجا رنجیت سنگھ کے دربار آن پہنچا اور اور وزیر خارجہ فقیر عزیزالدین کے ہاتھوں اپنا نسخہ فروخت کرنے کی کوشش کی۔

فقیر عزیزالدین نے اس کے کمالِ فن کی تعریف تو کی مگر اس نسخے کی قیمت ادا کرنے سے معذوری ظاہر کی۔ اُس فنکار اور اپنے وزیر کے درمیان ہونے والی گفتگو مہاراجا رنجیت سنگھ کے کانوں تک بھی جا پہنچی اور اس نے خطاط کو اپنے حضور طلب کیا۔ پہلے تو مہاراجا نے اس کتابِ مقدس کو ادب کے ساتھ ماتھے سے لگایا اور پھر اپنی اکلوتی آنکھ سے اس کے صفحات کا بغور معائنہ کیا۔ مہاراجا اس خطاط کے کام سے بہت متاثر ہوا اور اس آسمانی کتاب کو اپنے ذاتی ذخیرۂ کتب کے لیے خرید لیا۔ کچھ عرصہ بعد فقیر عزیزالدین نے مہاراجا سے دریافت کیا کہ اس نے ایک ایسی کتاب کے لیے اتنی بڑی رقم کیوں ادا کی جو بطور سکھ اس کے کسی کام کی نہ تھی۔ رنجیت سنگھ نے جواب دیا: ''خدا چاہتا ہے کہ میں تمام مذاہب کو ایک آنکھ سے دیکھوں شاید اِسی لیے اس نے میری دوسری آنکھ کی روشنی چھین لی ہے۔''

یہ ایک فرضی قصہ ہے لیکن پنجابی آج بھی اس کا تذکرہ کرتے نہیں تھکتے۔ اس کی وجہ شاید یہ ہے کہ اس کہانی کے اندر اِس سوال کا جواب چھپا ہے کہ آخر کس طرح رنجیت سنگھ تنِ تنہا پنجابی مسلمانوں، ہندوؤں اور سکھوں کو یکجا کرنے میں کامیاب ہوا اور متحدہ پنجاب کی ایسی واحد اور مضبوط سلطنت قائم کی جس کی مثال آج تک نہیں ملتی۔

ایک اور قصہ جو اتنا ہی فرضی مگر زیادہ مشہور ہے اس امر پر روشنی ڈالتا ہے کہ رنجیت سنگھ طاقت (اقتدار) کے حصول کے لیے کس حد تک جانے کو تیار تھا: کہا جاتا ہے ایک بار رنجیت سنگھ کی مسلمان بیوی مہراں نے اس کی بدہیئتی۔ رنجیت سنگھ کا رنگ سانولا تھا، چہرے پر چیچک کے داغ تھے اور وہ ایک آنکھ سے کانا تھا (ایملی ایڈن کے الفاظ میں 'سفید مونچھوں اور ایک آنکھ والے چوہے کی مانند')۔ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اس سے شرارتاً دریافت کیا:

''جب ربِ حُسن کی تقسیم کر رہا تھا جہاں پناہ اس وقت کہاں تھے؟''

''میں طاقت کے حصول کے لیے نکلا ہوا تھا'' مہاراجا نے ترنت جواب دیا۔

یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ رنجیت سنگھ کے سوانح نگاروں نے اس کے ساتھ انصاف نہیں کیا۔ اس کے ہندو اور سکھ

لشکر کی قیادت کی اور سپاہیوں کے شانہ بشانہ جنگ لڑی اور ایک سپاہی کی طرح عام زندگی گزاری۔ ایک سپاہی ہی کی طرح وہ بلا کا مے نوش تھا۔ تاہم مے نوشی کی محفل برخواست ہوتے ہی وہ رات گئے تک پنے مصاحبوں کو امور سلطنت کے حوالے سے خطوط اور یادداشتیں لکھواتا رہتا۔ اگر چہ وہ بڑی نپی تلی سیاسی چالیں چلتا تھا تاہم اس کے بارے میں یہ بھی مشہور ہے کہ وہ محض ایک اعلیٰ نسل کے گھوڑے کو حاصل کرنے کی خاطر کسی بھی ریاست پر چڑھ دوڑتا۔ رنجیت سنگھ کو انسانوں سے زیادہ گھوڑوں سے محبت تھی۔ کپلنگ کا یہ شعر رنجیت سنگھ کی ذات اور عادات کی بھرپور عکاسی کرتا ہے:

دیگر تمام اشیاء سے بڑھ کر ہیں چیزیں چار
عورتیں ، گھوڑے ، حرب اور اقتدار

یہ کتاب لکھنے کے لیے میں نے ان ذرائع سے استفادہ کیا ہے:

(ا) سوہن لال سوری کی ڈائری۔ یہ ڈائری اُس عظیم مؤرخ کی تصنیف ''امدات التواریخ'' کا ایک حصہ ہے۔ حکومتِ پنجاب (بھارتی) کے محکمۂ آثارِ قدیمہ کی ڈائریکٹر ودیا ساگر سوری، جنھوں نے اِس ''امدات التواریخ'' کا ترجمہ کیا ہے نے کمال مہربانی فرماتے ہوئے متعلقہ جلدیں میری صوابدید پر چھوڑ دیں۔

(ب) ہندوستان کی مختلف ریاستوں اور راجواڑوں کے راجوں، مہاراجوں اور شہزادوں کے کارندوں کے دربارِ لاہور سے متعلق مکتوبات۔

(ج) انگریزوں کے کارندوں اور کلکتہ میں موجود اس وقت کی انگریز حکومت کے درمیان خط و کتابت۔

(د) رنجیت سنگھ کے دربار سے منسلک یورپی افسروں، مسافروں اور لاہور دربار میں حاضری دینے والے مہمانوں کی یادداشتیں۔

اس کتاب کا کچھ مواد ''سکھ'' جلد اول (1839-1469) میں استعمال ہوا ہے۔ اُس کتاب کو پرنسٹن یونیورسٹی پریس نے چھاپا ہے۔ کتاب کی تکمیل میں، میں اِن خواتین وحضرات کا تہہِ دل سے شکر گزار ہوں:

(1) Miss Yvonne Le Rougetel انھوں نے تحقیق میں میری مدد کی۔

(2) سربجیت سنگھ۔ انھوں نے دو عدد نقشے تیار کیے۔

(3) ایم ایل اہلیا والہ، نیشنل آرکائیوز آف انڈیا، نئی دہلی۔

(4) Miss Janet Ward انھوں نے مسودہ کو پڑھا۔

یہاں پر میں Rockefeller Foundation کا خصوصی شکریہ ادا کرنا چاہوں گا جس کے فیاضانہ تعاون کی بدولت یہ ممکن ہوا کہ میں سکھوں کی تاریخی دستاویزات کا سکون سے مطالعہ کرسکوں۔

خشونت سنگھ

ابتدائیہ: سکھ

یہ 1499 عیسوی کے موسمِ گرما کی بات ہے جب ایک شخص نے جس کا شباب پنجاب کے گاؤں اور دیہاتوں کی خاک چھانتے ہوئے گزرا تھا ایک نئے عقیدے کو متعارف کرانے کا فیصلہ کیا۔ برسہابرس کی ریاضت اور اپنے ہم وطنوں کی حالتِ زار پر غور وخوض کرنے کے بعد اُس شخص نے یہ ارادہ کیا تھا۔

آپ تاریخ میں جتنا بھی پیچھے چلے جائیں آپ کو ہر دور میں پنجاب بیرونی حملوں کا شکار نظر آئے گا۔ کئی مرتبہ تو ایسا بھی ہوا کہ ہندوستان کے حکمرانوں نے اپنے اندرونی جھگڑے نمٹانے کے لیے بیرونی حملہ آوروں کو ہندوستان پر چڑھائی کی دعوت دی۔ اُن حملوں کی ایک دو اور وجوہات بھی تھیں: ہندوستان میں مال وزر کی بہتات اور مقامی حکمرانوں کا آپس میں نفاق۔ ایسی سرزمین کو فتح کرنا آسان تھا۔ لہٰذا بیرونی حملہ آوروں نے ہندوستان پر پے در پے حملے کیے۔ دہلی کی طرف یلغار کرتے ہوئے ان کا پہلا قدم پنجاب پر ہی پڑتا لہٰذا سب سے زیادہ نقصان بھی اسی صوبے کا ہوتا۔ وہ زمین جو کبھی سرسبز و شاداب چراہ گاہوں اور سیر گاہوں کی وجہ سے پورے ہندوستان میں مشہور ہوا کرتی تھی ان حملوں کی وجہ سے چٹیل میدان میں تبدیل ہو کر رہ گئی۔ ایک ایسا چٹیل میدان جہاں درخت نام کو بھی نہ بچا تھا اور ہر وقت ریت کے بگولے اڑتے رہتے۔ یہاں کے مندر مذہب کے نام پر تباہ کر دیئے جاتے، غلہ خانے حملہ آور سپاہیوں کی بھوک کی نذر ہو جاتے، یہاں کے مکینوں کا قتل عام کر دیا جاتا اُن کی جائیدادوں کو جلا دیا جاتا اور عورتیں فاتح وحشی افواج کی ہوس کا نشانہ بن جاتیں۔ یہ سب ظلم وستم سہنے کے باوجود پنجابیوں نے کوئی سبق نہ سیکھا۔ وہ تقسیم در تقسیم ہوتے چلے گئے جب کبھی انہیں بیرونی حملہ آوروں سے تھوڑے عرصے کے لیے فرصت ملتی وہ آپس میں دست وگریبان ہو جاتے۔

1000 عیسوی سے ہونے والی تمام یلغاروں میں حملہ آور افغانستان کے راستے آنے والے مسلمان ہی تھے۔ یہ در اندازپندرھویں صدی کے اختتام تک پنجاب کی آدھی سے زیادہ آبادی کو مسلمان کر چکے تھے۔ باقی کی آدھی آبادی ابھی تک

ہندو دھرم کو اپنائے ہوئے تھی۔ پنجاب کی آبادی مذہب اور عقیدے کی بنا پر دو واضح اکائیوں میں تقسیم ہو چکی تھی۔ ہندو اور مسلمان۔ ہندوؤں کے ساتھ مسلسل تناؤ کی کیفیت میں رہنے کی وجہ سے پنجابی مسلمان کی وفاداریاں اپنی زمین کے مقابلے میں بیرونی حملہ آوروں کے ساتھ زیادہ تھیں۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ پنجاب کو نیا عقیدہ دیا جائے۔۔۔وفاداریوں کا ایک نیا نمونہ۔

تین دن اور تین راتیں جنگل بیاباں میں مراقبہ کرنے کے بعد مذکورہ شخص واپس آیا اور ایک سیدھا سادا بیان دیا: ''نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان'' یہ شخص نانک تھا، سکھ عقیدے کا بانی۔ وہ 1469 سے 1539 تک زندہ رہا۔ نانک کے والدین ہندو تھے مگر اُس پر مسلمان صوفیوں کی تعلیمات کا گہرا اثر تھا۔ نتیجے کے طور پر اُس نے اپنے عقیدے کی بنیاد ہندو بھگتوں اور مسلمان صوفیوں کی تعلیمات پر رکھی۔

ان ہندو بھگتوں نے اونچی ذات کے برہمنوں کے چھوت چھات اور ذات برادری والے نظام کے خلاف آواز بلند کر رکھی تھی اسی طرح مسلم صوفی غیر مسلموں کو بزورِ شمشیر مسلمان کرنے کی بجائے محبت اور دوستی کے ذریعے قریب لانے پر یقین رکھتے تھے اور مسلمان فاتحین کے ہاتھوں معصوم لوگوں کے قتلِ عام کو غلط گردانتے تھے۔ لوگوں کے لیے نانک کا یہ اعلان کہ ''نہ کوئی ہندو ہے نہ مسلمان' بظاہر اتنا انہونا اور حیران کن نہیں تھا لیکن جوں جوں نانک اِس پیغام کو لے کر آگے بڑھا اور اپنے خطبوں اور عمل کے ذریعے اس کی توضیح و تشریح کرتا گیا اُن پر اس بظاہر سادہ جملے میں چھپے انقلابی معانی واضح ہوتے چلے گئے۔ ان تمام لوگوں کے نزدیک جو اس جملے کو مذہبی تناظر میں دیکھ رہے تھے اس کا مطلب یہ تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کا خدا ایک ہے: اہمیت اس بات کی ہے کہ آپ کتنے خلوص نیت کے ساتھ اُس کی عبادت کرتے ہیں۔ نانک نے ایک مسلم موسیقار کے ہمراہ ہندوؤں کے مقدس مقامات پر جا کر اور حج کے دنوں میں مکہ جا کر عبادت کی ایک نئی مثال قائم کی۔ اسے مندروں میں ہندوؤں کے ساتھ کھڑے ہو کر مقدس ویدوں سے بھجن گاتے اور مساجد میں مسلم نمازیوں کے ساتھ کندھے سے کندھا ملا کر عبادت کرتے بھی دیکھا گیا۔ اس نے ایک ایسی روحانی تحریک کی بنیاد رکھ دی جس نے دونوں مذاہب کی مشترک تعلیمات کو اپنانے پر زور دیا اور اختلافی امور کو یکسر نظر انداز کر دیا۔ اس کی طرف سے کیا گیا اعلان اپنے اندر دور رس کثیر المذاہب (سیکولر) اثرات لیے ہوئے تھا۔ پہلی مرتبہ لوگوں نے کسی کو یہ کہتے سنا تھا کہ اس بات کی کوئی اہمیت نہیں کہ آپکا ہمسایہ ہندو ہے یا مسلمان اور یہ کہ ایسے تمام لوگ جو دور دور تک پھیلی ہوئی اِس وسیع و عریض زمین پر رہتے ہیں جسے پانچ دریاؤں نے تقسیم کیا ہوا ہے۔۔۔ اور جس کی وجہ سے اس زمین کو پنجاب کا نام ملا ہے۔۔۔ سب پنجابی ہیں کیونکہ ان کے مفادات مشترک ہیں۔

بابا گرو (استاد) نانک نہ صرف سکھ مذہب کا بانی تھا وہ پنجابی نیشنلزم (قوم پرستی) کا بھی بانی تھا۔ اس کے بعد نو گرو اور آئے۔ اگرچہ وہ بھی اپنے گرو کی طرح تمام معاملات میں روحانی پاکیزگی پر زور دیتے رہے تاہم ان کی تعلیمات کا محور بھی

وہی سیکولر وراثت تھی جو بابا نانک انکے لیے چھوڑ گیا تھا۔ لہٰذا جب سکھوں کے پانچویں گرو ارجن (1563-1606) نے امرتسر کے مقام پر مندر (گردوارہ) کی تعمیر کا ارادہ کیا تو اس کی پہلی اینٹ رکھنے کے لیے اُس نے کسی اور نہیں مسلمانوں کے عظیم صوفی درویش میاں میر کا انتخاب کیا۔ اسی طرح گرو ارجن نے سکھوں کی مقدس کتاب (گرنتھ صاحب) میں نہ صرف دوسرے گروؤں کا کلام شامل کروایا بلکہ ہندو اور مسلمان صوفی بزرگوں کی تعلیمات کو بھی اس کا حصہ بنایا اور ایک جنبش سے اس کی تعلیمات کو کسی خاص فرقے یا مذہب سے آزاد کر دیا اور پہلی بار پنجابی کو عبادت کی زبان بنا کر توقیر بخشی۔ اب تک مسلمان عربی زبان اور ہندو سنسکرت زبان میں عبادت کرتے چلے آرہے تھے۔

گرو ارجن سنگھ کو مغل شہنشاہ جہانگیر کے حکم پر 1606 میں قتل کر دیا گیا۔ اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے اور سکھوں کے چھٹے گرو ہرگوبند (1595-1644) نے نوزائیدہ سکھ عقیدے کے ماننے والوں کی حفاظت کے لیے ایک جتھا تیار کیا اور عقیدے یا مذہب سے بالاتر ہو کر مسلمان اور ہندو سپاہی بھرتی کیے۔ یہ پالیسی سکھوں کے آخری گرو، گرو گوبند سنگھ (1666-1708) کے وقت تک جاری رہی۔ اگرچہ اُس کا باپ یعنی سکھوں کا نواں گرو بھی مغل حکمرانوں کے ہاتھوں مارا گیا تھا جسے مغل بادشاہ جہانگیر کے پوتے اورنگزیب نے 1675 میں قتل کرا دیا تھا پھر بھی گرو گوبند نے اپنی تحریک کو اسلام مخالف مہم نہ بننے دیا۔ 1699 کے موسم بہار میں اس نے سکھ پیروکاروں کی فوج تیار کی اور اسے خالصہ یعنی ''خالص'' عسکری گروہ کا نام دیا۔ اس فوج کو مغل ظلم وستم کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کیا گیا تھا۔

اس حقیقت کے باوجود کہ اس کے دو بیٹے مغلوں کے خلاف لڑائی میں مارے گئے تھے اور باقی دو کا سر بھی سرہند کے مسلمان گورنر کے حکم پر قلم کر دیا گیا تھا گرو گوبند نے مسلمانوں کو دوست بنانے کی پالیسی جاری رکھی۔ اسے اس حکمت عملی کی بھاری قیمت چکانا پڑی اور وہ خود بھی دو مسلمانوں کے ہاتھوں اکتوبر 1708 میں مارا گیا۔ سکھ اب آہستہ آہستہ اپنی علیحدہ شناخت حاصل کرتے جارہے تھے۔ یہ ایک حقیقت ہے کہ اپنے منفرد رسم الخط، مختلف الہامی کتابوں، عبادت گاہوں اور جداگانہ طرزِ حیات کے ساتھ سکھوں نے مغل آمریت کے خلاف مزاحمتی تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ ہندو جاٹ (مزارع) جوق در جوق خالصہ فوج کا حصہ بننے لگے نتیجتاً سکھ عوام مسلمانوں کی نسبت ہندوؤں کے قریب ہونے لگے۔ مسلمانوں اور سکھوں میں فاصلے بڑھنے لگے۔ اس اقدام سے اگرچہ یہ نقصان ہوا کہ نانک کا دونوں مذاہب کے ماننے والوں کو یکجا کرنے کا مشن ناکام ہو گیا لیکن قومیت پرستی کی جو چنگاری وہ پنجاب کے لوگوں کے دلوں میں سلگا گیا تھا وہ شعلہ بن کر دہکنے لگی اور گرو گوبند کی موت کے بعد اٹھنے والا مذہبی منافرت کا طوفان بھی اُسے نہ بجھا سکا۔

سکھوں کو پہلی کامیابی 1709 میں حاصل ہوئی جب بندا نے پنجاب کے غیر تربیت یافتہ جاٹوں کے ایک جتھے کی سربراہی کرتے ہوئے مغل فوجوں کو شکست دے کر مشرقی پنجاب کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ تاہم بندا کی کامیابی مختصر ثابت ہوئی اور 1715 کے موسمِ سرما میں اُسے مغل فوج کے سامنے ہتھیار ڈالنے پڑے۔ اُسے اور اُس کے 700 سپاہیوں کو قیدی

بنا کر دہلی لایا گیا اور وہاں ان کے سر قلم کر دیئے گئے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ بندا کی عسکری تحریک پنجاب کے مسلم مراعات یافتہ طبقے کے خلاف تھی جسے تباہ کرنے میں وہ عملاً کامیاب ہو بھی گیا تھا پر موت کو گلے لگاتے وقت اس کے آخری الفاظ مسلمانوں یا اسلام کے خلاف نہیں بلکہ مغل استعمار کے خلاف تھے۔

اس کے آخری الفاظ یہ تھے:

''جب بھی لوگ ایمان فروشوں کے ہاتھوں اپنا ضمیر بیچنے لگیں گے اور دوسروں کو خود سے کمتر سمجھتے ہوئے بدعنوانی اور عیش و عشرت کی دنیا میں گم ہو جائیں گے اور ہر قسم کی ظلم و زیادتی کے آگے گھٹنے ٹیک دیں گے تب ان کو سبق سکھانے کے لیے آسمان سے میری صورت قہر نازل ہوگا۔ اور تادیب کی رسم مکمل ہو جانے کے بعد اوپر والا تم جیسوں کو طاقت بخش دے گا تا کہ مجھ جیسوں کو سزا دے سکیں۔''

بندا کی موت کے بعد کچھ عرصہ کے لیے سکھ پنجاب سے بطور ایک سیاسی قوت کے غائب ہو گئے۔ پنجاب میں ظالم اور سنگدل مغل گورنر مقرر کیے گئے جن کا پسندیدہ مشغلہ سکھوں پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑنا تھا اور ''انھوں نے پنجاب کی زمین سکھوں کے لہو سے یوں رنگ دی گویا یہ زمین نہ ہو کوئی رکابی ہو۔''

1739 میں ایران کے بادشاہ نادر شاہ نے ہندوستان پر حملہ کیا۔ اس نے دہلی کی اینٹ سے اینٹ بجا دی اور ایک لاکھ سے زائد لوگوں، عورتوں اور بچوں کا بے دریغ قتل عام کیا۔ اس کا واپسی کا سفر سست تھا کیونکہ اس کے کارواں میں مالِ غنیمت (جس کی مالیت تقریباً 30 کروڑ روپے یا دو کروڑ 30 لاکھ پاؤنڈ بنتی ہے اور اس میں قیمتی ہیرے جواہرات جن میں تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرا بھی شامل تھا) سے لدے ہاتھی گھوڑے تیز چلنے سے قاصر تھے مزید برآں اس کارواں میں پیدل چلنے والے ہزاروں ہندوستانی مرد اور عورتیں بھی شامل تھے جنھیں نادر شاہ غلام اور کنیزیں بنا کر لے جا رہا تھا۔ ایسے میں سکھ جن کے بارے سب کا یہ خیال تھا کہ وہ بطور ایک سیاسی یا عسکری قوت کے دم توڑ چکے ہیں دوبارہ نمودار ہوئے۔ انھوں نے خود کو مختلف جتھوں میں تقسیم کیا اور واپس جاتے ہوئے نادر شاہ کے لشکر سے نہ صرف مالِ غنیمت کا تھوڑا بہت حصہ چھیننے میں کامیاب ہو گئے بلکہ اپنے بہت سے ہم وطنوں کو آزاد بھی کرا لیا۔

مقامی لوگوں کو نادر شاہ کے حملے کے دوران سکھوں کا کردار اور رویہ بہت پسند آیا اور ان کی بڑی تعداد خالصہ تحریک میں شامل ہو گئی۔ پنجاب کے مسلم کسانوں اور دہقانوں نے ایک بار پھر سکھوں کو اپنا پنجابی بھائی کہنا شروع کر دیا۔

نادر شاہ کے آٹھ سال بعد افغان حکمران احمد شاہ ابدالی کی طرف سے ہندوستان پر پہلا حملہ ہوا (آگے چل کر احمد شاہ ابدالی نے ہندوستان پر نو حملے کیے) ایک بار پھر سکھوں نے حملہ آور فوج کو ہراساں کرنے کی تیاریاں شروع کر دیں اور خود کو گوریلا کارروائیوں کے لیے منظم کیا۔ ہندوستان پر افغان حملوں (1747-1769) کے دران سکھ ایک بڑی قوت بن کر ابھرے۔ جب ابدالی کی فوجیں دہلی میں لوٹ مار سے فارغ ہو کر واپسی کا رخ کرتیں ان کے پنجاب پہنچتے ہی سکھ چھاپہ مار

جنگلوں یا پہاڑوں کی طرف نکل جاتے لیکن جیسے ہی حملہ آور لشکر پنجاب سے باہر نکلنے لگتا یہ چھاپہ مار پہاڑوں سے اتر کر اس پر جھپٹ پڑتے اور افغانستان کو جاتے ہوئے اس لشکر پر بار بار حملہ کرتے۔

یہ چھاپہ مار نہ صرف اُن سے لوٹی ہوئی دولت کا بڑا حصہ واپس لے لیتے بلکہ قیدیوں کو رہا کرانے میں کامیاب بھی ہو جاتے۔ پنجابی ریاست کے قیام کا سہرا کسی حد تک ابدالی کے سر جاتا ہے۔ اس نے پنجاب میں مغل عملداری کو کافی حد تک ختم کر دیا اور ساتھ میں ہندوستان کے شمال میں مرہٹوں کی ابھرتی ہوئی طاقت کا قلع قمع بھی کیا۔ احمد شاہ ابدالی کے بار بار کے حملوں نے پنجابیوں کو اپنے تمام مذہبی اختلافات بھلا کر متحد ہونے پر مجبور کر دیا۔ وقت آ گیا تھا کہ بیرونی حملہ آوروں کا مل کر مقابلہ کیا جائے اور چونکہ سکھ دستوں نے حملہ آوروں کے خلاف مزاحمتی تحریک کو منظم کیا تھا اس لیے انھوں نے آگے بڑھ کر افغان مخالف چھاپہ مار لشکر کی قیادت سنبھال لی۔

یہ مسلح جنگجو، جن کی واحد خاصیت بیرونی حملہ آوروں پر حملہ کر کے انہیں ہراساں کرنا تھا قومی ہیرو بن گئے۔ وہ جہاں بھی جاتے ان کا استقبال نجات دہندہ کے طور پر کیا جاتا۔ پس سکھ جن کی تعداد ایک لاکھ کے لگ بھگ تھی عملاً فرانس جتنے رقبے والے ایک علاقے کے حکمران بن گئے۔ مغلوں اور افغان حملہ آوروں کے خلاف جدو جہد کے دنوں میں سکھ اپنا علیحدہ آئین تشکیل کر چکے تھے چونکہ ہر سکھ خود کو ایک سردار کی حیثیت سے دیکھتا تھا اور ایسا ہی کہلوانا پسند کرتا تھا وہ صرف ایسی تنظیم یا جماعت کا حصہ بننے پر راضی ہو سکتا تھا جس میں اُس کی خود مختاری اور آزادی کو مکمل تحفظ حاصل ہو۔ انھوں نے "مثل" کے نام سے گروہ تشکیل دیئے۔ (مثل فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی برابر کے ہیں)۔ ہر مثل ایک مثلدار کے تحت کام کرتی جس کا انتخاب جرأت اور بہادری کے بل بوتے پر کیا جاتا۔ یہ مثلیں ان علاقوں کے پھیلنے کے ساتھ ساتھ جو ان کی عملداری میں آتے تھے بڑی ہوتی گئیں اور ایک وقت ایسا بھی آیا کہ انھوں نے پنجاب کا بڑا حصہ آپس میں تقسیم کر لیا۔ اپنے علاقے کے لوگوں کے دفاع کی ذمہ داری وہاں کی حکمران مثل کی تھی اس کے بدلے وہ لوگوں سے ٹیکس وصول کرتی جسے راکھی کہا جاتا۔

اس طرح کی بارہ عسکریت پسند مثلیں وجود میں آئیں جن میں کُل 70,000 گھڑ سوار شامل تھے۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہر مثلدار ایک چھوٹا موٹا نواب بنتا چلا گیا اور اس کی ماتحت مثل اس کی ذاتی فوج میں تبدیل ہوتی چلی گئی۔

ان مثلوں میں پانچ قابلِ ذکر ہیں۔ سب سے طاقتور مثل بھنگیوں کی تھی جن کے پاس لاہور، امرتسر اور جنوبی پنجاب کے کئی شہروں کی عملداری تھی۔ اہمیت اور رتبے میں دوسرا نمبر کنھیاؤں کا آتا ہے جن کی عملداری ہمالیہ کے پہاڑوں کے دامن میں تھی۔ تیسری اہم مثل پھلکیوں کی تھی جن کے زیرِ نگیں سرہند اور پٹیالہ جیسے اہم شہر تھے۔ اہلوالیوں کے پاس راوی اور بیاس کے درمیان کا علاقہ تھا۔ پانچویں اور سب سے غیر اہم مثل سکر چکیوں کی تھی جن کی عملداری میں گوجرانوالہ شہر جو لاہور سے صرف 40 میل کی دوری پر ہے اور چند آس پاس کے دیہات تھے۔ مثلوں کا نظام، اگر اسے واقعی نظام کہا جائے بیرونی حملہ آوروں سے نپٹنے کا ایک عارضی حربہ تھا۔ ان تمام مثلوں کے سردار سال میں دو مرتبہ امرتسر میں اکٹھے ہوتے اور دفاع کے

معاملات پر بات چیت کرتے اور جب کبھی دفاع پر بات کی ضرورت پیش نہ آتی تو ان کی گفتگو آپس میں بڑھتی ہوئی دوریوں کے بارے میں ہوتی جو وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ جنم لے رہی تھیں۔ بعد کے سالوں میں سربت خالصہ یا آل خالصہ اسمبلی کے نام سے جانے والے یہ اجلاس محض شور شرابے کی محفلیں بن کر رہ گئیں اور یہاں آئے ہوئے سردار بڑی مشکل سے خود پر قابو پا کر ایک دوسرے سے لڑنے جھگڑنے سے باز رہتے۔ تاہم ایک بات واضح ہو چکی تھی کہ اگر پنجاب کو چھوٹی چھوٹی ریاستوں میں تقسیم ہونے سے بچانا اور متحد و مضبوط رکھنا تھا تو کسی ایک مثل میں دوسری تمام مثلیں ضم کرنا ہونگی۔ اصل مقابلہ انہی پانچ مثلوں کے درمیان تھا جن کا ذکر اوپر کے صفحات میں کیا گیا ہے۔ ان مثلوں میں سکر چکیہ مثل آہستہ آہستہ اپنا اثر و رسوخ بڑھا رہی تھی۔

انگریز سیاح ولیم فارسٹر (William Forster) جس نے 1783ء میں پنجاب کا سفر کیا تھا اقتدار کے حصول کے لیے سکھوں میں جاری اس کشمکش کا چشم دید گواہ تھا۔ وہ لکھتا ہے: "کیا مستقبل میں اپنے مذہب اور سلطنت کے دفاع کے لیے سکھ مشترکہ طور پر جدوجہد کر سکیں گے؟ ایسا تبھی ممکن ہو گا جب کوئی پر جوش سکھ سردار دوسرے ساتھی سرداروں سے طاقت حاصل کرنے کے بعد اُٹھے اور اپنی صلاحیتوں و کامیابیوں کے بل بوتے پر دولتِ مشترکہ کی راکھ پر سکھ سلطنت کا علم بلند کرے۔" جس شخص کے بارے میں یہ پیغمبرانہ پیش گوئی کی گئی تھی وہ اس وقت محض تین برس کا تھا اور وہ کوئی اور نہیں سکر چکیہ مثل کا رنجیت سنگھ تھا۔

1

رنجیت سنگھ کے آباؤ اجداد، پیدائش اور شروع کے سال

رنجیت سنگھ کے آباؤ اجداد گوجرانوالہ کے قریبی دیہاتوں میں بسنے والے غریب کسان تھے۔ وہ کھیتی باڑی کے ذریعے اور مویشی پال کر گزر بسر کرتے۔ اس خاندان میں سب سے پہلے شہرت پانے والے کا نام بدھ سنگھ تھا۔ کہا جاتا ہے بدھ سنگھ کو باقاعدہ سکھ مذہب میں شامل کرنے والے کوئی اور نہیں سکھوں کے چھٹے گرو گوبند سنگھ تھے۔ بدھ سنگھ مزاجاً آزاد منش، خوش وخرم رہنے والا شخص تھا۔ اُس کی دعوتیں، بہادری اور خاص طور پر اُس کی اعلیٰ نسل کی گھوڑی، دیسن، جس کے جسم پر سیاہ سفید دھبے تھے کے قصوں نے افسانوی شہرت حاصل کی ہوئی تھی۔ یہ قصے پنجاب کے میدانوں سے ہوتے ہوئے دوسرے علاقوں تک جا پہنچے اور لوگوں میں اتنے مشہور ہوئے کہ 'دیسن بدھ سنگھ' کا مشترکہ نام سارے علاقے میں گونجنے لگا۔ بدھ سنگھ کا 1718ء میں انتقال ہوا تو لوگوں نے پہلی بار اس کے جسم کو دیکھا جس پر برچھیوں اور تلواروں کے ان گنت نشان موجود تھے۔ اس نے وراثت میں اپنے بیٹوں کے نام چند گاؤں چھوڑے جن کے وہ بلا شرکتِ غیرے مالک تھے جبکہ آس پاس کے گاؤں کے لوگ بھی دشمن سے حفاظت کے عوض انھیں ٹیکس ادا کرتے جسے راکھی کہا جاتا تھا۔ بدھ سنگھ کے بیٹے نودھ سنگھ نے اپنے گاؤں سکر چک کو مضبوط بنایا اور باقاعدہ جنگجوؤں کا گروہ بھرتی کیا جنھیں سکر چکیہ کہا جاتا تھا۔ سکر چکیوں نے دیگر مثلوں کے ساتھ اتحاد کر کے احمد شاہ ابدالی کے خلاف کئی جھڑپوں میں حصہ لیا۔ افغان فوجوں کی ہندوستان سے واپسی کے بعد ان مثلوں نے راوی اور جہلم کے درمیان کی زمین کے بڑے حصے پر قبضہ کر لیا۔ نودھ سنگھ 1752ء میں ایک جھڑپ کے دوران ہلاک ہو گیا۔ نودھ سنگھ کے سب سے بڑے بیٹے چڑت سنگھ نے سکر چک گاؤں چھوڑ کر گوجرانوالہ میں سکونت اختیار کر لی اور شہر کے گرد فصیل کھڑی کر دی۔ چڑت سنگھ کے بڑھتے ہوئے اثر رسوخ کی خبر لاہور کے افغان گورنر تک پہنچی تو وہ سپاہیوں کے ایک چھوٹے سے دستے کے ہمراہ اسے گرفتار کرنے آ پہنچا۔ تاہم گوجرانوالہ کے سردار کی طرف سے بھرپور جواب پر اسے اپنی بندوقیں اور اناج کی بوریاں چھوڑ کر الٹے پاؤں بھاگنا پڑا۔ اِس فتح سے حوصلہ پا کر چڑت سنگھ نے وزیر آباد، احمد آباد اور روہتاس کے

علاقوں کو اپنی ریاست میں شامل کر لیا لیکن جب احمد شاہ ابدالی افغانستان سے اپنے لشکر سمیت ہندوستان پر حملہ آور ہوا تو چڑت سنگھ کو اپنے علاقے چھوڑ کر پہاڑوں میں پناہ لینا پڑی۔ اس کی ریاست کے بڑے حصے کو ابدالی کی فوجوں نے تباہ و برباد کر دیا۔ ابدالی کے فوجیوں نے گوجرانوالہ کے گرد موجود فصیل کو زمین بوس کر دیا۔ چڑت سنگھ نے اس کا بدلہ یوں چکایا کہ چھاپہ مار کارروائیوں کے ذریعے واپس جاتے ہوئے افغان لشکر کو بیش قیمت مالِ غنیمت سے محروم کر دیا۔ اُس نے گوجرانوالہ کے گرد ازسرِ نو فصیل کھڑی کی اور آس پاس کے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ اس کا آخری حملہ جموں پر تھا جہاں پنجاب کے بیشتر متمول خاندانوں نے ابدالی کے ڈر سے پناہ لی ہوئی تھی۔ جموں کے مال و متاع پر اُس کے حق کو بھنگیوں نے چیلنج کیا دونوں مثلوں کے درمیان جھڑپ میں چڑت سنگھ اپنے ہی ایک ہتھیار سے شدید زخم آنے کے بعد دنیا سے رخصت ہو گیا۔

چڑت سنگھ کا چودہ سالہ بیٹا ماہا سنگھ اپنے والد کی طرح بہادر اور پر جوش تھا۔ اس نے جند کے سردار گجپت سنگھ کی بیٹی سے شادی کے بعد مثلداروں میں اپنے مقام کو مستحکم کیا۔ گوجرانوالہ شہر کی فصیل کے اندر اس نے ایک قلعہ تعمیر کیا جس کا نام اُس نے اپنے نام پر رکھا یعنی " گڑھی ماہا سنگھ "۔ اس نے اپنے گھڑ سواروں کی تعداد بڑھا کر 6,000 کر دی اور اپنے بزرگوں کے قبضہ کیے گئے علاقوں پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ ایک مسلمان قبیلے چٹھہ سے اُس نے رسول نگر چھین لیا۔ اِس کے علاوہ اس نے علی پور چٹھہ، پنڈی بھٹیاں، ساہیوال، عیسیٰ خیل اور سیالکوٹ کے وسیع علاقوں کو بھی اپنی ریاست میں ضم کر لیا اور پھر اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلتے ہوئے اس نے جموں کا رخ کیا۔ اس ناگہانی مصیبت پر جموں کا ہندو ڈوگرہ حکمران مال و دولت سے بھرپور ریاست دولت کی تلاش میں سرگرداں سکر چکیوں کے رحم و کرم پر چھوڑ کر جان بچا کر فرار ہو گیا۔ جموں سے حاصل ہونے والی دولت کے بل بوتے پر ماہا سنگھ نے سکر چکیہ مثل کو گمنامی سے نکال کر ممتاز مقام دلوایا اور دیگر مثلوں میں نمایاں لیڈر کی حیثیت سے جانا جانے لگا۔ اس مرتبہ کنہیاؤں نے جنھوں نے بھنگیوں کو شکست دے کر سب سے طاقتور مثل ہونے کا دعویٰ کیا تھا ماہا سنگھ کے جموں پر دعوے کو چیلنج کر دیا۔ سکر چکیوں اور کنھیوں میں ہونے والی ایک جھڑپ میں کنھیا سردار کا اکلوتا بیٹا گر بخش سنگھ مارا گیا۔ کنھیا سردار کا غرور خاک میں مل چکا تھا اور وہ اپنی پوتی مہتاب کور کی ماہا سنگھ کے بیٹے رنجیت سنگھ سے شادی کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ کچھ ہی عرصے بعد کنھیا سردار کا انتقال ہو گیا اور وہ اپنی تمام جائیداد اپنی بہو سدا کور کے نام چھوڑ گیا جو کہ مہتاب کور کی ماں تھی اور کنھیا تاج و تخت کی وارث بھی۔

ماہا سنگھ کا 1792ء میں انتقال ہوا۔ جو ترکہ بدھ سنگھ، نودھ سنگھ، چڑت سنگھ اور ماہا سنگھ نوجوان رنجیت سنگھ کے لیے چھوڑ گئے تھے اس میں پنجاب کے شمال مغرب میں واقع ایک بڑا خطۂ زمین، نڈر بے خوف گھڑ سواروں اور بندوقچیوں کی بڑی تعداد اور ایک ایسا جوش و جذبہ جس کی کوئی انتہا نہ تھی۔ رنجیت سنگھ منگل، 13 نومبر 1780 کو غالباً گوجرانوالہ میں پیدا ہوا۔[1] ابتدا میں بچے کا نام بدھ سنگھ رکھا گیا۔ جب بیٹے کی پیدائش کی خبر ماہا سنگھ کو ملی جو دریائے جہلم کے کنارے چٹھوں کے قبیلے کو شکست دے کر گھر کی طرف لوٹ رہا تھا تو سکھ سردار نے پیغمبرانہ بصیرت کے ساتھ بچے کا نام بدھ سنگھ یعنی 'عقلمند سردار' سے

تبدیل کر کے رنجیت سنگھ یعنی 'فاتح سردار' رکھ دیا (رنجیت سنگھ عمر بھر ان پڑھ رہا مگر کئی جنگوں میں فتوحات حاصل کیں)۔

رنجیت سنگھ کے بچپن کے بارے میں بہت کم لوگوں کو علم ہے سوائے اس کے کہ بچپن میں وہ چیچک کے مہلک حملے کا شکار ہو گیا تھا جس کے نتیجے میں اس کی بائیں آنکھ کی بینائی جاتی رہی اور چہرہ نشانوں سے بھر گیا[2]۔ ماہا سنگھ کے پاس اپنے بیٹے کی پرورش کے لیے وقت تھا نہ ہی اس کی بیوی راج کور کے پاس۔ اُس دور کے رسوم و رواج کے مطابق بچے کی پیدائش کے بعد ماں کو زیادہ تر وقت زنانے میں گزارنا پڑتا تھا (سکھ اشرافیہ نے یہ رسم مسلمانوں سے مستعار لی تھی) اور جب تک بچہ اپنی دیکھ بھال کے خود قابل نہ ہو جائے اسے باہر کی دنیا دیکھنے کا موقع نہیں ملتا تھا۔ رنجیت سنگھ بڑا ہوا تو اس کو سکھوں کے مذہبی رسوم و رواج کے مطابق گوردوارہ بھیجا گیا جہاں وہ گرنتھ صاحب کی تلاوت سنتا۔ سکھ عقیدے کے بارے میں ابتدائی تعلیمات کے علاوہ برہمن پجاریوں نے بھی نو عمر رنجیت سنگھ کے دل و دماغ پر گہرا اثر ڈالا۔ ان پجاریوں کو خوراک اور رہائش سکھ اشرافیہ فراہم کرتی۔ اس کے علاوہ کم سن رنجیت سنگھ کا زیادہ وقت شکار میں گزرتا۔ رنجیت سنگھ اوائل عمری میں ہی گھوڑوں کے عشق میں مبتلا ہو گیا تھا اور اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کے لیے اس کا جنون آخر تک اس کے ساتھ رہا۔

رنجیت سنگھ کو زندگی کی پہلی عسکری مہم جوئی کا تجربہ دس برس کی عمر میں ہوا۔ اس کے باپ نے گجرات کے صاحب سنگھ بھنگی سے خراج طلب کیا اور اس کی طرف سے انکار پر اس کو وہاں سے بے دخل کر دیا۔ صاحب سنگھ نے سودھراں کے قلعہ میں پناہ لی اور لاہور میں موجود اپنے رشتہ داروں کو مدد کے لیے پکارا۔ ماہا سنگھ نے اپنے بیٹے رنجیت سنگھ کو ساتھ لیا اور قلعے کا محاصرہ کر لیا۔ محاصرہ طویل ہوتا چلا گیا اور سردیوں کے دوران بھی جاری رہا۔ اسی دوران ماہا سنگھ بیمار پڑ گیا۔ اس خدشے کے پیشِ نظر کہ کہیں یہ بیماری اس کے لیے جان لیوا ثابت نہ ہو، اس نے اپنے بیٹے رنجیت سنگھ کو اپنا جانشین مقرر کیا اور اس کے ماتھے پر زعفرانی تلک لگا کر اس کا بطور سکر چکیہ مثل کے سربراہ کا اعلان کیا اور خود گوجرانوالہ لوٹ گیا۔ جب لاہور کے بھنگی سرداروں کو ماہا سنگھ کی بیماری اور ایک دس سالہ لڑکے کو سکر چکیوں کا سردار بنائے جانے کی خبر ملی تو انھوں نے سکر چکیوں کو درپیش نازک صورتحال سے فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا اور سودھراں کی طرف پیش قدمی شروع کر دی۔ رنجیت سنگھ نے لاہور سے آنے والے بھنگیوں پر سودھراں سے کئی میل دور ہی گھات لگا کر حملہ کیا اور انھیں تہس نہس کر دیا۔ ماہا سنگھ کو مرنے سے قبل اپنے بیٹے کی فتح کی اطلاع دی جا چکی تھی۔ جنگی مہم سے فارغ ہوتے ہی رنجیت سنگھ اپنے باپ کی آخری رسومات ادا کرنے گوجرانوالہ پہنچا۔

رنجیت سنگھ کی عمر اور مزاج ایسا نہ تھا کہ وہ اپنے باپ کی جاگیر اور دیگر روزمرہ کے امور پر توجہ دیتا لہٰذا اس نے ماہا سنگھ کے منشی لکھ پت رائے کو اس کام پر جاری رکھا اس کی ایک وجہ شاید یہ بھی تھی کہ رنجیت سنگھ کی ماں کو بھی لکھ پت رائے کی دیانتداری پر پورا بھروسا تھا تاہم اس کے بھائی (رنجیت سنگھ کے ماموں) ڈل سنگھ کو جو ماہا سنگھ کی جاگیر کے انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لینا چاہتا تھا، یہ بات پسند نہ آئی اور اس نے رنجیت سنگھ کی ہونے والی ساس سدا کور کے ساتھ اس حوالے سے گٹھ جوڑ کر لیا۔ اپنی ماں،

ماموں اور ساس کے درمیان اقتدار کی رسہ کشی اور سازشوں نے رنجیت سنگھ کو بیزار کر دیا اور اس نے اپنا بیشتر وقت جنگل میں شکار کھیلتے ہوئے یا گھر سے دور مصاحبوں کے ساتھ بسر کرنا شروع کر دیا۔ اس دور کی تلخ یادوں نے رنجیت سنگھ کے دل و دماغ پر گہرے اثرات چھوڑے اور آنے والے دنوں میں وہ ہر اس شخص کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگا جو اس سے ضرورت سے زیادہ التفات برتتا۔ رنجیت سنگھ کو جھگڑالو لوگوں سے شدید نفرت ہوگئی اور اس کی لغت میں 'دنگا والا' اور 'تکراری' جیسے الفاظ گالی کی شکل اختیار کر گئے۔ چونکہ رنجیت سنگھ کا زیادہ وقت شکار کے تعاقب میں گزرتا اسے گھڑ سواری اور نشانہ بازی میں مہارت حاصل ہو گئی اور دن بھر کے شکار کے بعد شام میں ناؤ نوش کی محفل ضروری خیال کی جاتی تھی شراب سے اس کی جان پہچان کم عمری ہی میں ہوگئی تھی۔

شکار کی ایسی ہی مہمات کے دوران ایک مرتبہ رنجیت سنگھ ایک جان لیوا حملے کی زد میں بھی آیا۔ جنگل میں شکار کا پیچھا کرتے ہوئے رنجیت سنگھ اپنے ساتھیوں سے بچھڑ گیا اس دوران حشمت خان نامی ایک سردار جو کئی مرتبہ رنجیت سنگھ کے باپ مہا سنگھ کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کھا چکا تھا رنجیت سنگھ پر حملہ آور ہوا۔ رنجیت سنگھ کا گھوڑا حشمت خان کے وار کے بعد بدک کر اپنی پچھلی ٹانگوں پر کھڑا ہو گیا قبل اس کے کہ حملہ آور دوسرا وار کرتا رنجیت سنگھ کے نیزے نے اس کا کام تمام کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے اس کا سر تن سے جدا کر کے اپنے نیزے کی انی پر رکھا اور نیزہ بلند کیے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف لوٹ گیا۔ جب رنجیت سنگھ اس خون آلود تمغے کے ساتھ اپنے خیمے میں پہنچا اس وقت اس کی عمر صرف تیرہ برس تھی۔ رنجیت سنگھ نے اگلے دو برس گوجرانوالہ کے آس پاس واقع جنگلات میں جنگلی سوروں اور ہرن کا شکار کرتے ہوئے گزارے۔ جاگیر کے معاملات سے اسے قطعی دلچسپی نہ تھی۔ اس کی ماں اس کے مستقبل کے بارے میں فکر مند رہنے لگی اور اس خیال سے کہ شاید شادی کے بعد اسے اپنی ذمہ داریوں کا احساس ہو، وہ سدا کور کے پاس اس کی بیٹی اور اپنے بیٹے کی شادی کی تاریخ طے کرنے کے لیے گئی۔ جب رنجیت سنگھ کنہیوں کے صدر مقام بٹالہ مہتاب کور سے شادی کرنے کے لیے پہنچا اس وقت اس کی عمر محض پندرہ برس تھی۔ پنجاب کے دو اہم سکھ خاندانوں کے درمیان یہ تعلق صوبے کا اہم واقعہ تھا اور تقریباً تمام اہم سکھ سردار اس تقریب میں شریک ہوئے۔

یہ شادی زیادہ خوشگوار ثابت نہ ہوئی۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ مہتاب کور خود کو ایسے شخص سے محبت کرنے پر آمادہ نہ کر سکی جس کے باپ نے اس کے باپ کا قتل کیا ہو۔ اپنی بیوی کی طرف سے اس سرد مہرانہ رویے کے نتیجے میں رنجیت سنگھ نے بھی اس سے لاتعلقی اختیار کر لی اور یہ شادی ان کے درمیان ایک قسم کے سمجھوتے کی شکل اختیار کر گئی۔ سدا کور کو اس خیال سے کوئی پریشانی نہ ہوئی کہ اس کی بیٹی ایک ایسے شخص کے ساتھ ہم بستر ہو رہی ہے جو اس کی نظر میں بیکار ہے۔ اہم بات یہ تھی کہ وہ اس کے بیٹوں کو جنم دے گی جو آگے چل کر سکر چکیوں کے علاقوں کے وارث ہوں گے۔ رنجیت سنگھ سے اس رشتے کی وجہ سے سدا کور نے نہ صرف کنہیاؤں کے مفادات کا تحفظ کیا بلکہ اپنے علاقوں کو بھی وسعت دینے لگی۔ خود رنجیت سنگھ، جسے اپنی

بدبختی کے بارے میں کوئی شبہ نہیں تھا، کے دل و دماغ پر شادی کے تلخ تجربے نے گہرا اثر ڈالا اور زندگی کے بارے میں اس کے رویے کو یکسر تبدیل کر کے رکھ دیا۔ اب وہ دوسروں سے محبت کی بجائے اُن کی وفاداریوں کا مطالبہ کرتا اور ایسا صرف طاقت کے ذریعے ممکن تھا۔ کنہیا اب اس کے لیے اس مقصد کے حصول کا ایک ذریعہ تھے۔ سدا کور اور رنجیت سنگھ کے درمیان ایک عجیب وغریب محبت / نفرت کا رشتہ پرورش پا رہا تھا۔ دونوں اپنے علاقوں کو وسعت دینے کی خواہش رکھتے تھے اور ایک دوسرے کی اس خواہش کا احترام بھی کرتے تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے لاپروا بھی تھے اور ایک دوسرے کی لاتعلقی کو نظر انداز کرنے کے لیے تیار بھی۔ مختصراً اپنے ارادوں اور خواہشات میں مماثلت کی وجہ سے دونوں نے ایک دوسرے کو ٹھیک ٹھیک سمجھنا پرکھنا شروع کر دیا۔ یہ سدا کور تھی جس نے سب سے پہلے مدد کے لیے پکارا۔ اس کے علاقے کو رام گھڑیوں سے خطرہ تھا اور اس خطرے کو ٹالنے کے لیے رنجیت سنگھ کو رام گھڑیوں کے ایک قلعے کی ناکہ بندی کرنا پڑی۔ واپس گوجرانوالہ جاتے ہوئے رنجیت سنگھ لاہور میں تین روز تک بھنگیوں کا مہمان رہا اس عرصہ کے دوران اس نے شہر کے انتظام وانصرام اور دفاع کے حوالے سے مفید معلومات حاصل کیں۔

اب رنجیت سنگھ کے ذہن میں طاقت اور اقتدار کے سوا کوئی دوسری سوچ نہیں تھی۔ پچھلی مہم کے تجربے سے اسے معلوم ہو گیا تھا کنہیا اتنی بڑی قوت نہیں جتنی وہ سمجھتا تھا۔ اگر وہ کسی اور مثل کو اپنے ساتھ ملا لے تو اس کی کامیابی کے امکانات روشن ہو جائیں گے۔ اس نے نکئیوں کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا اور 1798 میں دوسری شادی کی۔ اس کی دوسری بیوی نکئی سردار کی بہن تھی۔ یہ شادی پچھلی شادی کے مقابلے میں کامیاب ثابت ہوئی۔ نئی بیوی کا وہی نام تھا جو اس کی ماں کا تھا یعنی راج کور۔۔۔ راج کور نے محبت اور سمجھ بوجھ کے ساتھ رنجیت سنگھ کے لاابالی پن کو جھیلا۔ بعد میں بھی اگرچہ رنجیت سنگھ کی زندگی میں بہت سی عورتیں آئیں لیکن کسی کے لیے بھی اس کے دل میں وہ احترام پیدا نہ ہو سکا جو راج کور (جسے بعد میں دتر کور کا نام دیا گیا) کے لیے تھا شاید اسی لیے دتر کور کو محبت سے مائی نکیاں بھی کہا جانے لگا۔

رنجیت سنگھ کی دوسری شادی نے مہتاب کور کو واپس بٹالہ جانے کا جواز فراہم کر دیا تھا۔ اس کے بعد مہتاب کور خاص مواقع پر ہی رنجیت سنگھ کی طرف آئی۔ سدا کور کو بھی رنجیت سنگھ کی شادی سے دکھ ہوا مگر چونکہ اس کی نظر بڑے مقاصد پر ٹکی ہوئی تھی اس نے یہ کڑوا گھونٹ نگل لیا اور رنجیت سنگھ کی دوسری شادی کو قبول کر لیا۔ وہ تو بس یہ چاہتی تھی کہ اس نے جو منصوبہ بنایا ہوا ہے رنجیت سنگھ کے ذریعے اس کو پورا کرے۔

ادھر رنجیت سنگھ اپنی ازدواجی زندگی کے امور طے کر رہا تھا تو دوسری جانب سکر چکیہ جاگیر کے امور ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے۔ اس کے ماموں ڈل سنگھ اور جاگیر کے نگران لکھپت رائے کے درمیان اختلافات شدید تر ہو چلے تھے۔ اسی دوران ایک روز لکھپت رائے آبیانہ اکٹھا کرنے کے لیے جاگیر کے دورے پر نکلا ہوا تھا کہ کسی نے اس کا قتل کر دیا۔ قاتل گرفتار نہ کیا جا سکا تاہم افواہوں کا بازار گرم تھا کہ ڈل سنگھ نے اسے مروا دیا ہے[3]۔ رنجیت سنگھ سمجھ گیا کہ اب وقت آ گیا ہے کہ وہ خود کو نام نہاد مشیروں کے نرغے سے آزاد کرے اور جاگیر کے امور اپنے ہاتھ میں لے۔ سترہ برس کی عمر میں رنجیت سنگھ سکر چکیہ وراثت کا بلاشرکت غیرے مالک بن گیا۔

2

پنجاب اور افغان لشکر کشی

اگر ہم ماضی پر نظر ڈالیں تو 1790 کے عشرے میں پنجاب ہمیں آڑی سیدھی سمتوں میں بٹا ہوا ایک معمہ نظر آئے گا ایک ایسی تصویر جو چودہ حصوں پر مشتمل ہو اور مختلف اطراف سے پانچ تیر اس کے آر پار گزر رہے ہوں۔ ان چودہ حصوں میں بارہ سکھ مثلیں تھیں جبکہ باقی دو اضلاع میں، لاہور کے پڑوس میں واقع قصور اور پنجاب کے جنوب مشرق میں انگریز مہم جو جارج تھامس کے زیرِ نگیں ضلع ہانسی۔ اب بات ہو جائے پانچ تیروں کی: شمال مغرب میں موجود افغان، شمال میں کانگڑہ کے راجپوت، شمال مشرق میں گورکھے، مشرق میں انگریز اور جنوب مشرق میں مرہٹے۔

مثلوں میں بھی وہ اتحاد نہیں رہا تھا جو پچاس برس پہلے احمد شاہ ابدالی کے حملے کے وقت دیکھنے کو ملا تھا۔ جب احمد شاہ ابدالی نے لشکر کشی کی تھی تو تمام سکھ مثلیں جسا سنگھ اہلو یانوالہ کی سرکردگی میں متحد ہو کر بے جگری سے لڑی تھیں۔ پھر آہستہ آہستہ ان میں اختلافات پیدا ہوتے چلے گئے۔ سب سے پہلے پٹیالہ کے پھلکئے علیحدہ ہوئے۔ اعلیٰ سنگھ نے ابدالی کی اطاعت کی اور پھلکئے ان کے معاون بن گئے۔ پٹیالہ کا صاحب سنگھ احمد شاہ ابدالی کے پوتے شاہ زمان سے مسلسل رابطے میں تھا جو شمالی ہندوستان پر از سرِ نو تسلط قائم کرنا چاہتا تھا۔ دیگر اہم مثلوں میں کنہیا، نکئی، اہلیانوالہ اور بھنگی شامل تھیں۔ پہلی دو سے تو رنجیت سنگھ کے ازدواجی تعلقات تھے ان سے مدد کی درخواست کی جا سکتی تھی اور اگر ان کے مفادات پر ضرب نہ پڑے تو انھیں بھی تعاون کرنے میں کوئی عار نہ تھا۔ اہلیانوالہ مثل کی سربراہی صاحب سنگھ کے پاس تھی وہ ایک قابل مثل سردار تھا اور چونکہ وہ جسا سنگھ کا جانشین تھا سب اس کو عزت کی نگاہ سے دیکھتے تھے۔ رنجیت سنگھ نے اس سے دوستی کرنے کا فیصلہ کیا۔ تاہم وہ بھنگیوں کے ساتھ اپنے مفادات پر سمجھوتا نہ کر سکا۔ بھنگیوں کے پاس لاہور، امرتسر، گجرات اور شمالی پنجاب کے بڑے حصے کی عملداری تھی۔ رنجیت سنگھ نے بھنگیوں کی کمر توڑنے اور دیگر سرداروں کے ذریعے اپنی خواہشات کی تکمیل کا فیصلہ کیا۔

دریں اثناء پنجاب کے دِل میں دو بیرونی عناصر کی موجودگی کا توڑ کرنا اتنا ہی ضروری تھا جتنا کہ سکھوں میں نفاق کا تدارک۔ لاہور سے 30 میل دور قصور کے پٹھان حکمرانوں کی وفاداریاں پنجاب سے زیادہ اپنے آباؤ اجداد کی سرزمین سے تھیں۔ سکھ مثلوں کے عروج نے ان کو بوکھلا دیا تھا۔ جب بھی ابدالی پنجاب آتا وہ اس کے ساتھ مل کر آس پاس کے شہروں اور علاقوں میں لوٹ مار کرتے۔ جب ابدالی کے پوتے شاہ زمان نے ہندوستان کو افغان قلمرو میں شامل کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو سب سے پہلے جس نے اس کی مدد کا وعدہ کیا وہ قصور کا نظام الدین خان تھا۔ دوسرا بیرونی عنصر انگریز مہم جو جارج تھامس تھا۔ تھامس نے اپنے جہاز کو چھوڑ کر مقامی سکھ سرداروں کے ہاں نوکری کی بعد ازاں اس نے گھڑ سواروں کے ایک دستے کی مدد سے اپنی علیحدہ جاگیر قائم کی جس کا صدر مقام ہانسی کو منتخب کیا۔ یہاں اس نے اپنے نام سے ایک قلعہ بھی تعمیر کروایا اور علاقے کا نام جارج گڑھ رکھا۔ اس کی غارت گری کا سلسلہ پٹیالہ اور جنڈ کی ریاستوں تک پھیلا ہوا تھا۔ اس نے سکھ مثلوں کے باہمی نفاق کا فائدہ اٹھایا 1800 میں وہ 5000 سپاہیوں اور 60 توپوں کے ساتھ دریائے ستلج کے کنارے پہنچا وہاں سے اس نے خط کے ذریعے گورنر جنرل کو یونین جیک دریائے سندھ کے کناروں تک لہرانے یعنی ان تمام علاقوں کو انگریز کی عملداری میں لانے کی پیشکش کی۔ ''یہ قوم (سکھ) جتنی خطرناک بتائی جاتی ہے اتنی ہے نہیں'' اس نے اپنے سوانح نگار کو بعد میں یہ بات بتائی ''اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ اگر باقاعدہ فوج اس کے مقابلے میں اتاری جائے تو یہ اُس کے سامنے نہیں ٹھہر سکیں گے'' اس نے پنجاب میں مرہٹوں کی فتوحات کا ذکر کیا جب انھیں کہیں سے بھی مزاحمت کا سامنا نہیں کرنا پڑا تھا اس نے شاہ زمان کے افغان لشکر کے سامنے سکھ سرداروں کی بے بسی کی بھی مثال دی اور اپنی شان میں کچھ اس طرح گویا ہوا ''میں نے اس سارے علاقے کو کھنگالا ہے، اتحاد قائم کیے ہیں اور مختصر یہ کہ آج میں دریائے ستلج کے جنوب میں بسنے والے سکھوں کا بلا شرکتِ غیرے مالک ہوں''

تاہم آزاد اور طاقتور پنجاب کے لیے سب سے بڑا خطرہ افغان تھے جو ابدالی کی فتوحات کے وقت سے شمالی ہندوستان کے زیادہ تر حصوں کو اپنی قلمرو کا حصہ سمجھتے تھے۔ ابدالی کی ہندوستان کو اپنی سلطنت کی طرح برتاؤ کرنے کی کاوشوں کو سکھوں سے خاصا نقصان پہنچا تھا اگرچہ اس کے بیٹے اور جانشین تیمور نے اس طرح کے دعوے کرنا جاری رکھے تاہم وہ کشمیر پر قبضہ قائم رکھنے اور ملتان سے بھنگیوں کو باہر نکالنے کے علاوہ کچھ نہیں کر سکا۔ اس کا بیٹا شاہ زمان زیادہ جوشیلا ثابت ہوا اور اپنے باپ کی جگہ لیتے ہی اس نے اعلان کیا کہ وہ ہندوستان پر از سرِ نو افغان حکومت کی عملداری قائم کرے گا پنجاب کی خوش نصیبی کہ ابدالی نے اپنی نسل کے لیے جو چیز وراثت میں چھوڑی تھی وہ پنجاب کو زیرنگین کرنے کے خواب تھے 1793 میں اس نے ہندوستان پر پہلی یلغار کی اور اپنی فوجوں کو حسن ابدال تک لے آیا۔ دو برس بعد اس نے نہ صرف دوبارہ حسن ابدال پر چڑھائی کی بلکہ سکر چکیہ کے مضبوط گڑھ قلعہ روہتاس پر بھی قبضہ کر لیا اس طرح رنجیت سنگھ پہلا سکھ سردار تھا جسے شاہ زمان کے ہاتھوں

ہزیمت کا سامنا کرنا پڑا اس دوران شاہ کو مغرب کی سمت سے ہونے والے حملے سے اپنے ملک کو بچانے کے لیے واپس افغانستان لوٹنا پڑا۔ اس کے پیٹھ موڑتے ہی رنجیت سنگھ نے روہتاس قلعے سے افغانیوں کو مار بھگایا تاہم پنجاب میں شاہ زمان اور اس کے افغان جنگجوؤں کی یہ آخری پیش قدمی نہیں تھی اپنے منصوبوں کو عملی شکل دینے کے لیے شاہ زمان جن عناصر پر بھروسا کرتا تھا ان میں سے ایک کانگڑہ کا راجپوت شہزادہ سنسر چند تھا۔ تاہم یہ بات واضح نہیں کہ آیا سنسر چند افغانیوں کے منصوبوں کو آگے بڑھا رہا تھا یا خود اپنی سلطنت کو پہاڑوں سے میدانوں تک وسعت دینا چاہتا تھا۔ آس پاس کی سکھ بستیوں کو وہ پہلے ہی اپنی جاگیر کا حصہ بنا چکا تھا سکھوں کے باہمی نفاق نے اس کے راستے آسان کر دیے تھے۔ جب رنجیت سنگھ سکر چکیہ مثل کا نظم ونسق اپنے ہاتھ میں لینے جا رہا تھا ٹھیک اس وقت سنسر چند پنجاب کو فتح کرنے کی منصوبہ بندی کر رہا تھا۔

دریں اثنا گورکھے جو ایک جنگجو نسل سمجھے جاتے تھے ہمالیہ کی مشرقی ریاستوں میں خطرناک طاقت بن کر ابھرے تھے ان کی سربراہی امر سنگھ تھاپا نامی ایک باصلاحیت سردار کر رہا تھا انھوں نے مشرق سے مغربی پہاڑی سلسلے کی سمت بڑھنا شروع کر دیا تھا یہاں تک کہ وہ سنسر سنگھ کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔ اب سنسر سنگھ کے پاس دو ہی راستے بچے تھے یا تو وہ اور گورکھے آپس میں الجھتے یا پھر ایک دوسرے کے ساتھ ملکر پنجاب پر بھرپور حملہ کرتے اور مالِ غنیمت میں برابر کے حصے کے حقدار بنتے۔ پنجابیوں کی باہمی ناچاقی نے دوسرے راستے کو آسان بنا دیا تھا۔

ادھر مشرق میں اب بھی دو قوتیں موجود تھیں اس وقت ہندوستان میں عظیم ترین قوت سمجھے جانے والے مرہٹے اور دوسرے انگریز۔ مرہٹوں کی قوت سارے برِصغیر میں پھیلی ہوئی تھی۔ اگرچہ 1761 میں پانی پت کے میدان میں انھیں احمد شاہ ابدالی کے ہاتھوں ذلت آمیز شکست کا سامنا کرنا پڑا تھا تاہم اس جھٹکے سے سنبھلنے میں انھیں زیادہ وقت نہیں لگا اور چند ہی سالوں میں انھوں نے آگرہ پر قبضہ کر لیا، مغل شہنشاہ کو دہلی میں ہی انگریزوں کی کاسہ لیسی تک محدود کر دیا اور جنوبی پنجاب پر یلغار کر دی۔ اُن کے سپاہی سکھوں سے بہتر تربیت یافتہ تھے اور ان کی سربراہی تجربہ کار سپہ سالار کر رہے تھے شمال میں ان کی فتوحات کو فرانسیسی جرنیلوں بوائن (Du Boigne) پاغاں (Perron) اور بورغقین (Bourquin) سے مدد مل رہی تھی۔ میرٹھ میں جو کہ فرانکو انڈین تہذیب کا مرکز بن چکا تھا مرہٹہ لشکر میں شامل یہ فرانسیسی فوجی اکٹھے ہوتے اور اس وقت کی بات کرتے جب وہ عنقریب برطانوی فوج کو شکست دے کر مرہٹوں کی فتح کا جھنڈا نہ صرف ہندوستان کے آخری کونے تک لہرا دیں گے بلکہ اس قلمرو کی حدیں پنجاب سے ہوتی ہوئی درۂ خیبر سے جا ملیں گی۔ مرہٹے شہزادوں کی اقتدار کے لیے ایک دوسرے کے ساتھ جاری جنگوں کے پسِ منظر میں یہ خواہش خاصی بے معنی دکھائی دیتی ہے اور اس قسم کی سوچ کہ ہندوستان کسی پکے ہوئے پھل کی طرح فرانسیسی فوجیوں کی گود میں آ گرے گا محض ایک خواہش کے سوا کچھ نہ تھی۔

انگریز دکھاوے میں کم مگر طاقت اور صلاحیت میں مرہٹوں سے کہیں زیادہ تھے۔ بظاہر ان کی خطے میں موجودگی کا ایک ہی سبب تھا: اودھ کے نواب وزیر علی کو جس کی ریاست کی حدیں دریائے گنگا تک پھیلی ہوئی تھیں تحفظ فراہم کرنا۔ (اُن کی سکھ

گھڑ سواروں کے ساتھ اکثر جھڑپیں ہوتیں جو سردیوں کے موسم میں عادتاً دریا کی دوسری طرف آ دھمکتے)۔ ان تمام بیرونی قوتوں میں جن سے پنجاب کو خطرہ تھا انگریز سب سے زیادہ زیرک اور آگے کی سوچ رکھنے والے تھے۔ انھوں نے ہندوستان، سندھ، ایران اور افغانستان کے بڑے شہروں میں اپنے جاسوس چھوڑے ہوئے تھے جو انھیں پل پل کی خبر بھیجتے تھے۔ سکھ، مرہٹہ اتحاد کے خطرے کو انھوں نے کئی برس پہلے ہی بھانپ لیا تھا۔ اسی طرح اب بھی انھیں معلوم ہو گیا تھا کہ زمان کے جارحیت پسندانہ عزائم سے تمام ہندوستان کو خطرہ ہے۔ انھوں (انگریزوں) نے کمال ہشیاری سے یہ بھی بھانپ لیا تھا کہ افغانیوں کے مقابلے میں ڈٹ جانے کے لیے جن لوگوں پر بھروسا کیا جا سکتا ہے وہ نہ مرہٹے ہیں، نہ گورکھے اور نہ ہی راجپوت بلکہ اگر کوئی قوم افغان لشکر کا ڈٹ کر اور دلیری سے مقابلہ کر سکتی ہے تو وہ سکھ ہیں۔ انھوں نے یہ بھی قیاس لگا لیا تھا کہ وہ شخص جو سکھوں کو منظم کر سکتا ہے اس وقت ایک غیر معروف کم سن لڑکا رنجیت سنگھ ہے۔ انھوں نے ایک حکمت عملی وضع کی جس سے ان کی سیاسی فہم و فراست کا اندازہ ہوتا ہے انھوں نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے مقامی سکھ سرداروں کو پیغام بھجوایا کہ وہ رنجیت سنگھ کی سربراہی میں متحد ہو جائیں انگریز افغانوں سے لڑنے کے تیار بلکہ بے چین تھے چاہے اس کے لیے انھیں آخری سکھ کو ہی کیوں نہ مروانا پڑ جائے۔

1796 کے موسمِ خزاں میں شاہ زماں اپنے آبائی وطن سے نکلا اور اپنا الو نما منحوس سایہ پنجاب پر پھیلا دیا1۔ یہ تیسری مرتبہ تھا جب وہ دہلی پہنچنے کی نیت سے دریائے سندھ عبور کر رہا تھا اگرچہ اس کی پہلی دو کوششیں ناکام ہو چکی تھیں تاہم ہندوستان میں اس کے لاؤ لشکر کی افواہوں سے پہلے ہی بے چینی پھیل چکی تھی۔ شاہ زمان کے ساتھ 30 ہزار مسلح جنگجو تھے اور اسے قوی امید تھی کہ ہندوستان کے مقامی لوگوں کی بڑی تعداد اسکے لشکر میں شامل ہو جائے گی قصور کے نظام الدین خان سے وہ وعدہ کر چکا تھا کہ اس لشکر کشی میں ساتھ دینے کے عوض اسے لاہور کی صوبیداری دی جائے گی دریائے ستلج کے پار پٹیالہ کا صاحب سنگھ تھا جو روایتاً ہر طاقتور جارح کا ساتھ دیتا چلا آ رہا تھا۔ پنجاب سے پرے افغان روہیلے، اودھ کا وزیر اور حیرت انگیز طریقے سے دور دراز کی ریاست میسور کے ٹیپو سلطان نے بھی اُس کی مدد کا وعدہ کر لیا تھا۔ ان سب نے افغان حکمران پر اس لشکر کشی کے لیے زور دیا تھا اور اُن کی دعوت کا شاہ زمان نے ان الفاظ کے ساتھ جواب دیا تھا: ''ہم بہت جلد اپنے لاؤ لشکر کے ہمراہ کافروں اور ایک سے زائد خداؤں کی پوجا کرنے والوں کے ساتھ جنگ کرنے اور اس خطے کو ان بے حیا اور بے غیرت لوگوں سے پاک کرنے کے لیے آ رہے ہیں۔''2 اس وقت ہندوستان میں دو ''کافر'' قومیں موجود تھیں مرہٹے اور سکھ اور جغرافیائی لحاظ سے اس کے راستے میں پہلے آنے والی کافر قوم سکھوں کی تھی۔

افغان لشکر کشی کی خبر پھیلتے ہی لوگوں نے جان و مال کی سلامتی کے لیے پہاڑیوں کا رخ کرنا شروع کر دیا وہ مسلدار جو لوگوں کی رکھوالی کے لیے ان سے ٹیکس وصول کر رہے تھے اور اب یہ ان کی اخلاقی ذمہ داری تھی کہ وہ انھیں تحفظ فراہم کرتے بھاگنے والوں میں سب سے آگے تھے۔ دسمبر کے مہینے تک افغانی فوج پنجاب میں جہلم تک کے علاقے پر قبضہ کر چکی تھی۔

گجرات کا صاحب سنگھ بھنگی اور رنجیت سنگھ ان سکھ سرداروں میں شامل تھے جن کے علاقے افغان فوج کی لاہور پر چڑھائی کے دوران راستے میں پڑتے تھے صاحب سنگھ نے افغان حملہ آور کا راستہ روکنے کی اپنی سی کوشش کی لیکن ہمت ہار کر مشرق کی طرف فرار ہو گیا

شاہ زمان کا مقابلہ کرنے کے لیے رنجیت سنگھ صرف 5000 غیر منظم گھڑسوار تیار کر سکا جن کے پاس بندوقوں اور نیزوں کے سوا کچھ نہ تھا ان غیر تربیت یافتہ جنگجوؤں نے بھاری اسلحے سے لیس افغان لشکر کا مقابلہ کرنا تھا جس کے پاس توپیں اور اونٹوں پر لگی گھومنے والی بندوقیں تھیں۔ افغان لشکر کشی کو روکنے کا ایک ہی طریقہ تھا: سکھوں کا باہمی اتحاد وگرنہ وہ افغان ٹڈی دل کے سامنے تر نوالہ ثابت ہونگے۔ سکھ سرداروں کی ملاقات کی ایک ہی جگہ تھی امرتسر۔ رنجیت سنگھ اپنے خاندان اور گھڑسواروں کے ہمراہ مقدس شہر کی طرف روانہ ہو گیا۔

دوسرے سکھ سرداروں نے بھی سربت خالصہ (سکھوں کی باہمی ملاقات) کے سندیسے کا مثبت جواب دیا اور امرتسر پہنچ گئے۔ سرداروں کی اکثریت نے وقتی طور پر اپنے علاقوں کو افغانیوں کے رحم وکرم پر چھوڑ کر پہاڑوں پر چلے جانے اور لوٹ مار کر کے واپس جاتے ہوئے افغان لشکر پر گوریلا حملوں کی تجویز دی۔ اس تجویز کو پیش کرنے والا گجرات کا بزرگ صاحب سنگھ بھنگی تھا۔ اجلاس میں موجود سرداروں کی اکثریت نے اس تجویز کی حمایت کی وہ پہلے ہی اپنے بیوی بچوں کو پہاڑوں پر چھوڑ آئے تھے اور ان سے ملنے کے لیے بے تاب تھے

سدا کور نے رنجیت سنگھ کو جان بچا کر بھاگنے کی بجائے رک کر شاہ زمان سے مقابلہ کرنے پر آمادہ کر لیا رنجیت سنگھ کے اس بہادرانہ فیصلے سے اسے سکھ سرداروں کی اکثریت کی حمایت حاصل ہو گئی اور اس نے سکھ لشکر کی سربراہی کرتے ہوئے لاہور کی جانب پیش قدمی کی اس نے افغانیوں اور ان کے ہندوستانی مددگاروں کو آس پاس کے دیہاتوں سے بھگا دیا اور شہر کا محاصرہ کر لیا۔ ہر رات اس کے سکھ جوان کسی ایک سمت سے حملہ آور ہوتے اور افغانیوں کو مار کر اندھیرے میں غائب ہو جاتے۔

جنوری 1797 میں شاہ کو اطلاع ملی کہ اُدھر افغانستان میں اس کا بھائی محمود اس کے خلاف بغاوت کی تیاری کر رہا ہے۔ شاہ زمان اپنے وفادار جنرل شاہانچی خان کو 12000 فوجیوں کے ساتھ لاہور کی کمان سونپ کر واپس کابل کی طرف روانہ ہو گیا۔ سکھوں نے جنھیں واپس جاتی ہوئی فوج پر حملہ کر کے مسرت حاصل ہوتی اس کا جہلم تک تعاقب کیا اور ساز وسامان کے بڑے حصے سے محروم کر دیا اُدھر شاہانچی خان نے یہ سوچ کر کہ واپس آتے ہوئے سکھوں پر حملہ کرنے کا اس سے اچھا کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا اپنے فوجیوں کے ہمراہ رام نگر کے قریب اُن کا راستہ روکا تاہم سکھ اس کے اندازے سے زیادہ سخت جان ثابت ہوئے۔ سکھ فوجی جنگجوؤں نے اس کے عزائم مٹی میں ملاتے ہوئے اس کے لشکر کو ذلت آمیز شکست سے دوچار کیا۔ سردیوں میں مکمل کی گئی اُس مہم کے بعد رنجیت سنگھ ایک غیر معروف سردار کی بجائے پنجاب کے ہیرو کے طور پر جانا جانے لگا۔

اُس ہتک آمیز شکست کی ذلت افغان شاہ کے ذہن میں کھٹکتی رہی اور جونہی اس نے اپنے بھائی کے ساتھ گھریلو ناچاقی دور کی "زمان نے دشمنی کی گرد کو دوبارہ آسمان کی بلندی تک چڑھادیا3" ایک بار پھر لوگوں نے گھر بار چھوڑنا شروع کر دیئے اور پہاڑیوں میں جا چھپنے میں ہی عافیت جانی۔ اکتوبر کے ماہ تک پنجاب کے تمام بڑے شہر ویران ہو چکے تھے۔ زمان نے قسم اُٹھائی ہوئی تھی کہ وہ سکھوں سے اس شکست کا عبرتناک انتقام لے گا۔ اپنے ہم وطنوں کو زیادہ سے زیادہ لشکر میں شامل کرنے کے لیے اس نے یہ بھی اعلان کیا کہ وہ ہندوستان میں لوٹ مار کرنے کے لیے آزاد ہوں گے اس مرتبہ لشکر میں شاہا نچی خان کے بیٹے بھی شامل تھے جو اپنے باپ کی شکست کا بدلہ لینے کے لیے بے چین تھے۔

ایک مرتبہ پھر پنجاب میں خوف و ہراس کے سائے پھیلنے لگے حتیٰ کہ امرتسر کے مقدس گوردوارے کی حفاظت پر مامور محافظوں کی تعداد میں بھی نمایاں کمی ہوگئی۔ "سکھوں میں اس طرح کی سراسیمگی کسی طور بھی ان کے شایانِ شان نہیں" دہلی کے مغل دربار سے وابستہ ایک انگریز منشی کولنز لکھتا ہے۔ صاحب سنگھ نے گجرات خالی کر دیا تھا افغان حملہ آوروں نے شہر میں لوٹ مار کا بازار گرم کر دیا اور مقامی باشندوں کا قتلِ عام کیا۔ ہندو اور سکھ تو پہلے ہی فرار ہو چکے تھے شہر کی بچی کھچی آبادی میں پنجابی مسلمانوں کی بڑی تعداد موجود تھی یہ لوگ افغان حملہ آوروں کے ظلم وستم کا نشانہ بنے گوجرانوالہ میں بھی جسے رنجیت سنگھ چھوڑ کر جا چکا تھا یہی کہانی دہرائی گئی۔

ادھر امرتسر کے سربت خالصہ اجلاس میں اکثریت ایک بار پھر پہاڑوں میں جا چھپنے کی حامی تھی اور ایک بار پھر یہ سدا کور ہی تھی جس نے انھیں یاد دلایا کہ ان کا یہ فرض تھا کہ اپنے عوام کی جان و مال کی حفاظت کریں اور اسی بات کا وہ عوام سے ٹیکس لے رہے تھے اور اگر سرداروں نے بھاگنے کا فیصلہ کیا تو وہ ان بچے کھچے سرداروں کی سربراہی کرتے ہوئے جو اس کے نظریے سے اتفاق کرتے ہیں حملہ آوروں کا مقابلہ کرے گی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی ساس کی حمایت کرتے ہوئے اجلاس میں موجود سکھ سرداروں سے پرجوش اپیل کی کہ وہ امرتسر کے مقدس شہر کو ان لوگوں کے رحم و کرم پر نہ چھوڑیں جو مذہبی مقدس مقامات کی تذلیل کو اپنے لیے اعزاز کی بات سمجھتے تھے رنجیت سنگھ کے ایک رشتہ دار دل سنگھ نے اس موقع پر حاضرین مجلس کو بتایا کس طرح اس نے ایک مرتبہ شاہ کے پھلوں سے لدے ایک قافلے کو لوٹا تھا اس نے اس اجلاس میں موجود سرداروں سے مخاطب ہو کر کہا کہ افغانیوں کو بطور سپاہی جنگجو بہت بڑھا چڑھا کر پیش کیا جاتا ہے حقیقت تو یہ ہے کہ سکھوں کو انھیں شکست دینے میں کوئی دقت پیش نہیں آئے گی۔ ان پرجوش تقاریر سننے کے بعد وہاں موجود سکھوں نے یہ فیصلہ کیا: "فتح خدا کا بڑا انعام ہے آیئے خدا کی مخالفت کرنے کی اپنی سی کوشش کر دیکھتے ہیں" ایک بار پھر رنجیت سنگھ کو اس لشکر کا سربراہ منتخب کیا گیا۔

افغانیوں کی ابتدا اتنی اچھی نہیں تھی۔ اگرچہ اس مہم کی ابتدا میں زمان نے اعلان کیا تھا کہ وہ سکھوں کو جڑ سے اکھاڑ کر ختم کر دے گا جو لوگ اس کے غیظ و غضب کا نشانہ بنے وہ پنجابی مسلمان تھے۔ اُنہوں نے یہ سوچ کر اپنے گھر خالی نہیں کیے تھے کہ افغان لشکر اپنے ہم مذہبوں کو چھوئے گا بھی نہیں۔ افغان لشکریوں نے مسلمان کھیتی باڑی کرنے والوں کی ان تمام اشیاء پر

قبضہ کرلیا جن کی انھیں ضرورت تھی۔

زمان نے اپنے ہندو حمایتیوں، کانگڑہ کے سنسر چند اور جموں کے راجا، کو خط کے ذریعے ان تمام سکھ خاندانوں کو پناہ دینے سے روک دیا جو ان کے زیرِ نگیں پہاڑی سلسلے میں جان بچانے کی غرض سے جا چھپے تھے۔ 27 نومبر 1798 کو شاہ زمان لاہور میں داخل ہوا اس مرتبہ اس نے اپنے لشکر کو شہر میں داخل ہو کر لوٹ مار کرنے سے سختی سے منع کر دیا۔ جنگ صرف سکھوں کے ساتھ تھی اور اگر سکھوں کو پنجابی مسلمانوں اور ہندوؤں سے علیحدہ کر دیا جائے تو آدھی جنگ لڑے بغیر جیت لی جائے گی اس کے علاوہ اگر سکھوں کو بھی مجاہل (ستلج اور راوی کے درمیان بسنے والے سکھ) اور ملواعی (دریائے ستلج کی مشرق میں بسنے والے) میں تقسیم کر دیا جائے تو پنجاب ایک گولی چلائے بغیر پکے ہوئے پھل کی طرح گود میں آ گرے گا۔ کاغذ پر شاہ کا یہ منصوبہ ہر لحاظ سے مکمل تھا۔

قصور کے نظام الدین خان نے خود کو پنجاب کے مسلمانوں کا رہنما ظاہر کرتے ہوئے شاہ زمان کو خوش آمدید کہا۔ اس کی خواہش تھی کہ شاہ زمان صوبے میں جلد از جلد عملداری قائم کر کے لاہور کی صوبیداری اسکے حوالے کر دے اسی طرح کانگڑہ کے سنسر چند نے خود کو ہندوؤں کا نمائندہ ظاہر کیا۔ اسی طرح پٹیالہ کے صاحب سنگھ نے بھی ملواعی سکھوں کی ترجمانی کرتے ہوئے شاہ زمان کو اپنے خاندان کی اس کے بزرگوں کے ساتھ وفاداری کی داستانیں سنائیں۔ شاہ زمان کی آنکھ میں اگر کوئی کھٹک رہا تھا تو وہ اٹھارہ سالہ رنجیت سنگھ تھا جو جالندھر دوآبہ اور ماجھا کے علاقوں کے درمیان سکھ مثلوں کی سربراہی کر رہا تھا۔

شاہ نے ایک دستہ امرتسر روانہ کیا۔ رنجیت سنگھ نے شہر سے پانچ میل باہر نکل کر افغان دستے کا مقابلہ کیا اور انھیں لاہور کی طرف پسپا ہونے پر مجبور کر دیا رنجیت سنگھ نے نہ صرف انھیں واپس جانے پر مجبور کر دیا بلکہ ان کے پیچھے جا کر شہر کا محاصرہ کر لیا رنجیت سنگھ نے افغان لشکر کی سپلائی لائن کاٹ دی اور آس پاس کی فصلوں کو آگ لگا دی۔ افغانیوں کے پاس جوابی حملہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہ تھا نظام الدین خان ایک دستے کی سربراہی کرتے ہوئے دریائے راوی عبور کرنے کے بعد شاہدرہ کے مقام پر سکھ دستے کا مقابلہ کرنے کے لیے آیا۔ سکھوں نے افغان فوج کا بڑے پیمانے پر قتلِ عام کیا لاہور سے تازہ دم افغان دستے بھیجے گئے مگر ان کے آنے تک سکھ چھاپہ مار غائب ہو چکے تھے۔ تازہ دم افغان دستوں نے اس شکست کا بدلہ مقامی غیر مسلح مسلمان آبادی کا قتل عام کر کے چکایا۔

اس واقعے نے رنجیت سنگھ کا حوصلہ مزید بلند کر دیا۔ وہ اکثر مثمن بُرج پر چڑھ جاتا (مثمن بُرج قلعہ لاہور کا آٹھ کونوں والا ٹاور ہے جو کہ دریائے راوی کے کنارے واقع ہے) اور شاہ زمان کو جو کہ قلعہ لاہور میں دربار لگائے بیٹھا ہوتا للکار کر کہتا ''اوئے ابدالی کے پوتے آ نیچے آ کر دیکھ چڑت سنگھ کا پوتا تجھے تلواریں لڑانے کا چیلنج دے رہا ہے''

دن گزرتے گئے اور افغانیوں کے لاہور سے باہر نکلنے کے امکانات معدوم ہوتے چلے گئے ان کے لیے یہ ممکن نہ تھا کہ

وہ سکھوں کے حصار کو توڑ کر دہلی کی طرف بڑھتے۔ اس تمام عرصے میں زمان اپنے افغان جنگجوؤں کو شرم دلاتا رہا مگر سکھوں کی دہشت اتنی زیادہ تھی کہ وہ رات کو اپنی بیرکوں سے باہر جانے کا تصور بھی نہ کر سکتے۔

شاہ زمان نے کفار کے خلاف جہاد اور سکھوں کو صفحہء ہستی سے مٹانے جیسی باتیں کرنا چھوڑ دیں۔ اس نے اپنے ایجنٹوں کو امرتسر بھیجا جنھوں نے سکھ سرداروں کو یقین دلایا کہ ان کے علاقوں اور جائیدادوں کو کوئی نقصان نہیں پہنچایا جائیگا۔ اس نے اپنے ایجنٹوں کے ذریعے سکھ سرداروں کہ یہ پیغام بھی بھجوایا کہ وہ جو چاہتے ہیں بتائیں۔ اس کو جواباً جو پہلا پیغام ملا وہ سب سرداروں کا متفقہ جواب تھا: افغان فوجیں سکھوں کو ان کے علاقوں میں پرامن طریقے سے رہتا چھوڑ کر واپس اپنے ملک چلی جائیں۔ زمان نے اپنے ایجنٹوں کو ہدایت کی تھی کہ سکھوں کے درمیان نفاق کا بیج بونے اور باہمی اختلافات کو ہوا دینے کی کوشش کریں۔ اس کے ایجنٹ علیحدہ علیحدہ ہر سردار سے ملے اور اسے مال و زر کی فراخدلانہ پیش کش کی۔ شاہ زمان کی یہ چال زیادہ کامیاب ثابت ہوئی۔ بہت سے سرداروں نے جواباً اپنے نمائندوں کو لاہور بھیجا شاہ زمان خود آگے بڑھ کر انھیں ملتا اور ان پر نوازشوں کی بارش کر دیتا۔ وہ شاہانہ انداز میں ان سے یوں مخاطب ہوتا ''میں بغیر کسی حساب کتاب کے یہ علاقہ آپ کے حوالے کر رہا ہوں۔ آپ بے خوف و خطر ہو کر اسے اپنے پاس رکھیں، یہاں کاشت کاری کریں''۔ رنجیت سنگھ نے بھی لاہور کی صوبیداری کے لیے مذاکرات کی خاطر اپنے نمائندوں کو شاہ زمان کے پاس بھیجا عین اس وقت جب افغان سفارت کاری کامیاب ہوتی دکھائی دے رہی تھی اور سکھوں کا باہمی اتفاق پارہ پارہ ہونے جا رہا تھا صاحب سنگھ بیدی کی صورت میں ایک نجات دہندہ نمودار ہوا۔ صاحب سنگھ کو بابا گورو نانک کی نسل سے ہونے اور ضعیف العمری کے باعث سکھوں میں عزت و احترام کی نظر سے دیکھا جاتا تھا۔ اس نے سرداروں پر زور دیا کہ وہ بیرونی حملہ آور کے ساتھ مذاکرات کا راستہ ترک کر دیں۔ سکھ سرداروں نے صاحب سنگھ کی بات سے اتفاق کیا۔ اگلی مرتبہ جب شاہ زمان کے ایجنٹ ان سے مذاکرات کے لیے پہنچے تو صاحب سنگھ بیدی نے سکھوں کی ترجمانی کرتے ہوئے ان سے صاف لفظوں میں کہہ دیا: ''ہم نے اس علاقے پر تلوار کے زور پر قبضہ کیا ہے اور تلوار کے بل پر ہی ہم اس کی حفاظت کریں گے''۔ زمان کا سکھوں کی حمایت حاصل کرنے کا منصوبہ ناکام ہو گیا۔ اس نے قسم کھائی کہ وہ سکھوں کو سبق سکھا کر رہے گا۔ تاہم یہ بات محض ایک کھوکھلا دعویٰ ثابت ہوئی اور اسی روز کی روداد بیان کرتے ہوئے زمان سنگھ کے دربار کا اخبار نویس لکھتا ہے: ''شاہ کا خیمہ اُن سکھ بندوقچیوں کی وجہ سے ہر وقت خوف کے سائے میں رہتا ہے جو رات کے وقت لاہور میں نمودار ہوتے ہیں اور گولہ باری کرنے کے بعد واپس چلے جاتے ہیں۔ کوئی بھی ان کا سامنا کرنے نہیں جاتا''

وقت شاہ زمان کے خلاف دکھائی پڑتا تھا۔ اس کا بھائی محمود کابل میں ایک بار پھر مشکلات پیدا کر رہا تھا۔ اس کے سپاہی جنھیں کئی مہینوں سے تنخواہ نہیں ملی تھی بددل ہو چکے تھے اور شہر کو لوٹنے کے لیے بے قرار تھے تاہم جب شاہ نے انھیں ایسا کرنے سے روک دیا تو انھوں نے شاہ کو صاف لفظوں میں بتا دیا کہ وہ اس کے لیے مزید نہیں لڑ سکتے۔ شاہ اپنی فتوحات کے

منصوبے کو سرد خانے میں ڈالنے پر مجبور ہو گیا۔اس نے فوجوں کو واپس کابل کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔لاہور چھوڑنے سے پہلے اس نے اعلان کیا کہ اپنے بھائی محمود کے ساتھ دو دو ہاتھ کرنے کے بعد وہ لوٹ کر آئے گا اور ہندوستان کو فتح کر کے اپنی سلطنت کا حصہ بنائے گا۔

اپنے دعوے کے مطابق شاہ زمان بارہ برس بعد پنجاب لوٹا ضرور لیکن اس مرتبہ وہ فاتح یا جارح کی حیثیت سے نہیں آیا تھا۔اس کے بھائی محمود نے اس کو گرفتار کرنے کے بعد اس کی آنکھیں نکلوا دی تھیں اور اپنی بے نور آنکھوں کو اس نے پنجاب کی سمت میں موڑ دیا تھا۔شاہ زمان چھڑی ٹیکتے ہوئے رنجیت سنگھ کے دربار میں سیاسی پناہ کی درخواست لے کر آیا تھا۔

3

پنجاب کا مہاراجا

جب شاہ زمان کی کابل واپسی کی اطلاع امرتسر پہنچی تو سکھ سردار مورچوں سے نکل کر اپنے اپنے علاقوں کی طرف دوڑے تاہم رنجیت سنگھ واحد سکھ سردار تھا جس نے اپنے ذاتی مفادات کا نہیں سوچا۔ وہ فوراً واپس جاتے افغان لشکر کے تعاقب میں نکلا اور گوجرانوالہ کے قریب افغان لشکر کے پچھلے حصے تک جا پہنچا۔ گوجرانوالہ سے جہلم کے کنارے تک اس نے متحرک جنگ جاری رکھی اور دشمن کے جان و مال کو خوب نقصان پہنچایا۔ اس نے زمان کے لشکر سے پہلے پنجاب کی سرحد پر پہنچ کر ان کا محاصرہ کرنے کی بھی کوشش کی 1 تاہم افغان حملہ آور زیادہ تیز ثابت ہوئے اور وہ رنجیت سنگھ کے محاصرے سے باہر نکلنے میں کامیاب ہو گیے۔

ان جھڑپوں کے بعد ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہو گیا کہ ان کا نیا لیڈر پنجاب سے تعلق رکھتا ہے۔ رنجیت سنگھ کی شہرت کے حوالے سے کولنز کے الفاظ پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں: ''اس وقت سارے ہندوستان میں رنجیت سنگھ کو سکھوں کے مفادات کا محافظ سمجھا جاتا ہے۔ عام تاثر یہی ہے کہ اگر رنجیت سنگھ ہوشیاری اور سمجھ بوجھ سے کام نہ لیتا تو پنجاب ریگستان میں تبدیل ہو جاتا جیسا کہ شمال سے آنے والے جنگلیوں نے دعویٰ کیا تھا کہ جہاں ان کے گھوڑوں کے سُم پڑتے ہیں وہاں گھاس تک نہیں اُگتی''2 افغان فوج کی واپسی کے بعد جن سکھ سرداروں نے ایک بار پھر لاہور پر قبضہ کر لیا ان میں چیت سنگھ، صاحب سنگھ اور موہر سنگھ شامل تھے 3۔ لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد ان کی حالت اس کسان کی سی ہو گئی تھی جس کے پاس اچانک بہت سا پیسہ آ جائے۔ لاہور کے ان تینوں حکمرانوں کا بیشتر وقت شراب نوشی اور عورتوں کی صحبت میں گزرتا یا پھر وہ آپس میں الجھتے رہتے جس کا لاہور کے امن و شانتی پر بہت برا اثر پڑا۔ مورخ سوہن لال کے الفاظ میں عوام اس صورتحال سے بیزار ہو گئے تھے: ''لاہور کے پسے ہوئے عوام کی فریاد آسمان تک جا رہی تھی'' نظام الدین خان کے ایجنٹوں نے لاہور کی مسلم اشرافیہ سے

خفیہ رابطے کیے اور تجویز دی کہ وہ نظام الدین کو لاہور پر قبضے کی دعوت دیں تاہم مسلمانوں نے یہ پیش کش ٹھکراتے ہوئے ہندوؤں اور سکھوں کا ساتھ دیا اور خفیہ طور پر رنجیت سنگھ کو لاہور آنے کی دعوت بھجوائی۔

شہریوں کے نمائندوں نے رنجیت سنگھ سے ملاقات کی۔ رنجیت سنگھ کے لیے اس بات کا اندازہ لگانا مشکل تھا کہ آیا یہ دعوت حقیقی تھی یا شہریوں کا اسے لاہوری سرداروں کی تکون سے الجھانے کا منصوبہ تھا۔ اس نے اپنے با اعتماد ساتھی عبدالرحمان کو ان نمائندوں کے ہمراہ لاہور بھیجا تاکہ وہ اسے حقیقی صورتحال سے باخبر کرے اور اس حوالے سے کوئی قدم اٹھانے یا نہ اٹھانے کے حوالے سے مناسب مشورہ دے۔ عبدالرحمان نے کچھ دن لاہور میں گزارے اور وہاں کی نمایاں شخصیات سے ملاقاتیں کیں ان ملاقاتوں کے بعد وہ اپنے آقا سے ملنے بٹالہ پہنچا۔ اس نے رنجیت سنگھ کو یقین دلایا کہ لاہور کے ممتاز شہریوں کی طرف سے دی جانے والی دعوت اُن کے حقیقی جذبات کی ترجمانی کرتی ہے اس نے رنجیت سنگھ کو یہ بھی یقین دلایا کہ اسے لاہور کے موجودہ عیاش سکھ سرداروں کی طرف سے بہت کم مزاحمت کا سامنا کرنا پڑے گا یہ لاہور پر قبضے کا بہترین موقع تھا کیونکہ ان تین سرداروں میں نسبتاً بہتر اور باصلاحیت سردار صاحب سنگھ شہر سے باہر نکلا ہوا تھا۔
سدا کور نے بھی رنجیت سنگھ کو فوری اقدام کا مشورہ دیا۔

ایک باقاعدہ فوجی مہم شروع کرنے کے لیے یہ سال کا نامناسب ترین وقت تھا۔ گرمیاں اپنے عروج پر تھیں اور مون سون بارشیں کسی بھی وقت خشک میدانوں کو دلدلی زمین میں تبدیل کر سکتی تھیں۔ تاہم رنجیت سنگھ لاہور کے سرداروں کو حیران کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ اس نے لاہور پر فوج کشی کے لیے اسلامی کیلنڈر کے مطابق دس محرم کی تاریخ کا انتخاب کیا۔ اس روز شیعہ مسلم پیغمبر اسلام کے نواسے اور اہلِ بیت کی شہادت کا سوگ مناتے ہیں اور گلیوں میں ''حسن، حسین'' کے نام پر سینہ کوبی کرتے ہیں۔ دوپہر میں وہ (شیعہ مسلم) امام حسین کے روضہ کی یاد میں تعزیے نکالتے ہیں اور دن بھر کے ماتم و سینہ کوبی کے بعد انھیں بھرپور عقیدت کے ساتھ دفن کر دیتے ہیں۔ اگرچہ محرم کی ماتمی تقریبات، مجالس و سوگ صرف شیعہ مسلم مناتے ہیں تاہم دوسرے لوگ بھی جوق در جوق ان مجالس میں حصہ لیتے ہیں جہاں نوحے پڑھے جاتے اور اُس روز شہید ہونے والی مقدس ارواح کے کارنامے ذوق و شوق سے بیان کیے جاتے ہیں جیسا کہ رنجیت سنگھ کو اندازہ تھا سکھ سرداروں نے عاشور کا دن اپنے گھروں کی بالکنی میں کھڑے ہو کر محرم کے جلوسوں کا نظارہ کر کے گزارا اور پھر اپنے شیعہ دوستوں کے ساتھ اظہارِ یکجہتی کے لیے ان کی طرف چلے گئے۔ شام میں بھی مجالس اور نوحوں کا سلسلہ جاری رہا۔ رات گئے جب لاہور نے خاموشی کی چادر اوڑھ لی رنجیت سنگھ شہر پناہ سے چند میل کے فاصلے پر تھا۔ اگلے روز صبح سویرے چھتوں پر سونے والے اُٹھ کر کیا دیکھتے ہیں کہ ایک خاموش مہمان 25 ہزار مسلح گھڑ سواروں کے ساتھ شہر کو گھیرے میں لیے ہوئے تھا۔ ہر بندوق اور توپ اپنی پوزیشن لیے ہوئے تھی رنجیت سنگھ نے سدا کور کو لاہور کے مشرق میں دہلی دروازے پر چھوڑا اور خود شہر کے جنوب میں انارکلی کی سمت چل پڑا جہاں اسے شہریوں کی جانب سے خفیہ طور پر خوش آمدید کہا گیا۔ اس نے اپنے گھوڑے سے اترے بغیر شہر کا ایک چکر لگایا

اور شہر پناہ (شہر کی حفاظتی دیوار) میں کئی مقامات پر بارود بھروا دیا۔ جونہی دیوار میں پہلا شگاف پیدا ہوا مہر محکم دین جو لاہور کے مسلمانوں کا سربراہ تھا اس نے نقارہ بجا کر اس بات کا اعلان کیا کہ اب شہر کا انتظام اس نے اپنے ہاتھ میں لے لیا ہے۔ اس اعلان کے ساتھ ہی اس نے شہر کے تمام دروازے کھولنے کا حکم دیا۔ رنجیت سنگھ اپنے دستے کے ہمراہ جنوبی دروازے لاہوری گیٹ سے شہر میں داخل ہوا۔ سدا کورا اپنے وفاداروں کے ہمراہ دہلی گیٹ سے شہر میں داخل ہوئی۔ موہر سنگھ اور صاحب سنگھ کے خاندان اور وفادار دیگر دروازوں سے شہر چھوڑ کر سرپٹ بھاگے۔ چیت سنگھ نے خود کو قلعہ لاہور میں بند کر لیا۔

شہر کی باگ دوڑ سنبھالتے ہی رنجیت سنگھ نے عام معافی کا اعلان کرتے ہوئے لوگوں کو یقین دلایا اب ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں کر سکے گا۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو بھی خبردار کیا کہ شہر میں لوٹ مار کرنے کی صورت میں انھیں موت کی سزا دی جائے گی۔

لاہور پر قبضہ کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ بادشاہی مسجد جا کر مسلمانوں کے ساتھ اظہارِ یکجہتی تھا۔ اس مسجد کو مغل بادشاہ اورنگزیب کے دور میں تعمیر کیا گیا تھا۔ تاہم بعد میں جس مسجد کے اس نے سب سے زیادہ دورے کیے وہ شہر کے وسط میں واقع مسجد وزیر خان تھی۔ رنجیت سنگھ نے قلعہ لاہور کی اونچی اونچی فصیلوں کے زیر سایہ اور شاہی مسجد کے بالکل قریب اپنا دربار لگانا شروع کر دیا۔ اپنی ساس کے مشورے پر اس نے چیت سنگھ کو اس امید پر کہ وہ فاقے کرنے کے بعد اطاعت پر مجبور ہو جائیگا اس کے حال پر چھوڑ دیا۔ چیت سنگھ کے نمائندے اگلے روز رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوئے اور رنجیت سنگھ کو لاہور قلعہ کی ملکیت کی پیش کش کی۔ جواب میں انھوں نے چیت سنگھ کی جان بخشی کا مطالبہ کیا۔ رنجیت سنگھ نے دریا دلی کا مظاہرہ کیا۔ آگے کی اس کی ساری زندگی ایسی ہی دریا دلی سے عبارت رہی اور جواب میں اسے بھی لوگوں سے بے انتہا پیار اور خلوص ملا۔ اس نے نہ صرف اپنے شکست خوردہ دشمن کو اپنے سینے سے لگایا بلکہ بقیہ ساری زندگی کے لیے اس کا وظیفہ بھی مقرر کیا اور اس طرح اس نے اپنے بدترین دشمن کو شکر گزار دوست میں بدل دیا۔

7 جولائی 1799 کو قلعہ لاہور کے بڑے بڑے دروازے 18 سالہ فاتح رنجیت سنگھ کے لیے کھول دیے گئے۔ قلعے میں داخل ہوتے وقت رنجیت سنگھ کو شاہی توپوں کی سلامی دی گئی۔ سوہن لال کے لفظوں میں ''اس کے ساتھ ہی تمام شہر میں فتح کے شادیانے بجنا شروع ہو گئے''[4]

لاہور کا شمار پنجاب کے قدیم ترین اور ظاہر ہے عظیم ترین شہروں میں ہوتا ہے۔ قدیم اساطیر کے مطابق لاہور کی بنیاد ہندوؤں کے اوتار / بھگوان رام کے بڑے بیٹے لاہو نے رکھی جیسا کہ قصور کی بنیاد رام ہی کے چھوٹے بیٹے قاصو نے رکھی۔ (لاہور دراصل ''لاہو پورہ'' کی بگڑی ہوئی شکل ہے) 1002 عیسوی تک لاہور پر راجپوتوں کا قبضہ رہا۔ محمود غزنوی نے اس کو فتح کرنے کے بعد اس کا نام محمود پورہ رکھ دیا لیکن پرانا نام گردش کرتا رہا۔ بعد ازاں اس شہر پر مسلمانوں کے مختلف خاندان قابض ہوتے رہے یہاں تک بابر نے ہندوستان پر قبضہ کر کے مغلیہ خاندان کے اقتدار کی بنیاد ڈالی۔ مغلوں نے اس شہر میں

باغات، محلات، مساجد اور قلعے تعمیر کرائے اگر چہ آگرہ اور دہلی مغلوں کے انتظامی دارالحکومتوں میں شمار ہوتے تھے، پنجاب کا سب سے بڑا شہر ہونے کے باعث لاہور کی نمایاں حیثیت تھی۔ یہ دارالحکومت دہلی اور شمال مغربی ہند کے اُن سرحدی علاقوں سے یکساں فاصلے پر تھا جہاں سے مسلمان حکمران اپنے لیے بہترین جنگجو بھرتی کرتے تھے۔ سکھوں کے نزدیک اپنی اہمیت کے اعتبار سے لاہور صرف امرتسر کے بعد آتا ہے۔ لاہور ان کے چوتھے گرو رام داس کی جائے پیدائش ہے، جنھوں نے امرتسر شہر کی بنیاد رکھی اور یہ ان کے پانچویں گرو ارجن کی جائے شہادت بھی ہے، جنھوں نے ان کی مقدس گرنتھ صاحب کو کتابی شکل میں اکٹھا کیا۔ ان واقعات کی نشانیوں اور مختلف گروؤں کی لاہور میں آمد کی یاد میں اس شہر میں گوردوارے موجود ہیں۔ پس لاہور کی فتح رنجیت سنگھ کے لیے بہت اہم بات تھی۔ اس شہر پر قبضے سے رنجیت سنگھ شمالی ہندوستان کے سب سے طاقتور سردار کے طور پر مشہور ہوگیا اور چونکہ لاہور ہمیشہ سے صوبے کا دارالحکومت سمجھا جاتا تھا اس شہر پر قبضے سے رنجیت سنگھ کی اہمیت دوسرے سرداروں سے زیادہ ہوگئی۔

اگر چہ زمان کابل پہنچ چکا تھا لیکن اس کے دماغ سے ہندوستان کو فتح کرنے کا فتور جانے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ اس نے رنجیت سنگھ سے کئی مرتبہ رابطہ کیا۔ وہ جانتا تھا رنجیت سنگھ ہی واحد شخص ہے جو اس کے اور تختِ دہلی کے راستے میں کھڑا ہے۔ اس نے رنجیت سنگھ کو گھوڑوں اور خلعتِ شاہانہ کے تحائف بھی بھجوائے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے سابق دشمن کی طرف سے بڑھایا ہوا دوستی کا ہاتھ قبول کرلیا۔ اس نے زمان کو جواباً جو تحفے بھجوائے ان میں اس توپ کے چند ٹکڑے بھی شامل تھے جو زمان پنجاب سے عجلت میں نکلتے ہوئے دریا میں گنوا بیٹھا تھا5۔ رنجیت سنگھ کی شہرت میں اضافہ ہونے لگا تو پنجاب کی مثلوں کے سکھ سرداروں کے رویے بھی تبدیل ہونے لگے پہلے وہ خفیہ طور پر اس سے حسد کرتے تھے اب کھلم کھلا نفرت کرنے لگے۔ لاہور پر اس کا قبضہ سکھ سرداروں کی عداوت میں اضافے کا باعث بنا۔ اس کے سابق بہی خواہوں نے بھنگیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ کرلیا جنھیں شرمناک انداز میں لاہور چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ نظام الدین خان، جس کا لاہور کی صوبیداری کا خواب چکنا چور ہو چکا تھا اس نے بھی اس اتحاد میں شامل ہونے کا فیصلہ کیا۔ رنجیت سنگھ کے مخالفین امرتسر میں اکٹھے ہوئے جہاں ابھی تک بھنگیوں کی ایک شاخ کی حکومت تھی اور سب نے لاہور سے رنجیت سنگھ کو نکال باہر کرنے پر اتفاق کیا۔ 1800 کے موسم بہار میں بھنگیوں کی متحدہ فوج نے جن میں نظام الدین خان کے دستے بھی شامل تھے لاہور کا رخ کیا رنجیت سنگھ نے لاہور سے مشرق کی سمت میں 10 میل کے فاصلے پر بھسین گاؤں کے قریب ان کا راستہ روکا۔

وقت اور حالات رنجیت سنگھ کے حق میں تھے۔ اس کے پیچھے شہر تھا جہاں سے اس کی فوج کو آسانی سے رسد مل رہی تھی جبکہ اس کی مخالف فوجیں ایک ڈھیلے ڈھالے اتحاد کی شکل میں اس کے سامنے تھیں ان کے پاس ایک ساتھ رہنے کی صرف ایک وجہ تھی رنجیت سنگھ کی عداوت۔ اس ڈھیلے ڈھالے اتحاد کی قیادت گلاب سنگھ بھنگی کر رہا تھا اُس کے نزدیک جنگی حکمتِ عملی اور فیصلہ سازی سے زیادہ اہم موسم بہار کے مزے لوٹنا، شراب پینا اور طوائفوں کے رقص سے لطف اندوز ہونا تھا ایسی ہی رقص

وسرور کی ایک محفل کے دوران وہ دماغ کی شریان پھٹنے کی وجہ سے جان سے ہاتھ دھو بیٹھا۔اس واقعے نے متحدہ فوج کا رہا سہا جذبہ بھی سرد کر دیا اور وہ خاموشی سے منتشر ہو گئی۔ رنجیت سنگھ بھی لاہور لوٹ گیا اس کی فوج دو ماہ تک بیکار بیٹھنے کے بعد واپس بیرکوں میں جا رہی تھی اور اس کے تمام اخراجات اسے برداشت کرنا پڑے تھے۔اس پریشانی کے عالم میں تقدیر ایک بار پھر اس پر مہربان ہوئی اور ایک ایسے وقت میں جب وہ شہر کے مہاجنوں سے قرض لینے کے بارے میں سوچ رہا تھا اس کے اہلکاروں کو شہر سے باہر ایک پرانے کھنڈر میں 20 ہزار اشرفیوں سے بھرا ایک صندوق ملا۔ لاہوریوں نے دشمنوں کو منتشر ہوتے اور خزانے کے منہ کھلتے دیکھے تو انھیں یقین ہو گیا کہ رنجیت سنگھ لاہور کا حکمران بلکہ غالباً تمام پنجاب کا حکمران بن کر آیا ہے۔

جس طرح سورج مکھی کے پھول سورج کے ساتھ ساتھ اپنا رخ بھی تبدیل کرتے رہتے ہیں، لوگوں کی بڑی تعداد نے بھی نوجوان سکر چکیہ کے دربار کا رُخ کرنا شروع کر دیا بڑے بڑے سرداروں کے لڑکے اس کی فوج میں شامل ہونے کے لیے آتے، حکیم اور دانشور رنجیت سنگھ کی خدمت کے لیے اس کے دربار میں حاضر ہوتے۔اسی طرح نقاش، محنت کش اور کاریگر دربار سے وابستہ ہونے میں فخر محسوس کرتے، رقاصاؤں کی بڑی تعداد بھی دربار کی سرپرستی اور ذاتی مفاد کے حصول کے لیے اس کی خدمت میں حاضر ہوتی۔

رنجیت سنگھ نے قلعہ لاہور کو اپنا مسکن بنالیا اور باقاعدگی سے ہشت پہلو مثمن بُرج میں عین اس جگہ دربار لگانا شروع کر دیا جس کے نیچے ٹھیک ایک برس پہلے وہ اپنے گھوڑے کی رکابوں میں پاؤں پھنسا کر کھڑا ہوا کرتا تھا اور زمان شاہ پر آوازیں کستا تھا۔ بٹالہ میں اپنی ساس سدا کور اور اپنے عمر رسیدہ ماموں ڈل سنگھ کی اہم امور میں رائے کو وہ ہمیشہ اہمیت دیتا تھا۔اس نے روزمرہ امور چلانے کے لیے مصر رام دیال اور دفاعی امور پر رہنمائی کے لیے فتح سنگھ اہلیا نوالہ کو اپنے دربار سے وابستہ کر لیا تاہم اس کے دربار میں سب سے اہم اضافہ بخاری خاندان کا تھا۔نوجوانی سے ہی رنجیت سنگھ ایک قسم کی مایوسی اور پژمردگی کی کیفیت میں مبتلا تھا اور اس کے علاج کے لیے اس نے بڑے بڑے حکیموں اور طبیبوں کی خدمات حاصل کی تھیں اپنی تصوراتی بیماریوں کے علاج کے لیے ان کے تجویز کردہ نسخوں پر عمل کرتا آ رہا تھا لاہور میں سب سے پہلے جن مقامی ڈاکٹروں نے اس کا علاج کرنا شروع کیا ان میں غلام محی الدین بھی تھا جسے آنکھ کی تکلیف کا علاج کرنے کے لیے بلایا گیا تھا ڈاکٹر اپنے ساتھ اپنا لڑکا عزیز الدین بھی لایا تھا جسے وہ طب یونانی کی تعلیم دلوا رہا تھا رنجیت سنگھ اس لڑکے کی مہذب گفتگو اور شریفانہ اطوار سے بہت متاثر ہوا۔اس طرح کی تہذیب وشائستگی اس کے دربار کے اجڈ سکھوں کے جنگلی اطوار کے بالکل برعکس تھی۔"حضور کے شجرِ قسمت پر نئے شگوفے پھوٹ رہے ہیں" اس نوجوان نے رنجیت سنگھ کی تعریف کرتے ہوئے کہا۔جب رنجیت سنگھ نے اس کو دربار میں نوکری کی پیش کش کی تو اس نے مزید نستعلیق انداز میں شکریہ ادا کرتے ہوئے نوکری قبول کر لی: "استقامت کے پیڑ پر وفاداری کی کونپلیں کھل اٹھیں گی جو آگے چل کر مکمل وابستگی کے پھلوں میں بدل جائیں گی۔سچائی کے موتی جب مکمل ایمانداری اور وفاداری کے کنگن میں پرو دیے جائیں ان کی قدر و قیمت میں اضافہ ہو جاتا ہے۔وہ تاج ہمیشہ خوش و خرم رہتا

ہے جس کے دور میں سچائی اور استقامت کے پھول کھلتے ہیں۔ سچائی اور ایمانداری پر مبنی لین دین کا نتیجہ ہمیشہ میٹھے پھل کی صورت نکلتا ہے چاہے اس کا چھلکا کتنا ہی سخت کیوں نہ ہو۔" عزیز الدین نے جلد ہی اپنے باپ کی جگہ لے لی جو شاہی دربار میں حکمت سے وابستہ تھے، تھوڑے ہی عرصہ کے بعد اسے رنجیت سنگھ کا مشیر خاص مقرر کر دیا گیا اور پھر جلد ہی اسے وزیر خارجہ مقرر کر دیا گیا۔ وہ رنجیت سنگھ کے دربار کا، جیسا کہ وہ خود کو غیر ضروری عاجزی کے ساتھ کہا کرتا تھا "ایک میٹھی آواز والا طوطا سمجھا جانے لگا۔"

عزیز الدین اپنے دو بھائی نور الدین اور امین الدین بھی رنجیت سنگھ کے دربار میں لے آیا۔ عزیز الدین صوفی منش شخص تھا لہٰذا اسے کسی مذہب سے کوئی بغض نہیں تھا۔ جب رنجیت سنگھ نے اس سے پوچھا کون سا مذہب بڑا ہے اسلام یا ہندو ازم تو اس نے ذہانت سے یہ جواب دیا "میری حیثیت ایک ایسے شخص کی ہے جو بہت بڑے دریا میں بہتا جارہا ہے میں دریا کے کناروں میں تمیز نہیں کرسکتا میری نظریں تو خشکی کی جانب لگی ہیں۔

عزیز الدین یا فقیر عزیز الدین جیسا کہ وہ خود کو کہلوانا پسند کرتا تھا ایک بلا کا ذہین سفارتکار تھا6۔ عام گرم مزاج پنجابیوں کے برعکس وہ ٹھنڈے دماغ کا انسان تھا۔ دربار میں اس کا عہدہ رنجیت سنگھ کے مشیر کا تھا مگر وہ اس ذمہ داری سے ایک فلسفیانہ بیگانگی برتتا تھا: ''مشورہ یا تجویز ایک پانسے کی طرح ہوتی ہے جبکہ تقدیر اس پھٹے کی طرح جس پر بساط بچھی ہوتی ہے۔ آپ کے ہاتھ میں سب کچھ ہوتے ہوئے بھی کچھ نہیں ہوتا۔''

لاہور پر قبضہ مضبوط کرنے کے باوجود رنجیت سنگھ کا پنجاب کی حکمرانی کا خواب تشنہ تعبیر تھا لاہور پر قبضے نے اس کے دوستوں کی نسبت زیادہ دشمنوں کی تعداد میں اضافہ کر دیا تھا۔ بھسین کے تجربے کے بعد وہ مخالفین کو اپنے خلاف اکٹھے ہونے اور ایک متحدہ فوج میدان میں اتارنے کی اجازت نہیں دے سکتا تھا سب سے پہلے وہ جموں کے راجا کے خلاف، جس نے افغانیوں کے ساتھ ساز باز کی ہوئی تھی حرکت میں آیا۔ رنجیت سنگھ اپنے لشکر کے ہمراہ برق رفتاری سے جموں کی طرف بڑھا اور شہر سے صرف چار میل دور پڑاؤ ڈال لیے۔ راجا نے رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کرتے ہوئے جرمانے کے طور پر ایک ہاتھی اور 20 ہزار روپے بھجوائے۔ اس مہم میں رنجیت سنگھ نے ویرووال، سرسوال اور نارووال کے شہر اپنی سلطنت میں شامل کیے۔ جموں کی پہاڑیوں سے واپس آکر رنجیت سنگھ نے گجرات کے صاحب سنگھ بھنگی کے خلاف لشکر کشی کا فیصلہ کیا۔ صاحب سنگھ نے اکال گڑھ کے راجا کے ساتھ مل کر گوجرانوالہ پر قبضہ کرنے کا منصوبہ بنایا تھا۔

سکھ سرداروں کی باہمی چپقلش بیرونی قوتوں کے لیے دعوت عام تھی۔ زمان شاہ نے متحارب گروہوں سے مذاکرات کے لیے اپنے ایلچی بھیجے۔ جنوب میں جارج تھامس نے ستلج کے کنارے تک پیش قدمی کی تیاری کر لی، فرانسیسی جنرل پاغاں نے جس کو ملاوی سرداروں نے مدد کی درخواست بھیجی تھی واضح کر دیا تھا کہ وہ پنجاب کے بڑے حصے سے کم پر راضی نہ ہوگا۔

ایک بار پھر پنجاب پر خطرہ منڈلانے لگا اور ایک بار پھر اس خطرے نے مرد بحران کو جنم دیا۔ یہ وہی صاحب سنگھ بیدی

تھا جس نے تین برس قبل افغان فوج کے مقابلے میں سکھوں کو یکجا کیا تھا۔

بیدی ستلج اور جموں کے درمیانی علاقوں میں بسنے والے سکھوں کو جارج تھامس کے خلاف یکجا کرنے کی کوششوں میں مصروف تھا کہ اسے رنجیت سنگھ اور صاحب سنگھ بھنگی کے درمیان کشمکش کی خبر ملی وہ فوراً گجرات کے شمال میں پہنچا اور بابا گرو نانک کا واسطہ دے کر فریقین سے ہتھیار رکھوا لیے۔ اس شخص کا اتنا احترام کیا جاتا تھا کہ سرداروں نے بغیر کسی چوں چرا کے اس کے حکم کو تسلیم کیا۔ سوہن لال نے اس واقعے کی کیا خوب منظر نگاری کی ہے: ''حضور اقبال بلند (رنجیت سنگھ) نے اپنی کمر سے تلوار کھول کر بابا صاحب کے قدموں میں رکھ دی۔ دیگر سرداروں نے بھی ایسا ہی کیا۔ ایک گھنٹے تک تلواریں زمین پر پڑی رہیں اور سردار کچھ کیے بغیر وہیں کھڑے رہے۔ پھر بابا صاحب نے حضور اقبال بلند کی تلوار واپس ان کی کمر پر باندھی اور یہ خوشخبری دی کہ تھوڑے ہی عرصے میں حضور اقبال بلند کے تمام مخالفین کا صفایا ہو جائے گا اور ان کی حکومت تمام ملک پر قائم ہو جائے گی''۔ رنجیت سنگھ کو بیدی نے گجرات چھوڑ کر جانے پر رضامند کر لیا۔ لیکن اس نے اکال گڑھ کے سردار کو نہ بخشا جس نے بھنگیوں کے ساتھ مل کر اس کے قلعے پر قبضہ کیا تھا اور اسے قتل کروا کے اس کی ریاست پر قبضہ کر لیا۔

یہاں سے فارغ ہو کر جب رنجیت سنگھ واپس لاہور پہنچا تو اس نے دیکھا کہ شاہ زمان کا ایلچی بے تابی سے اس کا منتظر تھا اس نے خبر دی کہ رنجیت سنگھ کے چند مخالف سرداروں نے افغانیوں سے گٹھ جوڑ کر لی ہے۔ یہ بات واضح تھی کہ ان کا صرف ایک مقصد تھا رنجیت سنگھ کی شکست۔ چاہے اس کے لیے اپنا ملک غیر ملکی قوتوں کے حوالے کیوں نہ کرنا پڑے۔ رنجیت سنگھ نے شاہ کے پیغامبر سے نیک تمناؤں کے پیغامات اور وہ تمام تحائف شکریے کے ساتھ وصول کیے جو شاہ زمان نے اس کو ارسال بھجوائے تھے اور جواب میں ان سے کہیں زیادہ قیمتی تحائف اور نیک تمنائیں زمان شاہ کے لیے بھجوائیں۔ اس طرح اس نے افغانیوں کا کسی اور سردار سے معاملات طے کرنا کا راستہ روک دیا۔ رنجیت سنگھ اگرچہ عمر میں کچا تھا تاہم اسے بخوبی علم تھا کہ مکر و فریب کے جواب میں مکر و فریب کیسے کیا جاتا ہے!

رنجیت سنگھ اور زمان شاہ کے درمیان اتحاد کی اڑی ہوئی خبر نے سرداروں کی نیندیں حرام کر دیں۔ انھوں نے رنجیت سنگھ سے چھٹکارا پانے کے لیے افغانیوں سے امیدیں باندھی ہوئی تھیں۔ اس (رنجیت۔ زمان اتحاد) سے انگریزوں کو بھی خاصی تشویش ہوئی اپریل 1800 میں گورنر جنرل نے رنجیت سنگھ اور شاہ زمان کے درمیان گٹھ جوڑ کا مقابلہ کرنے کے لیے جوابی اقدام کی منظوری دے ڈالی۔ اس نے ہدایات جاری کیں کہ ایک قابل اور تربیت یافتہ نمائندہ فوری طور پر رنجیت سنگھ کے دربار بھیجا جائے جو اُسے اس بات سے خبردار کر سکے کہ شاہ زمان کے ساتھ پینگیں بڑھا کر اور اس کی عیارانہ تجاویز کو قبول کر کے وہ اپنے اور اپنی قوم کے مفادات داؤ پر لگا دے گا۔ 7

اس کام کے لیے انگریزوں نے میر یوسف علی کا انتخاب کیا کہ وہ سکھوں پر واضح کر دے کہ انھیں شاہ زمان کے ساتھ کچھ لینا دینا نہیں۔ میر یوسف علی نے ستلج کے کنارے بسنے والے سکھوں کے ساتھ ملاقاتوں سے اپنے کام کا آغاز کیا۔ انھیں

منانے میں اسے کوئی دقت پیش نہیں آئی ماسوائے ایک سردار کے جو یہ پوچھنا چاہ رہا تھا آیا انگریز ان کے ساتھ دفاعی اتحاد میں شریک ہوں گے یا سکھوں کے شانہ بشانہ لڑیں گے یوسف نے جواباً انھیں صاف لفظوں میں بتا دیا کہ اس موضوع پر اسے کوئی ہدایت نہیں دی گئی اور اس کا کام تو صرف انھیں تجویز دینا اور نصیحت کرنا تھا۔

ملاویوں کے سردار نے عزت واحترام کے پردے میں میر یوسف علی کو طنز کا نشانہ بنایا اس کی ایک وجہ شاید یہ تھی کہ میر یوسف علی بغیر کسی تحفے یا حفاظتی دستے کے وہاں پہنچا تھا۔۔۔۔ عام طور پر یہ دونوں چیزیں ایلچیوں کے ہمراہ ہوتی ہیں مگر اس کے پاس اچھے اچھے مشورہ دینے کے علاوہ کچھ بھی نہیں تھا۔ اور اس طرح کے مشورے کا یہی مطلب اخذ کیا جا سکتا تھا کہ اگر سکھوں کے ہاتھوں افغانیوں کو شکست ہوتی ہے اور وہ پنجاب چھوڑنے پر مجبور ہو جاتے ہیں تو انگریزوں کے پاس انھیں دینے کے لیے داد وتحسین کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

ملاوی سرداروں کا ردِعمل حاصل کرنے کے بعد میر یوسف علی امرتسر جا کر سدا کور سے ملا۔ سدا کور نے اپنے داماد رنجیت سنگھ کو بھی اس ملاقات میں شامل ہونے کے لیے بلوالیا تھا۔ رنجیت سنگھ اپنی جان کو خطرے میں ڈال کر امرتسر آیا کیونکہ شہر پر بھنگیوں کا قبضہ تھا۔ وہ صرف اس لیے اس ملاقات میں شریک ہوا کہ اس موضوع پر ہندوستان کی دیگر طاقتوں کا موقف اُن (انگریزوں) تک پہنچا سکے۔

یہ ملاقات سدا کور کے مکان پر ہوئی اور اس میں صرف رنجیت سنگھ اور اس کے دو مشیر فتح سنگھ اہلیا نوالہ اور اور مصر رام دیال شریک تھے۔ میر یوسف علی نے افغانیوں کی بے وفائی، ابدالیوں کی وعدہ شکنی اور درانیوں کے مظالم پر لمبی چوڑی تقریر کی۔ اس نے ابدالیوں کے ہاتھوں سکھوں کے قتلِ عام کا حوالہ دیا کہ کس طرح افغانیوں نے سکھوں کے گوردوارے اور ہندوؤں کے مندر گرائے تھے اور ان تمام مظالم پر بات کی جو دُرانی قبیلے کا خاصہ تھے۔ رنجیت سنگھ خاموشی سے اس کی تقریر سنتا رہا اور یوسف علی کے خاموش ہونے کے بعد بھی وہ چند منٹ تک سوچوں میں گم رہا۔ اس ملاقات کے بعد یوسف علی نے اپنی رپورٹ میں رنجیت سنگھ کے حوالے سے یہ لکھا: ''رنجیت سنگھ نے اس بات سے اتفاق کیا کہ وہ لوگ (افغانی) قابلِ بھروسا نہیں۔ وہ اپنے وعدوں پر پورا نہیں اترتے؛ اور وہ (رنجیت سنگھ) بھی درانیوں پر بھروسا کرنے کو تیار نہیں تھا''۔

تاہم فتح سنگھ نے ایک مختلف بات کی۔ زمان نے انھیں خلعت فاخرہ پیش کی تھی، اور جواب میں اُن کی طرف سے اس کے بڑھے ہوئے دوستی کے ہاتھ کو جھٹکنا بد تہذیبی ہوگا۔ پہلی ملاقات بے نتیجہ ثابت ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے یوسف علی کو لاہور آنے کی دعوت دی۔

لاہور آ کر یوسف علی نے اپنی حکومت کے خدشات کا ذکر کیا کہ رنجیت سنگھ افغانیوں کو دوست بنانے جا رہا ہے ثبوت میں اس نے رنجیت سنگھ کی طرف سے زمان شاہ کو اس کی توپ واپس بھجوانے کے واقعے کا ذکر کیا جو وہ پنجاب سے عجلت میں فرار ہوتے ہوئے دریا میں گرا بیٹھا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اس کی باتیں سن کر مناسب سمجھا کہ وہ دہلی میں بیٹھے کولنز کو خط لکھے اور

اس کے ذریعے سرکارِ برطانیہ کو ان حالات وواقعات سے آگاہ کرے جو دوسری افغان دراندازی کا موجب بنے تھے۔ اس خط میں رنجیت سنگھ نے افغانیوں کی خلاف اپنی جدوجہد کا بھی ذکر کیا اور اس واقعے کا خاص طور پر ذکر کیا جب وہ قلعہ لاہور کی دیوار پر چڑھ کر زمان کو تلوار بازی کا چیلنج دیا کرتا تھا۔ اس نے خط میں وضاحت سے بیان کیا کہ کس طرح افغانی فوج لاہور چھوڑنے پر مجبور ہوگئی اور کیسے زمان شاہ عجلت میں لاہور سے نکلتے ہوئے اپنی توپ دریائے جہلم میں گرا بیٹھا اور کس طرح آخر میں رنجیت سنگھ نے جو سارا راستہ شاہ زمان کا تعاقب کرتا رہا دریا سے وہ توپ نکلوائی اور شاہ زمان کی طرف سے دوستی کی درخواست پر اسے واپس کی۔ 8

ایک مرتبہ پھر سال 1800 کی سردیاں شمال مغرب سے کیے جانے والے ممکنہ حملے کے پیشِ نظر تناؤ کی کیفیت میں گزر گئیں۔ موسم بہار میں کابل سے خانہ جنگی کی خبریں آنا شروع ہوگئیں اور یہ اطلاعات موصول ہوئیں کہ ایرانیوں نے افغانستان کی طرف پیش قدمی شروع کر دی ہے۔ یہ سن کر پنجابیوں نے سکھ کا سانس لیا اور رنجیت سنگھ نے بھی اپنی سوچوں کا رُخ خود کو اپنے زیرِنگیں علاقوں کا قانونی حکمران کہلوانے کی طرف موڑ لیا۔

اگرچہ رنجیت سنگھ کو پنجاب کا حکمران کہا جانے لگا تھا پھر بھی کچھ عرصہ تک وہ باقاعدہ مہاراجا کا لقب اختیار کرنے سے ہچکچاتا رہا کیونکہ فی الحال وہ کوئی ایسا کام نہیں کرنا چاہتا تھا جس سے اس کے مخالفین کو اس کے خلاف سازشیں کرنے کا جواز ملے۔ ان کی مجموعی قوت کو آسانی سے نظر انداز نہیں کیا جا سکتا تھا۔ دوسری جانب اسے خود کو پنجاب کا مہاراجا کہلوانے میں پنہاں قانونی مفاد کا بھی بخوبی اندازہ تھا۔ اس طرح پنجاب کے عوام کو جنھیں صدیوں سے بادشاہ یا حکومت نصیب نہیں ہوئی تھی اپنا حکمران مل جائے گا اور پنجاب کے مسلمانوں اور ہندوؤں کو مشترکہ پنجابی زبان، سیاسی اور معاشی مفادات، باہمی رہن سہن کے طریقوں اور مشترکہ ثقافت کی اہمیت کا اندازہ بھی ہو جائے گا اور وہ سکھوں کی مکمل حمایت کرنے پر مجبور ہو جائیں گے جو آزاد پنجاب کے لیے لڑ رہے تھے۔ اسی طرح آس پاس کی ریاستوں کو بھی اندازہ ہو جائے گا کہ پنجابی ایک متحدہ قوم ہیں اور رنجیت سنگھ ان کا مہاراجا ہے۔ تاہم جس بات نے رنجیت سنگھ کو دوسرے سکھ سرداروں کی دشمنی مول لینے اور خود کو مہاراجا کہلوانے پر مجبور کیا وہ اس کے ہاں لڑکے کی پیدائش تھا۔ یہ بیٹا اس کی دوسری اور پسندیدہ بیوی نکئیاں، رانی راج کور سے تھا۔ اپنے نومولود بیٹے کھڑک سنگھ کو اپنے تاج وتخت کا وارث بنانے کی شدید خواہش کے زیرِ اثر اس نے یہ فیصلہ کیا۔ اگرچہ سدا کور کو وقتی طور پر اپنی بیٹی سے رنجیت سنگھ کا پہلا بیٹا نہ ہونے کا افسوس تھا تاہم ایک دوراندیش عورت ہونے کے ناتے اس نے خود کو اس سوچ سے مطمئن کر لیا کہ اس کی بیٹی رنجیت سنگھ کے شاہی حرم میں دوسرے مقام پر ہوگی اور رنجیت سنگھ کو مشورہ دیا کہ مہاراجا کا لقب اختیار کرنے میں دیر نہ کرے۔ اسے امید تھی کہ اگر اس کی بیٹی کے ہاں لڑکے پیدا ہوئے تو وہ کم از کم اپنی کنہیا ریاست پر دعویٰ کر سکیں گے اور ہوسکتا ہے راجدھانی کا بڑا حصہ بھی انھیں اس کے علاوہ مل جائے۔

رنجیت سنگھ باقاعدہ تاجپوشی پر راضی ہوگیا۔ اس کے زیرِنگیں تمام علاقوں کی مساجد، مندر اور گوردواروں میں دعائیں

مانگی گئیں۔ بیساکھ کی پہلی تاریخ (12 اپریل 1801) کو جو کہ ہندو کیلنڈر کے حساب سے سال کا آغاز بنتا ہے صاحب سنگھ بیدی نے اس کی پیشانی پر زعفران لگا کر اس کے نام کا بطور پنجاب کے مہاراجا کا اعلان کیا۔ قلعہ لاہور سے نئے شہنشاہ کو شاہی توپوں کی سلامی دی گئی۔ دوپہر میں نوجوان مہاراجا ہاتھی پر سوار ہو کر خوشی سے بے قابو عوام کے درمیان سونے اور چاندی کے بنے سکے اچھالتا گزرا۔ شام کو سارے شہر میں چراغاں کیا گیا اور آتشبازی کا زبردست مظاہرہ ہوا۔

دربار کی شان وشوکت اور درباریوں کے خوشامدانہ رویے کے باوجود رنجیت سنگھ نے اپنی توجہ حقائق سے نہ ہٹنے دی۔ اس کی سیاسی سمجھ بوجھ کا مظاہرہ اس امر سے ہوتا ہے کہ وہ بیک وقت لاہور کا مہاراجا بھی تھا اور مقامی لوگوں کا سردار بھی۔ لاہور کا تاجدار ہونے کے باوجود اس نے اپنی سادہ پگڑی کے اوپر بادشاہت کا تاج یا نشان پہننے سے انکار کر دیا (مجھے دوسروں سے ممتاز کرنے کے لیے میری تلوار ہی کافی ہے اور میرے لیے ظاہری شان وشوکت کوئی معنی نہیں رکھتے)۔ اس نے شاہی تخت پر بیٹھنے سے بھی انکار کر دیا اور اور پہلے کی طرح اپنی چھوٹی سی نہانے کے ٹب جیسی کرسی پر اکڑوں بیٹھ کر دربار لگاتا رہا۔ اکثر مہمانوں کی پذیرائی مشرقی انداز میں قالین پر تکیے لگا کر کی جاتی۔ اس نے نئے سکوں کی ڈھلائی کا حکم دیا۔ اُن سکوں پر اس کا نام یا نقش کندہ نہیں تھا بلکہ گرونانک کی تصویر چھپی ہوئی تھی اور اس کرنسی کو ''نانک شاہی'' (شاہ نانک کے سکے) کہا جاتا تھا۔ اسی طرح حکومت کی مہر پر بھی رنجیت سنگھ کا کوئی حوالہ تھا نہ نام۔ حکومت کو بھی رنجیت سنگھ کی سرکار نہیں بلکہ ''سرکار خالصہ جی کی عوامی حکومت'' کہا جاتا تھا اسی طرح رنجیت سنگھ نے اپنے دربار کو بھی ''خالصہ جی کا دربار'' کا نام دیا ہوا تھے اور خوشامدیوں کی بڑی تعداد کے اصرار کے باوجود اس نے اپنے لیے جو سادہ سا لقب چنا وہ کوئی اور نہیں بلکہ ''سنگھ صاحب'' تھا۔ یہ اقدامات مشرقی درباروں کے بالکل برعکس تھے جہاں پروٹوکول کا پورا خیال رکھا جاتا تھا تا کہ بادشاہ کو عوام سے زیادہ سے زیادہ دور رکھا جائے جبکہ رنجیت سنگھ کسی حالت میں بھی لوگوں سے رابطہ ختم کرنے کا روادار نہ تھا۔

مہاراجا پنجاب کا لقب اختیار کرنے سے رنجیت سنگھ نہ صرف سکھوں (حکومت تو پہلے ہی سرکار خالصہ جی کی تھی) بلکہ ان تمام لوگوں کا جو پنجاب کی اس وقت کی جیسی تیسی سرحدوں میں بستے تھے کے حقوق کا محافظ اور نگہبان بن گیا تھا۔ اس لقب اختیار کرنے سے رنجیت سنگھ کو یہ حق بھی حاصل ہو گیا تھا کہ وہ ان تمام چھوٹی بڑی ریاستوں سے جو کسی دور میں پنجاب کو ٹیکس ادا کرتی رہی تھیں، جیسا کہ جموں، کشمیر، رائے پور کی پہاڑی ریاست، ملتان، بہاولپور، ڈیرہ اسمٰعیل خان، ڈیرہ غازی خان، منکیرہ و دیگر، سے تقاضا کر سکے کہ وہ دوبارہ سے ٹیکس ادا کرنا شروع کریں اور لاہور دربار سے اپنی وفاداری کا اعلان کریں۔

رنجیت سنگھ نے یہ تمام شاہی القاب مغلوں یا افغانیوں سے ماخوذ نہیں کیے تھے یہ تو اسے ایک صوفی ہستی، پنتھ خالصہ جی، کی طرف سے ملے تھے۔ اس نے کبھی دوسروں پر برتری کا دعویٰ نہیں کیا۔

وہ تو اس مقام پر اس صدیوں پرانی روایت کے زیرِ اثر آیا تھا اور جس کا سبق وہ اتنے ماہ وسال سے پڑھتا آ رہا تھا کہ سکھ

حکمرانی کے لیے پیدا ہوئے ہیں (راج کرے گا خالصہ)۔ اور شاید اسے گروؤں نے اپنے پراسرار منصوبے پر عمل درآمد کے لیے بطور ایک آلے کے چن لیا تھا۔ وہ اس یقین دہانی کو لے کر آگے بڑھا اور لوگوں کی زبردست توانائیوں کو اپنے تابع کیا اور ایک صاف ضمیر کے ساتھ دوسرے علاقوں کو فتح کرنے اور اپنے دربار سے منسلک کرنے کی مہم پر اٹھ کھڑا ہوا۔

رسمِ تاجپوشی کے فوراً بعد رنجیت سنگھ نے لاہور کی انتظامیہ کو نئے خطوط پر استوار کیا۔ اس نے شہر کی دیواروں اور دروازوں کو جو ماضی کے حملوں اور محاصروں سے خستہ ہو چکے تھے مضبوط کروایا اور تمام اہم مقامات پر ناکے لگوائے تا کہ شہر میں جرم کی وارداتیں جو بھنگیوں کے دور میں بڑھ گئی تھیں کم سے کم ہوسکیں۔ شہر کو مختلف وارڈوں میں تقسیم کیا گیا ہر وارڈ کے سربراہ کو چوہدری کہا جاتا جو اپنے مخصوص علاقے میں امن امان کی صورتحال کا ذمہ دار ہوتا۔ نقصِ امن کی صورت میں اسے یہ اختیار حاصل تھا کہ وہ پولیس کو طلب کر سکے 9۔ رنجیت سنگھ نے شہر میں انصاف کے نظام میں بھی اصلاحات متعارف کرائیں۔ چونکہ شہر کی اکثریت مسلمانوں پر مشتمل تھی جن کی خواہش تھی کہ ان کے معاملات شریعت کے مطابق چلائے جائیں اس نے مسلمانوں کے لیے الگ سے عدالتیں قائم کیں۔ نظام دین کو مسلم عدالتوں کا چیف جسٹس جبکہ محمد شاہ پوری اور سید اللہ چشتی کو مفتی بنا دیا گیا۔ جو مسلمان اپنی ذات برادری اور ضلع کے روائتی نظام کے ذریعے انصاف کے حصول کا مطالبہ کرتے ان کے لیے دربار علیحدہ سے جج صاحبان مقرر کرتا۔ تمام شہر میں ڈسپنسریوں کا جال بچھا دیا گیا جہاں عوام کو یونانی ادویات بغیر کچھ خرچ کیے مفت میں دستیاب تھیں۔ فقیر عزیز الدین کا چھوٹا بھائی حکیم نورالدین رنجیت سنگھ کے دربار کا چیف میڈیکل افسر مقرر ہوا۔

رنجیت سنگھ نے مغلوں کے دور سے رائج پنجاب کے زرعی یا مالیاتی نظام کو نہ چھیڑا۔ ہر گاؤں کا ایک افسر مال (مقدم) تھا اور چھوٹے دیہاتوں پر مشتمل ایک سرکل۔ مالیاتی ریکارڈ کو مرتب کرنے والا قانون گو اس کے علاوہ تھا یہ افسران اپنے اپنے علاقوں کی زمین کے مالک بھی تھے اور دربار کی خدمات کے صلے میں ان کا اپنا آبیانہ کم کر دیا جاتا۔

آبیانہ کاشت کار سے براہِ راست لیا جاتا۔ تاہم اس بات کا خیال رکھا جاتا کہیں باقاعدہ آبیانہ جیسے گندم، پیسے وغیرہ یا بے قاعدہ آبیانہ (مثلاً گھاس، لکڑی، انڈے، پھل، مرغی) جسے افسر مال کے نمائندے ملبے کا نام دیتے یا وفاق کی طرف سے عائد ٹیکس جو اکثر تحائف کی شکل میں ہوتا اور کسی خاص تہوار یا میلے کے موقع پر عائد کیا جاتا کاشت کار کی کھڑی فصل کے تخمینے کی آدھی قیمت سے زیادہ نہ ہونے پائے اور اگر ٹیکس کی ادائیگی رقم کی صورت میں کی جاتی تو کھڑی فصل کی قیمت لگوا کر اس کے مطابق آدھی یا اس سے کم وصول کر لی جاتی۔ ٹیکس کی اس شرح کو بھتا یا کسی قسم کا زبردستی کا لگان نہ سمجھا جاتا اور اس کو ادا کر کے بھی مقامی کسان آبادی آرام وسکون سے زندگی بسر کر رہی تھی۔

جس طرح کاشت کار کے لیے زمین کی ملکیت کا حق ضروری تھا اسی طرح کسانوں اور مقامی آبادی کے لیے کنویں اہم تھے۔ کنوؤں کی ملکیت کا سب سے اہم ثبوت کنویں کے اوپر مالک کے نام کا لکھا ہونا تھا (بعض اوقات یہ کنویں کی اندرونی دیواروں پر لکھا ہوتا تاکہ کوئی اس میں ردوبدل نہ کر دے)۔ کنویں کی کھدائی کا حق صرف اور صرف اس زمین پر کاشت کاری

کرنے والے کو تھا۔ زمین کا مالک جو خود زمین کاشت نہ کرتا یا اسے مزارعوں پر چھوڑ دیتا صرف نام کی حد تک اس کنویں کا مالک کہلوا کر مطمئن ہو جاتا۔ اسی طرح ایک جاگیردار کسی زمین سے وصول کیے جانے والے ٹیکس کی بنا پر اس کا مالک نہیں کہلایا جا سکتا تھا10۔ یہ نظام سینکڑوں سالوں سے چلتا آ رہا تھا اور رنجیت سنگھ کو اسے تبدیل کرنے کی کوئی خاص وجہ نظر نہیں آئی۔ رنجیت سنگھ کے چالیس سالہ دورِ حکمرانی کے بعد اس کی ریاست کی آمدن کچھ یوں تھی:

لاہور صوبے (ملتان، کشمیر اور پشاور سمیت) سے حاصل ہونے والا ٹیکس: ایک کروڑ 75 لاکھ، 57 ہزار 741 روپے

نذرانے: 6 لاکھ 3 ہزار 657 روپے

کسٹمز اور ایکسائز ڈیوٹی: 15 لاکھ 31 ہزار 634 روپے

جاگیر سے ہونے والی آمدنی: 91 لاکھ 96 ہزار روپے

کل آمدنی: دو کروڑ 88 لاکھ 89 ہزار 32 روپے

آج تین کروڑ روپے کی اہمیت بہت کم محسوس ہوتی ہے۔ لیکن یہ بات ذہن نشین رکھنی چاہیے کہ اس وقت گندم کی قیمت چودہ آنے من تھی۔ 1961 میں یہ اٹھارہ اور بیس روپے من کے درمیان کم زیادہ ہوتی رہی جو کہ رنجیت سنگھ کے وقت سے بیس گنا زیادہ قیمت تھی۔

تھوڑے ہی عرصے میں رنجیت سنگھ لاہور اور آس پاس کے اضلاع کے لوگوں کو یقین دلانے میں کامیاب ہو گیا کہ اس کا مقصد سکھ ریاست نہیں بلکہ پنجابی ریاست کا قیام ہے ایک ایسی ریاست جس میں مسلم، ہندو اور سکھ سب قانون کی نظر میں برابر ہوں اور ایک جیسے حقوق اور مراعات رکھتے ہوں۔ اس نے باصلاحیت ہندوؤں اور مسلمانوں کو اپنے دربار میں پُرکشش نوکریاں دیں۔ وہ ان کے مذہبی تہواروں میں جوش و خروش سے حصہ لیتا۔ دُسہرے کے موقع پر وہ ہتھیاروں کی پوجا کی رسم ادا کرتا جیسا کہ پچھلے وقتوں میں راجپوت جنگجو کیا کرتے اور رام اور راون کی جنگ کی یاد میں اپنی فوج کے اندر فوجی تمثیلیں کراتا۔ دیوالی کے موقع پر محل کے در و دیوار سمیت تمام سرکاری اور غیر سرکاری عمارتوں پر چراغاں کیا جاتا۔ ہولی کے موقع پر وہ محل سے باہر آ کر لوگوں میں گھل مل جاتا اور جس طریقے سے ہولی مناتا وہ ہرگز ہرگز کسی مہاراجا کے شایانِ شان نہیں تھا۔ بسنت کے موقع پر وہ مسلمان بزرگ مادھو لال حسین کے مزار پر حاضری دیتا11۔ اماوس اور بیساکھ کے موقع پر وہ اپنے ہم مذہبوں کے ہمراہ امرتسر یا تاراں تاراں جا کر پاکیزہ پانی میں غوطے لگاتا۔

لاہور کے معاملات قابو میں لا کر رنجیت سنگھ نے اپنی توجہ قصور کی پٹھان کالونی کی طرف مبذول کی۔ اس نے اپنے ایک افسر فتح سنگھ کھلیانوالہ کو حکم دیا کہ نظام الدین کے خلاف کارروائی کرے۔ پٹھانوں نے قصور کی جانب بڑھتے ہوئے لاہوری دستوں کا آدھے رستے پر ہی استقبال کیا۔ معمولی جھڑپ کے بعد وہ (پٹھان) واپس اپنے شہر کی چار دیواری کے پیچھے چلے گئے۔ سوہن لال کے الفاظ میں: ''خالصہ فوج کی عظمت کے چکا چوند کے سامنے نظام الدین ایک پروانے کی طرح بھسم

ہو کر رہ گیا اور دو بدو لڑائی میں ناکام ہو کر اپنے شہر کی بڑی بڑی دیواروں کے پیچھے چھپ گیا'' تاہم یہ محاصرہ زیادہ دیر نہیں چلا 12 اور لاہوری دستوں نے شہر کے دروازوں میں سے ایک کو دھماکے سے اڑا دیا اور زبردست طریقے سے حملہ آور ہوئے۔ پٹھانوں نے لاہوری فوج کے کمانڈروں کے سامنے ہتھیار ڈال دیئے اور ایک بڑی رقم بطور نذرانہ پیش کی۔ انھوں نے رنجیت سنگھ کو بھی اپنا مہاراجا تسلیم کر لیا۔ قصور کے بعد کانگڑہ کے سنسر چند کی باری تھی۔ راجپوت سردار خطرے کو بھانپتے ہوئے پہلے ہی پہاڑیوں سے اتر کر سدا کور کی جاگیر کے بیشتر گاؤں پر قبضہ کر چکا تھا۔ جب رنجیت سنگھ بٹالہ کے مقام پر اپنے دستوں کے ہمراہ ظاہر ہوا تو سنسر چند اس کا مقابلہ نہ کر سکا اور میدانی علاقوں سے اپنے دستے واپس بلوا لیے۔ رنجیت سنگھ نے ان دیہاتوں کو جنھیں سنسر چند اپنی جاگیر کا حصہ بنا چکا تھا قبضہ کرتے ہوئے انھیں واپس سدا کور کے علاقوں میں شامل کیا اس کے علاوہ دو خوشحال قصبوں نور پور اور نوشہرہ پر قبضہ کر کے انھیں سدا کور کو بطور تحفہ پیش کیے۔ اس نے سدا کور کو بجن پور گاؤں جس پر وہ قبضہ کر چکا تھا کے آس پاس کے علاقے بھی تحفہ کیے۔

واپسی کے سفر پر رنجیت سنگھ تاراں تاراں رک کر گوردوارے کے مقدس پانیوں میں اشنان کرنا نہ بھولا۔ فتح سنگھ اہلیا نوالہ اس سے ملنے وہیں آیا اور ہزاروں لوگوں کے سامنے دونوں سرداروں نے ایک دوسرے سے پگڑیوں کا تبادلہ کیا اور دھرم بھائی کہلائے۔ انھوں نے ایک معاہدے پر دستخط بھی کیے کہ آج کے بعد دونوں سرداروں کے دوست اور دشمن مشترک ہوں گے اور یہ کہ دونوں سردار ایک دوسرے کے ہاں زیادہ سے زیادہ چکر لگائیں گے اور یہ کہ رنجیت سنگھ دونوں سرداروں کی مشترکہ مہمات کے نتیجے میں سکھوں کے زیرِ نگیں آنے والے علاقوں میں سے کم از کم ایک ضلع فتح سنگھ اہلیا نوالہ کو دے گا۔

فتح سنگھ اس معاہدے کے چند روز بعد پہلی باقاعدہ اور سرکاری ملاقات کے لیے رنجیت سنگھ سے ملنے اس کے دربار پہنچا۔ دربار پہنچنے پر اس کا شایانِ شان استقبال کیا گیا معززینِ دربار نے اُٹھ کر اس کا یوں ستقبال کیا گویا وہ عام سکھ سردار نہ ہو بلکہ کسی شاہی خاندان کا چشم و چراغ ہو۔ دربار پہنچنے پر فتح سنگھ کو توپوں کی سلامی بھی دی گئی۔ مہمان نوازی کی رسومات سے فارغ ہو کر دونوں سردار صوبے کے مغربی علاقوں کی طرف گئے اور پنڈی بھٹیاں کے مسلمان جاگیرداروں کے خدشات دور کرنے کے بعد انھیں نئی پنجابی ریاست سے الحاق کرنے کو کہا۔ انھوں نے رنجیت سنگھ کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا اور نذرانے کی رقم ایسی شکل میں پیش کی جسے رنجیت سنگھ بہت پسند کرتا تھا۔ انھوں نے رنجیت سنگھ کی خدمت میں اپنے پالے ہوئے بہترین نسل کے چار سو گھوڑوں کا تحفہ پیش کیا۔

اتحادیوں نے دریائے جہلم عبور کرنے کے بعد پوٹھوہار۔ دھانی علاقے، راولپنڈی اور کیمبل پور (موجودہ اٹک) کو پنجاب میں شامل کیا۔ یہ دونوں علاقے فتح سنگھ کی عملداری میں دے دیئے گئے۔ رنجیت سنگھ کا اگلا نشانہ چنیوٹ کا جسا سنگھ ڈلو تھا۔ یہ بھنگیوں کا اتحادی رہ چکا تھا اور سوہن لال کے الفاظ میں ''اپنے سر کو غرور سے آسمان جتنا بلند کیا ہوا تھا اور اطاعت کے راستے سے بھٹک گیا تھا'' 13۔ ڈلو نے دو ماہ تک محاصرہ کرنے والوں کو دور رکھا اور صرف اس وقت ہتھیار ڈالے جب اس

کے پاس کھانے پینے کو کچھ نہ بچا اور وہ سوکھ کر کانٹا ہو گیا رنجیت سنگھ نے ڈولو کی ہمت اور سخت جانی کی داد دیتے ہوئے اسے اپنے دربار میں خدمت پر مامور کر لیا۔ جب رنجیت سنگھ اور اہلیا نوالہ شمال میں مہمات سر کر رہے تھے نظام الدین نے ان کی عدم موجودگی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے لاہور کے کچھ قریبی دیہاتوں پر حملہ کیا اور خوب لوٹ مار کی۔ یہ خبر ملنے پر رنجیت سنگھ فوراً واپس پلٹا اور سیدھا قصور کا رخ کیا۔ نظام الدین نے اپنی فوجوں کے ہمراہ شہر کے اندر پناہ لی جہاں اس نے طویل عرصے تک محاصرے میں رہنے کی تیاری کی ہوئی تھی۔ لاہور سے بھاری توپیں منگوانا پڑیں تا کہ قلعے کی دیواروں پر گولے برسائے جاسکیں۔ یہ دیکھ کر نظام الدین نے ہتھیار ڈال دیئے۔ ایک بار پھر اسے امان دی گئی اور رنجیت سنگھ نے اسے اپنی جاگیر رکھنے کی اجازت بھی دے دی۔

رنجیت سنگھ اپنے ہندو یا سکھ دشمنوں کی نسبت مسلمان مخالفین کے خلاف کوئی اقدام اٹھانے میں خاصا سست تھا۔ ملتان کے نواب اور اس کے خاندان سے رنجیت سنگھ کا رویہ پنجابی مسلمانوں کے ساتھ اس کی نرمی کی ایک مثال ہے۔ افغانیوں کی طرف سے ہندوستان پر حملوں کے بعد ملتان اپنے انتظامی امور میں لاہور کے مقابلے میں کابل سے رہنمائی لیتا چلا آ رہا تھا۔ اگرچہ بھنگی سرداروں نے ایک سے زیادہ مرتبہ اس شہر پر قبضہ کیا مگر اُن کی طرف سے ملتان میں بسنے والے لوگوں کی فلاح و بہبود پر عدم توجہی نے ملتانیوں کے دل میں سکھوں کے لیے اچھی خاصی نفرت بھر دی تھی اور وہ پنجابی قومیت کے نظریے سے جو کہ باقی پنجاب میں تیزی سے جڑ پکڑ رہا تھا سرد مہری برتنے لگے۔ ملتان کے مقامی مسلمان سرداروں کے حوالے سے یہ بات صادق آتی تھی۔ ان کے لیے سکھوں کے مقابلے میں افغانیوں کے ساتھ اتحاد قائم رکھنا نسبتاً آسان تھا اور شاید اسی لیے افغانیوں نے کامیابی کے ساتھ ملتان شہر کو بھنگیوں سے آزاد کروالیا۔

دوسری طرف رنجیت سنگھ نے ملتان کو واپس لینے کا تہیہ کیا ہوا تھا اور 1803 کے اوائل ہی میں اس نے اس شہر کو واپس اپنے ملک میں شامل کرنے کے ارادے کا اعلان کیا۔ اس کے دربار کے تقریباً ہر سردار نے اسے اس مہم سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ ان کے نزدیک نہ تو ان کے پاس ایسا اسلحہ موجود تھا جس کی مدد سے وہ ملتان کے نواب کے مضبوط قلعے میں شگاف کر سکیں اور نہ ہی رنجیت سنگھ کی فوج ان خونخوار قبائلیوں کا مقابلہ کر سکے گی جنھیں ملتان کا نواب ان کے مقابلے میں اتارے گا۔ تاہم ان کی کوئی بھی دلیل رنجیت سنگھ سے اس کا فیصلہ نہ بدلوا سکی اور وہ اپنی افواج کو لے کر لاہور سے ملتان کی طرف جانے والے راستے پر نکل پڑا۔ نواب مظفر خان نے جیسا کہ توقع کی جا رہی تھی آس پاس کے دیہاتوں میں بسنے والے کسانوں اور محنت کشوں میں جذبہء مسلمانی بیدار کیا اور وہ نواب کی مدد کے لیے گھروں سے نکل کھڑے ہوئے۔ تاہم وہ لاہور کی طاقتور فوج کا مقابلہ نہ کر سکے جو کہ با آسانی ملتان کے نواحی علاقوں میں گھس چکی تھی اور شہر کے وسط میں موجود مٹی اور گارے سے بنے قلعہ پر گولہ باری میں مصروف تھی۔ مظفر خان نے مناسب یہی سمجھا کہ رنجیت سنگھ کی اطاعت قبول کر لے۔ اس نے نذرانے کے طور پر بڑی رقم ادا کی اور وعدہ کیا کہ آئندہ اپنے حصے کا ٹیکس کابل کی بجائے لاہور کی سرکار کو ادا کرے گا۔ رنجیت سنگھ فاتحانہ انداز

میں لاہور لوٹا۔ جشنِ فتح میں رنجیت سنگھ کے تین سالہ بیٹے اور ولی عہد کھڑک سنگھ کی کنہیا مثل کے جیمال سنگھ کی بیٹی چاند کور کے ساتھ سگائی کی خوشیاں بھی شامل ہوگئیں۔ رنجیت سنگھ کے لیے یہ خوشی کا موقع ایک "اور" لحاظ سے ذاتی اہمیت اختیار کر گیا۔ اس موقع پر برپا محفل رقص میں اس کی اکلوتی آنکھ ایک مسلمان طوائف موہراں پر پڑی اور وہ اس کے عشق میں بری طرح سے گرفتار ہوگیا۔ اس محفل کے چند روز بعد ہی موہراں نے اپنے قحبہ خانے کے تاریک ماحول کو خیر باد کہا اور شاہی حرم میں رہنے کے لیے رنجیت سنگھ کے محل میں چلی آئی۔ آئندہ کے کئی برس تک وہ رنجیت سنگھ کے اعتماد پر پورا اتری۔ مہاراجا نے اس کی محبت میں ایک سکہ بھی جاری کروایا14۔ چونکہ موہراں نقاب نہیں لیتی تھی اور اکثر رنجیت سنگھ کے دربار میں دیکھی جاتی رنجیت سنگھ پر اس کے اثر ورسوخ کی کئی کہانیاں پھیلنا شروع ہوگئی تھیں۔

4

امرتسر پر قبضہ اور فوج کا انتظامِ نو

لاہور کے بعد پنجاب کا دوسرا بڑا شہر امرتسر کاروباری لحاظ سے لاہور سے زیادہ اہمیت کا حامل تھا۔ یہ شمالی ہندوستان کا سب سے بڑا تجارتی مرکز سمجھا جاتا تھا جہاں وسطِ ایشیا کے ممالک سے قافلے آکر رکتے اور ان ممالک کی اشیا فروخت کی جاتیں۔ اس کی چھوٹی چھوٹی تنگ گلیاں ہر طرح کی اشیائے ضرورت سے بھری رہتی تھیں۔ ان میں چمڑا، ململ، مصالحہ جات، چائے، کھالیں، توڑے دار بندوقیں اور دیگر ہر طرح کا اسلحہ شامل تھا۔ شہر میں آنے والے امیر سرمایہ داروں کی وجہ سے سناروں کا کام بھی چل نکلا تھا۔ اپنی تمام تر امارت و شان و شوکت کے علاوہ امرتسر کو مذہبی اہمیت کی وجہ سے بھی سکھوں میں خاص مقام حاصل تھا۔ اس کی بنیاد سکھوں کے چوتھے گرو رام داس نے رکھی اور یہیں پر سکھوں کے پانچویں گرو ارجن نے مشہورِ زمانہ "ادی گرنتھ" صحیفہ مکمل کیا اور مقدس تالاب کے بیچوں بیچ گوردوارہ تعمیر کیا۔ سال میں دو مرتبہ صاحبِ استطاعت سکھ امرتسر آتے اور یہاں کے مقدس پانیوں میں نہا کر چڑھاوے چڑھاتے۔ سکھوں کے نزدیک تو امرتسر دنیا کا اہم ترین شہر تھا۔ ایسے ہر اس شخص کے لیے جو سکھوں کا لیڈر بننا چاہتا ہو یا پنجاب کا مہاراجا کہلوانا پسند کرتا ہو اس لقب کی شان رکھنے کے لیے امرتسر پر قبضہ کرنا ضروری تھا۔

امرتسر کے مختلف حصوں پر ایک درجن سے زائد خاندانوں کا دعویٰ تھا۔ ان قبیلوں یا خاندانوں نے اپنے علاقوں میں چھوٹے چھوٹے قلعے بنائے ہوئے تھے اور مقامی لوگوں سے پیسہ بٹورنے کے لیے مسلح جتھے پال رکھے تھے۔ یہ بدمعاش مقامی تاجروں اور دکانداروں سے زیادہ سے زیادہ بھتا وصول کرتے۔ مختلف سرداروں کے ان جتھوں کے درمیان مسلسل چپقلش رہتی اور اکثر امرتسر کی گلیوں اور بازاروں میں یہ ایک دوسرے سے دست و گریباں نظر آتے۔ امرتسر کے شہری اس صورتحال سے بیزار ہو چکے تھے اور انھوں نے خفیہ طور پر رنجیت سنگھ کو شہر پر قبضہ کرنے کا پیغام بھجوایا۔ رنجیت سنگھ کے مخبرا سے

پہلے ہی بتا چکے تھے کہ شہر پر حملے کی صورت میں مقامی سرداروں کی طرف سے مزاحمت کا کوئی امکان نہیں۔ امرتسر کے واحد قابلِ ذکر خاندان کی سربراہ اس بھنگی سردار کی بیوہ جس نے چار سال قبل بھسین کے محاذ پر شراب کے نشے میں دھت ہو کر جان دی تھی اور اس کا بیٹا گردت سنگھ تھے۔ اس بیوہ عورت کا نام مائی سکھاں تھا اور اس نے گوندگڑھ قلعے پر قبضہ کیا ہوا تھا اس کے علاوہ اسے رام گڑھیا مثل کی مکمل حمایت حاصل تھی۔

1802 کے موسمِ خزاں کی بات ہے کہ مائی سکھاں کے بھتا خوروں کا ایک مقامی مالدار شخص اروڑمل سے زبردستی پیسہ وصول کرتے ہوئے آپس میں جھگڑا ہو گیا۔ اروڑمل روز روز کا بھتہ دے کر تنگ آ چکا تھا اور اب اپنا کاروبار مائی سکھاں کے علاقے سے دوسرے علاقے میں منتقل کر رہا تھا۔ اس واقعہ کے بعد اروڑمل نے رنجیت سنگھ کو امرتسر کا امن وامان بحال کرنے کی اپیل کی۔

رنجیت سنگھ، سدا کور اور فتح سنگھ اہلیا نوالہ کی مشترکہ فوج نے امرتسر کو گھیرے میں لے لیا۔ امرتسر کے سرداروں نے اپنی توپوں پر چڑھ کر رنجیت سنگھ کی فوج سے مقابلے کا فیصلہ کر لیا ادھر مائی سکھاں بھی جواب دینے کے لیے تیار تھی اسے رامگڑھیوں سے مدد کی امید تھی۔ رنجیت سنگھ نے امرتسر کے سرداروں کے قبضے سے شہر کو ٹکڑوں کی صورت قبضے میں لینا شروع کر دیا۔ رامگڑھیے مائی سکھاں کی مدد کو نہ پہنچے تاہم رنجیت سنگھ نے مائی سکھاں اور اس کے بیٹے کو ایک معقول پنشن کے عوض مزاحمت ترک کرنے پر راضی کر لیا۔ گوبندگڑھ قلعے کا حصول ایک قیمتی اثاثہ ثابت ہوا۔ اس پر قبضے کے نتیجے میں رنجیت سنگھ کی ملکیت میں پانچ توپیں بھی آ گئیں جن میں احمد شاہ ابدالی کی مشہورِ زمانہ زم زم توپ بھی شامل تھی۔ یہ توپ پیتل اور تانبے کی بنی ہوئی تھی اور پانی پت کے میدان اور مرہٹوں کے خلاف لڑائی میں دشمنوں کا صفایا کر چکی تھی۔ بھنگیوں نے یہ افغانیوں سے حاصل کی تھی اور تب سے اسے بھنگیوں کی توپ کہا جاتا تھا۔1

قلعے اور توپ کے قبضے سے بھی زیادہ اہم کامیابی اکالی پھلا سنگھ کی خدمات حاصل کرنا تھا۔ یہ شخص نہنگ قبیلے (جسے اکالی بھی کہا جاتا تھا اور جو گرو گوبند سنگھ کے وقت سے اکالی دل کے خودکش حملہ آوروں پر مشتمل تھا2) سے تعلق رکھتا تھا اور اپنی ساری زندگی سکھ درگاہوں کی خدمت اور حفاظت کے لیے وقف کیے ہوئے تھا۔

پھلا سنگھ اکال تخت کے نظریے کا پکا حامی سمجھا جاتا تھا۔ امرتسر میں رنجیت سنگھ کی کامیابی کا سہرا زیادہ تر اسی کے سر جاتا ہے۔ وہ ریاست (لاہور) کی فوج میں شامل ہونے کے لیے اپنے ہمراہ دو ہزار سے تین ہزار تک نہنگ سرداروں کا دستہ لایا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ہمیشہ شدت پسندی کو ناپسند کیا اور کبھی پھلا سنگھ یا اس کے نہنگ سرداروں کے باتوں میں نہ آیا۔ وہ انھیں کند فہم اور کوتاہ بین کہا کرتا تھا۔ ایسے لوگ جن کی سوچ کی سمت ٹیڑھی اور نظر محدود ہو۔ تاہم اس نے انھیں مسلمان غازیوں کے مقابلے میں نہایت ہی مفید ہتھیار پایا۔ رنجیت سنگھ جنگ کے دوران ان کی شجاعت اور بہادری کی ہمیشہ تعریف کرتا۔ اس کی بہت سی شاندار فتوحات نہنگ دستے کی بہادری کی بدولت ہی ممکن ہوئیں۔

امرتسر کے مقدس شہر میں رنجیت سنگھ کا شاندار استقبال کیا گیا۔ وہ اپنے ہاتھی پر بیٹھ کر شہر کی تنگ گلیوں سے گزرتے ہوئے گولڈن ٹیمپل پہنچا اور اس کے پاک پانیوں میں غسل کیا۔ اس موقع پر رنجیت سنگھ نے گوردوارہ کی سنگ مرمر سے از سرِ نو تعمیر اور اس کی سونے کے پانی سے سجاوٹ کے لیے کثیر رقم نذرانے کے طور پر بھی دی۔

امرتسر کی فتح نے رنجیت سنگھ کی شہرت کو مزید ہوا دی اور انگریزوں کے زیرِ اثر علاقوں سے ہندوستانیوں کی بڑی تعداد رنجیت سنگھ کے جھنڈے تلے کھڑے ہونے کے لیے لاہور کا رخ کرنے لگی۔ ان میں زیادہ تر ایسٹ انڈیا کمپنی کو خیر باد کہنے والے مسلم ہندوستانی اور چند ایسے یورپین شامل تھے جو ہندوستان میں آ کر آباد ہو گئے تھے۔ مہاراجا جو پہلے ہی انگریزوں کی جنگی مہارت کا قائل تھا یہ جاننا چاہتا تھا کہ ان کے پاس آخر ایسی کیا خوبی تھی کہ انھوں نے تعداد میں کم فوج اور محدود اسلحے کے باوجود ہندوستان کے راجوں، مہاراجوں کی بڑی بڑی فوجوں کو شکست دی۔ ایسٹ انڈیا کمپنی کی ایک پلاٹون نے جو دہلی سے بھاگ کر لاہور آ گئی تھی رنجیت سنگھ کو فوجی پریڈ اور مشقیں کر کے دکھائیں۔ رنجیت سنگھ نے پہلی بار سپاہیوں کو ایک ساتھ قدم اٹھاتے اور فوجی احکامات پر پوزیشنیں بدلتے دیکھا۔ اس نے بھاگ کر آنے والے سپاہیوں کو ڈرل ماسٹر کے طور پر اپنی فوج میں جگہ دی اور ساتھ میں نوجوان پنجابیوں کے ایک گروہ کو پنجاب کی سرحد کی طرف روانہ کیا تا کہ وہ انگریزوں کے زیرِ انتظام ہندوستانی لشکر میں بطور سپاہی بھرتی ہوں اور وہ سب کچھ سیکھ کر لوٹ سکیں جو انگریز انھیں بتائیں۔

سکھ فوجی ہندوستانیوں سے سیکھنے کے لیے آمادہ نہیں تھے۔ سکھ زبردست گھڑ سوار تھے اور زمینی جنگ کو اپنی شان کے خلاف سمجھتے تھے۔ ایک ساتھ قدم جما کر مارچ کرنا ان کے نزدیک بیوقوفوں کے رقص سے زیادہ کچھ نہیں تھا اور وہ ہندوستانیوں کو ایسا کرتے دیکھ کر خوب پھبتی کستے۔ وہ یہ دعویٰ کرنے میں حق بجانب تھے کہ گھوڑوں پر سوار، نیزہ تھامے سکھ بندوق برداروں نے رنجیت سنگھ کی فتوحات میں سوا لاکھ فوجیوں کے برابر کردار ادا کیا تھا۔ چھوٹے چھوٹے مضحکہ خیز ہندوستانیوں کی فوجی مشقیں خالصہ فوج کو بھلا کیا سکھا سکتی تھیں۔ تاہم رنجیت سنگھ ان کی اس طرح کی خود پسندانہ باتوں سے ذرا بھی متاثر نہیں ہوا۔ اس نے ان نوجوان پنجابیوں کے لیے اچھی مراعات کا وعدہ کیا جو اس نئی انفنٹری کا حصہ بنیں گے اور اس کی فوج کے ہندوستانی اور یورپی ڈرل ماسٹرز سے تربیت لینے پر تیار ہوں گے۔ وہ روزانہ صبح، شام خود میدان میں جا کر انھیں ٹریننگ لیتے دیکھتا اور ان کے ڈرل ماسٹرز کو اس شاندار تربیت کے عوض بھاری معاوضے دیتا۔ نو ماہ کی سخت تربیت کے بعد رنجیت سنگھ کی نئی فوج جنم لے چکی تھی۔ 1803 کے موسم خزاں میں دسہرا کا جشن منایا گیا اور اس جشن کا سب سے نمایاں پہلو رنجیت سنگھ کی فوج کا مارچ اور فرضی جنگوں کا مظاہرہ تھا۔

دسہرا کے بعد فوج کشی کا موسم شروع ہو گیا۔

رنجیت سنگھ نے اپنے قاصد خود مختار ریاستوں کی طرف بھیجے اور انھیں پنجاب کی حکومت سے وفاداری کا اعلان کرنے کی دعوت دی۔ (ان میں سے چند ایک ابھی تک افغانستان کے ساتھ الحاق کا دعویٰ کر رہے تھے یا کم از کم ایسا ظاہر کر رہے تھے

تا کہ انھیں تختِ لاہور کو ٹیکس نہ ادا کرنا پڑے)۔ جھنگ اور آس پاس کے علاقوں کا سربراہ احمد خان سیال انھی چند سرداروں میں ایک تھا اس نے رنجیت سنگھ کی پیش کش کو حقارت سے مسترد کر دیا۔

رنجیت سنگھ اپنی نئی فوج کو لے کر جھنگ کی طرف بڑھا۔ احمد خان جس نے آس پاس کے قبائل سے کرائے کے سپاہیوں کی بڑی تعداد اپنے لشکر میں بھرتی کی تھی مخالف سمت سے اپنی فوج کے ہمراہ نمودار ہوا۔ دونوں جانب سے حکم ملنے پر جنگ کا آغاز ہوا۔ جب دونوں طرف کا بارود ختم ہو گیا تو سیال گھڑ سوار حملہ کرنے کے لیے آگے بڑھے۔ رنجیت سنگھ کی فوج کے پیدل دستوں نے ان کے حملے کا مقابلہ کیا اور جب سیال گھڑ سوار اپنی توانائیاں صرف کر چکے تو رنجیت سنگھ کی سپاہ نے جوابی حملہ کیا۔ اس حملے سے سیالوں کی صفوں میں بھگدڑ مچ گئی اور وہ قلعے نما شہر کی فصیلوں کے پیچھے پناہ لینے کے لیے دوڑے۔ رنجیت سنگھ کے ہاتھی قلعے کے دروازوں کو توڑتے ہوئے آگے بڑھے اور شہر میں محصور فوج کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ احمد خان رنجیت سنگھ کی فوج کا حصار توڑ کر ملتان کے نواب کے پاس فرار ہونے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اسے یہ حقیقت سمجھنے میں کچھ وقت لگا کہ رنجیت سنگھ سیالوں کے علاقوں پر ذاتی لالچ کی بنا پر قبضہ نہیں کرنا چاہتا تھا بلکہ وہ پنجاب کے سرداروں اور قبائل کو یہ باور کرانا چاہتا تھا کہ اُن سب کو مل کر اپنے پنجابی بھائیوں کا ساتھ دینا چاہیے۔ کچھ مہینوں بعد احمد خان سیال نے رنجیت سنگھ کے دربار کی اطاعت کا اعلان کیا اور رنجیت سنگھ نے اسے واپس جھنگ میں دربارِ لاہور کا افسرِ اعلیٰ مقرر کر دیا۔ جھنگ کے نزدیکی علاقے اُچ کے زمینداروں نے بھی رنجیت سنگھ سے وفاداری کا اعلان کر دیا۔

اس مختصر معرکے نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ برطانوی فوج کی طرز پر جنگی حکمت عملی اور تربیت کے حصول کا فیصلہ درست اقدام تھا۔ رنجیت سنگھ نے تربیت کو مزید سخت اور فوج کی تعمیر نو کرنے کا فیصلہ کیا۔ 1804 کے موسمِ بہار میں وہ اپنی فوج کی مختلف یونٹوں کو ایک ساتھ پریڈ کرتے اور ڈویژنوں میں تبدیل ہوتے دیکھ سکتا تھا۔ بڑے پیمانے پر فوجی مشقوں اور اپنی فوج کو فنِ حرب میں طاق کرنے کے بعد اس نے گوبند گڑھ کے قلعے میں اپنے سرداروں اور فوجی حکام کا اجلاس طلب کیا۔ وہاں اس نے اعلان کیا کہ وہ اپنی فوج کو تین حصوں میں تبدیل کرنے جا رہا ہے۔ ان میں سے ایک براہِ راست مہاراجا کے زیرِ نگیں تھی اور مختصر حکم پر کارروائی کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ اس حصہ میں فوج کی تینوں شاخیں پیدل سوار، گھڑ سوار اور توپ خانہ شامل تھے اور ان کی سربراہی رنجیت سنگھ کے پسندیدہ جرنیلوں ہری سنگھ نلوا، حکما سنگھ چمنی اور دیسا سنگھ مجیٹھا کے ہاتھوں میں تھی۔ توپ خانہ کی سربراہی چودھری غوث خان کر رہا تھا جبکہ مشہور و معروف توپچیوں میں جنھوں نے یورپی فن حرب (خصوصاً توپوں کے استعمال) میں مہارت حاصل کی ہوئی تھی روشن خان اور شیخ عبداللہ شامل تھے۔ ان یونٹوں میں 13000 سے زائد سپاہی شامل تھے۔ رنجیت سنگھ کی فوج کا دوسرا حصہ ان قبائلی سرداروں کی فوج پر مشتمل تھا جنھوں نے اپنی جاگیریں اور راجدھانیاں ریاستِ لاہور میں ضم کرنے کا اعلان کیا تھا۔ ان میں بیشتر بھنگی سردار تھے جنھیں لاہور کی ریاست سے ضم ہونے کے بعد واپس اپنے علاقوں میں تختِ لاہور کے نمائندہ کی حیثیت سے سرداری حاصل ہو گئی تھی۔ ان کا تختِ لاہور کے ساتھ

معاہدہ تھا کہ جنگ کے وقت وہ ضروری اسلحے سے لیس دستے لاہور کی فوج کا ساتھ دینے کے لیے مہیا کریں گے۔ یہ قبائلی سردار میدانِ جنگ میں دس ہزار سے زائد فوجی اتار سکتے تھے۔ رنجیت سنگھ کی فوج کے تیسرے حصے میں مختلف مثلوں کے جوان شامل تھے۔ یہ مثلیں کنہیا، نکئی و دیگر رنجیت سنگھ کی اتحادی تھیں۔ اس طرح سے ایسے جنگجو جوانوں کی کل تعداد جنھیں رنجیت سنگھ میدانِ جنگ میں اتار سکتا تھا 31,000 کے لگ بھگ تھی۔

فوج کی تشکیلِ نو امرتسر کے مقام پر ہوئی۔ اس عمل سے رنجیت سنگھ کو نہ صرف اپنی فوج کی صحیح تعداد کا پتا چلا بلکہ وقتِ ضرورت انھیں میدان میں اتارنے کی ذمہ داری کا بھی تعین ہوا۔ یہ سب طے کرنے کے بعد رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کے لیے پریڈ، مشقوں اور نشانہ بازی کے بہترین معیار مقرر کیے۔ اگر وہ کسی فوجی دستے کو ڈھیلا ڈھالا یا کم تربیت یافتہ پاتا تو فوراً ذمہ دار افسر کو طلب کر کے اس کی تنزلی کر دی جاتی یا پھر بھاری جرمانہ عائد کیا جاتا۔ تاہم اُس کا عمومی طریق کار جوانوں کی بڑے بڑے انعام و اکرام کی پیشکش کے ذریعے نہ کہ انھیں جرمانوں سے ڈرا کر ان کی استعداد کار میں اضافہ کرنا تھا۔ وہ روزانہ دن میں چار سے پانچ گھنٹے اپنے جوانوں کو فوجی مشقیں کرتے دیکھتا اور شاید ہی ایسا دن گزرتا جب اس نے کسی گھڑ سوار یا پیدل دستے کے رکن کو بلا کر اچھی کارکردگی پر انعام نہ دیا ہو اور چونکہ وہ عام طور پر جنگوں کے دوران اپنے لشکر کے ساتھ موجود ہوتا اس کی نظر میدانِ جنگ میں بہادری کا جوہر دکھانے والوں کی تلاش میں رہتی اور ایسے بہادر سپاہیوں کو وہ بڑی بڑی جاگیروں اور پنشن سے نوازتا۔

5

انگریز اور مرہٹے

لاہور پر قبضے اور مہاراجا کا خطاب اپنانے کے پانچ برس کے اندر لاہور کی مشرقی سرحدوں کی صورتحال یکسر تبدیل ہو گئی۔ 1800 میں جن قوتوں سے نمٹنا تھا وہ ہانسی میں جارج تھامس، دہلی میں سندیا جس نے کٹھ پتلی مغل شہنشاہ کو تخت پر بٹھایا ہوا تھا اور دہلی کے پار انگریز تھے۔ 1801 میں سندیا کے فرانسیسی جرنیل پاغاں (Perron) نے جارج تھامس کا صفایا کر دیا اور مشرقی پنجاب کے سب سے طاقتور انسان کے طور پر سامنے آیا۔ دریائے ستلج کے آس پاس کے لوگوں نے جارج تھامس سے جان چھڑانے پر جرنل پاغاں کا شکریہ ادا کیا اور جرنل نے اس شکر گزاری کے جذبات کا خوب فائدہ اٹھاتے ہوئے مقامی سرداروں کے ساتھ پگڑیاں تبدیل کیں۔ اس نے سکھوں کو انگریزوں کے عزائم سے خبردار کر کے انگریزوں کا اس سمت آنے کا منصوبہ خاک میں ملا دیا۔ جند کے بھاگ سنگھ کے نام جو کہ رنجیت سنگھ کا چچا تھا ایک خط میں جرنل لکھتا ہے: "انگریزوں کا یہ وطیرہ رہا ہے کہ پہلے وہ مختلف طرح کے لالچ دے کر آپ کی سرزمین پر پاؤں رکھنے کی اجازت مانگتے ہیں پھر خوشامد اور خدمت کی آڑ میں آہستہ آہستہ پورے ملک پر قابض ہو جاتے ہیں۔ ماضی قریب میں جن راجوں مہاراجوں کی سلطنت پر انھوں نے قبضہ کیا ان میں چیٹ سنگھ، ٹیپو سلطان، نواب قاسم علی خان، نواب آصف الدولہ، نظام علی خان و دیگر شامل ہیں 1۔" اس خط کی روشنی میں بھاگ سنگھ نے انگریزوں کے ایجنٹ (ایلچی) میر یوسف علی کے دورہ لاہور کے دوران اپنے بھتیجے کو انگریزوں کے ساتھ کسی قسم کے معاہدے یا وعدے سے روکنے کی پوری کوشش کی۔ رنجیت سنگھ کو اتنی عقل تھی کہ دوستی اور سفارت کاری کے ان تمام سلسلوں کا چاہے وہ افغانیوں کی طرف سے ہوں، انگریزوں یا فرانسیسیوں کی طرف سے ایک ہی مقصد تھا اور وہ تھا پنجاب پر اپنا تسلط قائم کرنا۔ مگر وہ یہ بھی جانتا تھا کہ اگر اس نے ان قوتوں کی طرف سے بڑھایا گیا دوستی کا ہاتھ جھٹک دیا تو اس کے مخالفین اُن سے رابطہ کریں گے اور اس کی پنجاب پر گرفت کمزور کرنے کی کوششوں میں مصروف ہو

جائیں گے۔ رنجیت سنگھ انگریزوں اور جنرل پاغاں کے ساتھ اسی طریقے سے پیش آیا جس طرح وہ شاہ زمان کے ساتھ پیش آیا تھا۔ کولنز کے نام ایک خط میں رنجیت سنگھ اپنی صفائی کچھ یوں دیتا ہے: ''بھاگ سنگھ جنرل پاغاں کے وکیلوں کے ہمراہ جن میں صاحب سنگھ (پٹیالہ والے)، لوئی (Louis) جو کہ جنرل پاغاں کا ماتحت تھا (اور اس کے بارے مزید میں بعد میں بتاؤں گا) یہاں میرے لیے تحائف لے کر آئے۔ انھوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں جنرل پاغاں کے لیے دوستی اور خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کروں۔ بھاگ سنگھ جو جنرل کے احسانوں تلے دبا ہوا ہے مجھے اس پر کہ میں بھی جنرل پاغاں کے لیے دوستی اور خیر سگالی کے جذبے کا اظہار کروں قائل کرنے کے لیے ہر قسمی حربہ آزمایا اور ساتھ میں مجھے اس بات پر بھی قائل کرنے کی کوشش کی ہے کہ میں فرانسیسی جرنیل کے ساتھ ایک ملاقات کروں۔ اگرچہ میری گورنر جنرل اور آپ کے ساتھ دوستی کا رشتہ کسی بھی دوسرے شخص کے ساتھ تعلق سے کہیں بڑھ کر ہے تاہم مجھے اپنے چچا کی خوشی کی خاطر جھوٹ موٹ خیر سگالی کا اظہار کرتے ہوئے اُس (جنرل پاغاں) سے ملنا پڑے گا''

فرانسیسی جرنیل کا پنجاب میں ''پاغونستان'' قائم کرنے کا خواب شرمندۂ تعبیر نہیں ہو سکا۔ اس کے ماتحت مسٹر لوئی نے ملاوہ کے سکھ سرداروں پر جرمانہ عائد کرتے ہوئے ان کے ساتھ بدتمیزی کی۔ پاغاں نے لوئی کو گرفتار کروا دیا اور اس کی خوب سرزنش کی۔ خفیہ طور پر اس کے اور ملاوی سرداروں کے درمیان تعلقات بحال ہو چلے تھے کہ اسے دہلی سے بلاوا آ گیا۔ اس کے آقا سندیا نے اسے پنجاب سے دہلی طلب کر لیا تھا تا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ جنگ میں حصہ لے سکے۔ خوش قسمتی نے مرہٹوں کا ساتھ نہیں دیا اور انھیں متواتر شکست ہوتی چلی گئی۔ سندیا کے اقتدار کا سورج غروب ہوتے ہی پاغاں کی امیدوں کا سورج بھی غروب ہو گیا اور وہ ہندوستان کے افق سے غائب ہو گیا۔ انگریز دہلی اور آگرہ کے مالک بن گئے اور دربار میں موجود کٹھ پتلی مغل شہنشاہ کے بھی۔ وہ ایک قدم مزید رنجیت سنگھ کے قریب آ گئے تھے۔ لاہور تک پہنچنے میں ان کے راستے میں دو بڑی رکاوٹیں تھیں: مرہٹا سردار جسونت راؤ ہولکر اور ملاوہ کے سکھ سردار۔ سندیا کی شکست کے دو برس کے اندر ہولکر کی انگریزوں کے ساتھ جھڑپ ہو گئی۔ ہولکر اپنی ماضی کی فتوحات کا سلسلہ برقرار نہ رکھ سکا اور اس مرتبہ قسمت کا ستارہ انگریزوں پر چمکا جنھوں نے دیگ کے مقام پر اسے عبرتناک شکست سے دوچار کیا۔ ہولکر اور اس کے اتحادی روہیلہ سردار عامر خان نے جان بچانے کی خاطر پٹیالہ کے سکھوں کے ہاں جا کر پناہ لی اور کئی ماہ تک ملاوہ کے سرداروں کی حمایت حاصل کرنے کی تگ و دو میں لگے رہے۔ ہولکر نے افغانیوں سے بھی رابطہ کیا اور انھیں ایک بار پھر ہندوستان پر حملہ کرنے کی دعوت دی۔ اُدھر جب لارڈ لیک نے ایک بار پھر ان کا تعاقب شروع کیا تو ہولکر اور عامر خان نے دریائے ستلج عبور کرنے کے بعد امرتسر جا کر پناہ لی۔ لیک بیاس کے کنارے تک آن پہنچا تھا۔ ہولکر اور لیک دونوں نے اپنے اپنے پیغام رسان رنجیت سنگھ کے پاس بھیجے جو اس وقت ملتان میں تھا۔

رنجیت سنگھ کو معاملے کی نزاکت کا احساس ہو چکا تھا اس نے اپنے تمام اہم سرداروں کو امرتسر مشورے کے لیے

طلب کیا۔

سربت خالصہ میں تمام اہم سکھ سردار اور عمائدین شریک ہوئے۔ معاملے کے دونوں رخ دیکھے گئے۔ ایک طرف پناہ گزین تھے جنھوں نے پناہ کی درخواست کی ہوئی تھی اور یہ پنجاب کی آن کا معاملہ تھا ایسا کیسے ہوسکتا تھا کہ کوئی ان سے پناہ کی درخواست کرے اور وہ انکار کر دیں۔ اسی ہولکر نے سکھوں کی ایک درگاہ پر حاضری اور ایک خطیر رقم بطور نذرانہ پیش کر کے سکھوں کے دل موہ لیے تھے۔ اس نے رنجیت سنگھ کو اپنا بھائی اور ہندوستان کے ہندوؤں کی آخری امید قرار دیا اور اس طرح اس کا دل جیتنے کی کوشش کی (خوش قسمتی سے رنجیت سنگھ کو ہولکر اور افغانیوں کے درمیان ہونے والے مذاکرات کا علم تھا) دوسری جانب انگریز تھے جو رنجیت سنگھ سے مسلسل تقاضا کر رہے تھے کہ ہولکر کو اپنی سلطنت سے نکال باہر کرے یا اپنے علاقوں میں ہونے والی انگریز مرہٹا جنگ کے اثرات بھگتنے کے لیے تیار ہو جائے۔ لارڈ لیک کے تیور بتا رہے تھے کہ اس کی طرف سے ہولکر کی ملک بدری کا تقاضا محض دھمکی نہیں تھا3۔ اپنے موقف کو مزید بے لچک اور حتمی ظاہر کرنے کے لیے وہ جند کے بھاگ سنگھ کو پہلے ہی امرتسر بھیج چکا تھا۔

رنجیت سنگھ نے ہولکر کے یورپی اندازِ حرب میں طاق دستوں کا خود معائنہ کیا۔ یہ دستے اس کی مجموعی فوج سے کہیں بہتر تھے۔ تاہم اس کی سمجھ میں یہ بات نہ آئی کہ اتنی تربیت یافتہ فوج لیک اور اس کے سپاہیوں کے سامنے کیوں نہ ٹھہر سکی۔ ہولکر کو اپنے عجیب و غریب سوالوں سے پشیمان کرنے کی بجائے اس نے ایک عام سپاہی کا بھیس بدل کر خود جا کر لیک کے دستوں کا معائنہ کرنے فیصلہ کیا۔ چند وفادار سپاہیوں کے ہمراہ وہ شہر سے باہر خیمہ زن لارڈ لیک کی فوج کا جائزہ لینے پہنچا اور سارا دن لارڈ لیک کے انگریز اور ہندوستانی سپاہیوں کا بغور معائنہ کرتا رہا۔ شام کو وہ لارڈ لیک کے خیمے کے باہر جا پہنچا اور باہر کھڑے کمانڈروں سے لارڈ لیک سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ اس کی اکلوتی آنکھ نے اس کا راز فاش کر دیا! لارڈ لیک اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہونے والی بات چیت کا کوئی ریکارڈ موجود نہیں لیکن رنجیت سنگھ اس یقین کے ساتھ امرتسر لوٹا کہ انگریز ہولکر کے بس کا کھیل نہیں۔ وہ ہولکر سے کہیں زیادہ طاقتور تھے اور شاید اتنے طاقتور کہ ہولکر اور اس کی فوج مل کر بھی ان کا مقابلہ نہیں کر سکتے تھے۔4

اب رنجیت سنگھ کے پاس گرو کے پاس جانے کے سوا کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔ وہ گولڈن ٹیمپل گیا اور اپنے گرو سے رہنمائی کے لیے دعا کی۔

اس نے کاغذ کی دو پرچیاں لیں ایک پر لیک کا نام لکھا اور دوسرے پر ہولکر کا۔

اس نے پرچیوں کو موڑ کر گرنتھ صاحب کے سامنے رکھا۔ مختصر دعا و مناجات کے بعد ان میں سے ایک پرچی اٹھائی اور کھول کر دیکھا تو لیک کا نام لکھا تھا۔

رنجیت سنگھ نے انگریزوں اور مرہٹوں کی باہمی چپقلش کا حصہ بننے سے صاف انکار کر دیا اور دونوں میں صلح کی کوششوں

کا آغاز کر دیا۔خوش قسمتی سے برطانیہ کے گورنر جنرل لارڈ ویلسلے جس نے مرہٹوں کے خلاف جارحانہ پالیسی کا آغاز کیا ہوا تھا کا تبادلہ ہو گیا اور اس کی جگہ لارڈ کارنوالز ہندوستان کا نیا گورنر جنرل بن کر آیا۔لارڈ کارنوالز کو کسی بھی قسم کی جنگ میں حصہ لینے یا قریبی ریاستوں کو برطانیہ کے علاقوں میں شامل کرنے سے واضح طور پر منع کیا گیا تھا۔لندن سے حکم آیا تھا کہ ہولکر کو اس کے علاقے واپس کر دیئے جائیں۔رنجیت سنگھ کی صلح کی کوششیں بارآور ثابت ہوئیں۔مرہٹے اور روہیلے دریائے ستلج عبور کرنے کے بعد ہمیشہ کے لیے پنجاب کے افق سے اوجھل ہو گئے۔مشرق میں انگریز اب واحد قوت کے طور پر رہ گئے تھے اور ان کے اور رنجیت سنگھ کے درمیان ملاوہ سرداروں کے زیرِ نگیں ایک ڈھیلی ڈھالی ریاست کے سوا اور کچھ باقی نہیں بچا تھا۔

ہولکر اور رنجیت سنگھ نے اس مختصر سے عرصہ میں ایک دوسرے کے کردار کے بارے میں کافی کچھ جان لیا تھا۔جب ہولکر نے دیکھا کہ اس کی ہندو۔سکھ اتحاد اور جذبہء حب الوطنی پر کی گئی تقاریر کے باوجود رنجیت سنگھ نے اپنے چچا، فتح سنگھ اہلیانوالہ، کو انگریزوں کے پاس بات چیت کے لیے بھیجا تو اس نے اس طرح سے طنز کیا: ''دکن کی سرحدوں سے لے کر پنجاب کے میدانوں تک میں اس کھوج میں رہا کہ کوئی ایک بہادر شخص مجھے ملے جو ان جنگوں میں میرا ساتھ دے سکے لیکن میری اس تمام تلاش بسیار کے باوجود وہ مجھے کہیں نہ ملا۔دنیا میں جری مرد کے علاوہ کچھ نہیں مگر حقیقی معنوں میں مرد کا ملنا مشکل ہے'' رنجیت سنگھ کا ہولکر کے دہرے معیار پر تبصرہ بڑا ہی مختصر مگر بہت ہی برمحل تھا جس کہ ایک عام پنجابی دہقان سے توقع کی جا سکتی ہے۔رنجیت سنگھ کے الفاظ میں ہولکر ایک پکا حرامزادہ تھا۔

رنجیت سنگھ اور فتح سنگھ اہلیانوالہ نے انگریزوں کے ساتھ معاہدۂ لاہور پر یکم جنوری 1806 کو دستخط کیے۔سکھوں نے اس بات پر رضامندی کا اظہار کیا کہ فوری طور پر رنجیت سنگھ ہولکر کو اس کی فوجوں سمیت امرتسر سے 30 کلومیٹر دور بھیج دے گا۔اور اس سے کسی قسم کا تعلق نہیں رکھا جائے گا اور نہ ہی کوئی امداد مثلاً اسلحہ یا فوج یا کسی اور شکل میں دی جائے گی"۔جواب میں انگریز سرکار نے یقین دہانی کرائی کہ ان کی فوجیں ان سرداروں کے علاقوں میں داخل ہوں گی نہ ہی ان پر قبضہ کرنے کا کوئی منصوبہ بنائیں گی۔

آنے والے مہینوں کی تھکاوٹ نے رنجیت سنگھ کی صحت پر برا اثر ڈالا۔سری کٹاس کے مندر میں نہاتے ہوئے جہاں رنجیت سنگھ آرام کی غرض سے گیا تھا اسے سردی لگ گئی جو بخار میں تبدیل ہو گئی۔یہ اتنا شدید بخار تھا کہ اسے اپنے پیروں پر کھڑے ہونے میں کئی ہفتے لگ گئے۔اسے ڈولی میں بٹھا کر لاہور لایا گیا اور ڈاکٹروں کی ہدایت پر اُسے شہر سے چند میل باہر مشرق کی سمت میں مغلوں کے تعمیر کیے گئے شالامار باغ میں آرام کے لیے منتقل کر دیا گیا۔شالامار باغ میں صحت یابی کے دوران اس نے باغ کو پانی فراہم کرنے والی نہر کو دوبارہ کھلوایا اور وہاں موجود چشموں اور فواروں کی صفائی کروائی۔رنجیت سنگھ نے پھولوں اور فواروں کی صحبت میں کئی دن گزارے یہاں تک کہ وہ مکمل رو بہ صحت ہو گیا۔

''لوگ اسے شالامار باغ کیوں کہتے ہیں'' ایک روز اس نے اپنے ایک درباری سے دریافت کیا۔''کیونکہ حضورِ والا،

فارسی میں شالامار کا مطلب ہے: دل کو بھلا لگنے والا۔''

''لیکن یہ پنجاب ہے، ایران نہیں'' رنجیت سنگھ نے کہا۔'' پنجاب میں شالامار کا مطلب ہے''محبت کا قاتل'' اور اس باغ میں محبت کا جذبہ جنم لیتا ہے مرتا نہیں۔ آج سے اس کو'شالا باغ'' کہا جائے جس کا مطلب ہے''محبوب کا باغ''۔

شالامار یا شالا باغ جیسا کہ رنجیت سنگھ اس کو کہنا چاہتا تھا رنجیت سنگھ کی شہر سے باہر پسندیدہ آرام وسکون کی جگہ میں تبدیل ہو گیا۔ رنجیت سنگھ کے دورِ حکومت میں یہ بہت سی خوشگوار ملاقاتوں اور باہر سے آئے معزز مہمانوں کے اعزاز میں دی گئی ضیافتوں کا مسکن بنا رہا۔ لاہور کی گرم اور ناپسندیدہ ہوا سے بچ کر مہاراجا اکثر یہاں آ نکلتا۔ یہاں شراب فواروں کے پانیوں کی طرح بہتی اور ناچنے والیوں کے گھنگھروؤں کی آوازیں رات دیر تک گونجتی رہتیں۔

6

پیشے کے لحاظ سے ایک سپاہی

''میں سپاہی کے پیشے سے تعلق رکھتا ہوں اور میرے نزدیک اپنی فتوحات کو آگے بڑھانے سے بڑھ کر کوئی خوشی نہیں ہے''، رنجیت سنگھ نے 1805 میں دلی کے نئے انگریز ریذیڈنٹ مسٹر سیٹن کے نام ایک خط میں اپنا تعارف کراتے ہوئے لکھا1۔ اگلے تین برسوں میں اس کی یہ بات ثابت ہو گئی کیونکہ اس دوران بمشکل کوئی دن ہی ایسا ہو گا جب اس نے اپنے پاؤں رکاب سے باہر نکالے ہوں۔ پنجاب سے مرہٹوں اور انگریزوں کی چپقلش کا خطرہ ٹلتے ہی ملاوہ کے سرداروں نے سازشوں اور بے کار جھگڑوں کا اپنا پرانا شغل دوبارہ شروع کر دیا۔ ایک معمولی جھگڑے نے سر اٹھایا اور دیکھتے ہی دیکھتے تمام جنوب مشرقی پنجاب کو اپنی لپیٹ میں لے لیا۔ وجہ تنازع نابھا اور پٹیالہ کے سنگم پر واقع ایک چھوٹا سا گاؤں ''دلادی'' تھا۔ اس گاؤں پر قبضے کی تگ و دو میں پٹیالہ کا ایک ایجنٹ اپنی جان گنوا بیٹھا۔ اس کے قتل کی اطلاع ملتے ہی ملاوہ میں فسادات پھوٹ پڑے۔ جند نے نابھا کی حمایت کی جبکہ تھانیسر اور کٹھیال پٹیالہ کی طرف ہو گئے۔ ان کی باہمی جھڑپوں میں تھانیسر کا سردار مارا گیا۔ پٹیالہ نے نابھا کو شکست دے کر اس قتل کا انتقام لیا۔ بالآخر دونوں فریقین فیصلے کے لیے رنجیت سنگھ کے دربار میں آئے۔ رنجیت سنگھ نے اسے ملاوہ اور راستے میں پڑنے والی تمام جاگیروں پر اپنی عملداری قائم کرنے کا سنہری موقع جانتے ہوئے 20 ہزار سپاہیوں کے ساتھ دریائے ستلج کو عبور کیا۔ پٹیالہ کی طرف جاتے ہوئے اس کا گزر کرتار پور کے گاؤں سوڈھی، فیاض اللہ پوریا مثل، ڈیل والیا مثل کے علاقوں اور لدھیانہ اور جاگراں جیسے امیر کبیر شہروں سے ہوا۔ جس شہر سے بھی رنجیت سنگھ گزرا اسے مقامی سرداروں کی طرف سے نقد نذرانے، توپیں، گھوڑے اور ہاتھیوں کے تحائف پیش کیے گئے۔

پٹیالہ میں ملاوی سردار اس کے انتظار میں تھے۔ تاہم صاحب سنگھ کو رنجیت سنگھ کو بھیجی جانے والی مدد کی درخواست کے پیچھے کوئی معقول وجہ دکھائی نہ دی اس کی سمجھ میں اور تو کچھ نہیں آیا اس نے خود کو اپنے قلعہ میں محصور کر لیا۔ رنجیت سنگھ کے لشکر کی

توپوں سے داغے جانے والے چند گولوں نے اسے میزبانی کے فرائض یاد دلائے اور وہ رنجیت سنگھ کو خوش آمدید کہنے کے لیے قلعہ سے باہر نکل آیا۔ اس مختصری کارروائی کے بعد رنجیت سنگھ کا شاندار استقبال کیا گیا اور ملاوی سرداروں نے اسے یقین دلایا کہ وہ اسے ہی پورے پنجاب کا مہاراجا سمجھتے ہیں۔2

دلادی گاؤں میں ہونے والے واقعے کے حوالے سے رنجیت سنگھ نے جو فیصلہ دیا اس کے مطابق نابھا کے سردار جسونت سنگھ کو پٹیالہ کے ایجنٹ کی موت سے بری الذمہ کر دیا گیا اور ہرجانے کے طور پر تین شہر بسی، تاونڈی اور جاگران مع قریبی دیہاتوں کے پٹیالہ کے حوالے کر دیئے۔ جند کے راجا کو لدھیانہ ملا جبکہ فتح سنگھ اہلیانوالہ کو بہت سے دیہات۔ اس اجلاس کا اختتام بھی رنجیت سنگھ کے ساتھ وفاداری کے عہد کے نعروں کے ساتھ ہوا۔

لاہور کی طرف واپسی کے سفر میں رنجیت سنگھ نے چند روز جالندھر کے جنگلوں میں شیر اور سور کا شکار کھیل کر گزارے۔ شکار کے ہی دوران اس کے ماضی کے ایک دشمن سنسر چند کا بھائی فتح چند اس سے ملنے آیا اور گورکھوں کے خلاف مدد کی اپیل کی۔ اس نے بتایا کہ گورکھوں نے ستلج اور جموں کے درمیان موجود پہاڑی علاقوں پر قبضہ کر لیا ہے اور کانگڑہ کے قلعہ کا محاصرہ کیے ہوئے ہیں۔ رنجیت سنگھ کو سنسر چند سنگھ کے ساتھ کوئی ہمدردی نہیں تھی جس نے ایک وقت میں افغانیوں کے ساتھ اتحاد کیا ہوا تھا اور وہ دو مرتبہ پنجاب کے میدانی علاقوں پر بھی قبضہ کر چکا تھا تاہم اس نے محسوس کیا اگر گورکھوں نے کانگڑہ کے قلعے پر قبضہ کر لیا تو وہ شمال میں ایک قوت کی شکل اختیار کر لیں گے۔ رنجیت سنگھ راجپوتوں کی مدد پر رضامند ہو گیا اور اپنی فوجوں کو ہمالیہ کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ گورکھوں کے کمانڈر امر سنگھ تھاپا نے رنجیت سنگھ کی آمد کا سنا تو اسے روپے پیسے کے نذرانے کے ساتھ خیر سگالی کا پیغام بھجوایا اور امید کی کہ وہ (رنجیت سنگھ) اس سارے معاملے میں غیر جانبدار رہے گا۔ رنجیت سنگھ جو کسی صورت کانگڑہ کا مضبوط قلعہ گورکھوں کے ہاتھ جاتا نہیں دیکھ سکتا تھا نے خیر سگالی کے تمام پیغامات اور نذرانے قبول کرنے سے انکار کر دیا۔

رنجیت سنگھ نے جوالا مکھی قصبے کے قریب اپنی فوجیں اتاریں۔ لاکھوں ہندو اس شہر کو یہاں موجود آتش فشاں پہاڑ کی وجہ سے مقدس گردانتے تھے۔ رنجیت سنگھ کے دستے کانگڑہ کے باسیوں کی مدد کو پہنچنے کے لیے مزید آگے بڑھے۔ گورکھے مہینوں طویل اس محاصرے سے تھک چکے تھے۔ گرمیوں کے آغاز میں ہی ان میں ہیضے کی وبا پھیل گئی۔ تھکاوٹ اور بیماری نے انھیں اس نئے حملہ آور کا مقابلہ کرنے کے قابل نہیں چھوڑا تھا۔ امر سنگھ تھاپا نے محاصرہ ختم کیا اور رنجیت سنگھ سے انتقام کا عہد کرتے ہوئے منڈی شکٹ کی طرف پسپا ہو گیا۔

سنسر سنگھ تھاپا رنجیت سنگھ کا شکریہ ادا کرنے اور نذرانہ پیش کرنے کے لیے جوالا مکھی آیا۔

رنجیت سنگھ ابھی پہاڑی علاقے میں ہی تھا کہ اسے اپنی پہلی بیوی مہتاب کور سے جڑواں بچوں کی پیدائش کی اطلاع ملی۔ شاہی لشکر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی۔ جب رنجیت سنگھ واپس لاہور پہنچا تو اس نے بڑی رقم خیرات کے طور پر غریبوں میں تقسیم کی اور کئی روز تک شہر میں چراغاں رہا۔ نومولود شہزادوں کا نام شیر سنگھ اور تارا سنگھ رکھا گیا۔3

رنجیت سنگھ کو لاہور میں رکے زیادہ عرصہ نہیں ہوا تھا جب اسے قصور کے پٹھانوں کے خلاف کارروائی کا مشورہ دیا گیا۔ نظام الدین جسے درباری فوج نے دو مرتبہ شکست دی تھی مارا جا چکا تھا۔ اس کی جگہ اس کا بھائی قطب الدین خان مسندِ اقتدار پر بیٹھ چکا تھا اور رنجیت سنگھ پر ایک اور ضرب لگانے کے لیے بے تاب نظر آتا تھا۔ اس نے غازیوں کی بڑی تعداد کو اپنے لشکر میں بھرتی کیا۔ قصور کو چاروں اطراف فصیل کی مدد سے محفوظ بنایا اور قلعے میں اتنا سامان جمع کر لیا کہ لمبے محاصرے تک کام آسکے۔ اُس نے ملتان کے نواب مظفر خان سے تربیت یافتہ سپاہی اور بڑی تعداد میں ساز و سامان بھی طلب کیا۔ رنجیت سنگھ نے اپنے بااعتماد مشیر فقیر عزیز الدین کو پٹھان نواب کے پاس بھیجا تا کہ اسے بتایا جاسکے کہ مذہب کے نام پر جنگوں کے دن گزر چکے اور اسے چاہئے قصور پر حکومت اور لاہور دربار سے وابستگی جاری رکھے۔ قطب الدین نے یہ کہہ کر فقیر کو واپس بھیج دیا کہ چونکہ فقیر ایک کافر کا نمک خوار تھا اس کی کوئی بھی بات لائقِ توجہ نہیں تھی۔

رنجیت سنگھ نے خود اپنی فوج کی قیادت کی۔ اس مرتبہ غازیوں کو انہی کے انداز میں، مذہبی جنون کی شکل میں جواب دینے کے لیے اس نے اکالی پھلا سنگھ کے سر پھرے نہنگ بھی اپنے لشکر میں شامل کیے ہوئے تھے۔

10 فروری 1807 کی صبح لڑائی کا آغاز مسلمان اور سکھ مذہبی جنگجوؤں یعنی غازیوں اور نہنگ کے درمیان مقابلے سے ہوا۔ نہنگوں نے غازیوں کو مورچوں کے پیچھے پناہ لینے پر مجبور کر دیا۔ اس کے بعد توپ خانہ نے پیش قدمی کی۔ ایک ماہ تک سکھ فوج کی توپیں قصور کے قلعے پر گولے داغتی رہیں مگر کوئی فرق نہ پڑا۔ ایک رات سرنگ بنانے کے ماہر سکھ سپاہی قلعے کی مغربی دیوار کی بنیاد تک پہنچنے میں کامیاب ہو گئے اور وہاں بارود کا بڑا سا ڈھیر رکھ دیا۔ علی الصبح اسے آگ دکھائی گئی جس سے قلعے کی دیوار میں بڑا سا شگاف پیدا ہو گیا۔ پھلا سنگھ کے نہنگ اس شگاف سے قلعے پر حملہ آور ہوئے اور مرکزی حصہ پر قبضہ کر لیا۔ قطب الدین فرار ہونے کی کوشش میں گرفتار کر لیا گیا اسے رنجیت سنگھ کے روبرو پیش کیا گیا۔

رنجیت سنگھ نے ایک بار پھر اسی فراخدلی کا مظاہرہ کیا جس کی وجہ سے کامیابی ہمیشہ اس کا مقدر بنی اور وہ لوگوں کا صحیح معنوں میں رہنما کہلایا۔ رنجیت سنگھ نے قطب الدین کی کافر سکھوں کے خلاف تقریروں، اس کی غدارانہ فطرت اور بار بار لاہور دربار کا تختہ الٹنے کی کوششوں کو فراموش کرتے ہوئے نہ صرف اس کو معاف کر دیا بلکہ دریائے ستلج کے اس پار ممدوٹ کے مقام پر بڑی جاگیر بھی عطا کی۔

رنجیت سنگھ ملتان کے نواب مظفر خان کو قطب الدین کی مدد کرنے پر معافی دینے کو تیار نہ تھا۔ قصور سے اس کی فوج کو جنوب کی سمت میں ملتان کی طرف بڑھنے کا حکم ملا۔ مظفر خان نے اپنے مسلمان پڑوسیوں سے مدد مانگی مگر کوئی بھی اسے نیک مشورے سے زیادہ کچھ بھی دینے کو تیار نہ تھا۔ جب درباری فوج شہر میں داخل ہوئی تو اس نے ہتھیار ڈال دیئے اور قطب الدین کی مدد کرنے کے جرمانے کے عوض رنجیت سنگھ کی خدمت میں بیس ہزار روپے پیش کیے۔

رنجیت سنگھ ملتان سے واپس لاہور پہنچا تو پٹیالہ سے ایک بلاوا اس کا منتظر تھا۔ صاحب سنگھ کی بیوی، آس کور نے اسے

پٹیالہ آ کر اس کے اور اس کے شوہر کے درمیان ایک تنازعہ حل کرنے کی درخواست کی تھی۔ وہ چاہتی تھی کہ اس کا بیٹا کرم سنگھ باپ کی زندگی میں ہی ریاست کے انتظامی امور اپنے ہاتھ میں لے۔ ظاہر ہے اس پر صاحب سنگھ راضی نہ تھا۔ رنجیت سنگھ ایک بڑی فوج لے کر پٹیالہ کی طرف روانہ ہوا۔ ملاوہ کے سرداروں نے ایک بار پھر اس کی اطاعت کو تسلیم کرتے ہوئے قیمتی تحائف اور نقد رقم اس کے حضور پیش کی۔ رنجیت سنگھ کا فیصلہ ایک محتاط راضی نامہ کی شکل میں سامنے آیا: صاحب سنگھ جب تک زندہ ہے ریاست کا مہاراجا رہے گا جبکہ اس کے بیٹے کرم سنگھ کو سالانہ 50 ہزار کی جاگیر کے برابر آمدنی پیش کی جائے گی۔ دونوں فریقوں نے رنجیت سنگھ کی ثالثی قبول کی اور اس کی فیس بھی ادا کی: راجا نے قیمتی پتھروں کی شکل میں 70 ہزار روپے ادا کیے، جبکہ مہارانی نے تانبے کی بنی توپ پیش کی۔ اجلاس میں موجود سرداروں نے بھی نذرانے پیش کیے۔ ان میں کیتھال، شاہ آباد، شاہ پور اور انبالہ کے سردار شامل تھے۔

واپسی کے سفر میں رنجیت سنگھ نے راستے میں پڑنے والے ایک شہر نارائن گڑھ کے محاصرے کا حکم دیا۔ یہ شہر سرمور کی ریاست میں آتا تھا جس کے راجا نے حکومتِ لاہور کو تسلیم کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ راجا نے حیران کن انداز میں ڈٹ کر مزاحمت کی اور رنجیت سنگھ کا پسندیدہ کمانڈر فتح سنگھ کالیانوالہ جو فوج کشی کی سربراہی کر رہا تھا دو سینئر افسروں کے ہمراہ اس حملے میں کام آ گیا۔ خاصے نقصان کے بعد نارائن گڑھ کو فتح کر لیا گیا تاہم سرمور کا راجا پہاڑیوں کی طرف فرار ہونے میں کامیاب ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے نوشہرہ، موریندا اور باہلو پور کے راستے لاہور واپسی کا سفر جاری رکھا۔ سفر کے دوران ہی اس نے اپنے ایک اور دیرینہ ساتھی اور ڈلیوالیہ مثل کے سربراہ تارا سنگھ گھیبا کی موت کی خبر سنی۔ تارا سنگھ پٹیالہ جاتے ہوئے رنجیت سنگھ کے ہمراہ تھا۔ رنجیت سنگھ نے واپس جا کر اس کے انتقال پر تعزیت کی۔ اس نے تارا سنگھ کی بیوہ اور اس کے خاندان کے لیے معقول ماہانہ پنشن مقرر کی اور اس کی فوج کو دربار کی فوج میں ضم کرنے کا اعلان کیا۔ اس کی جاگیر جس کی سالانہ آمدنی سات لاکھ روپے تھی اور جو نوشہرہ، نکودر اور راہن تک پھیلی ہوئی تھی کو بھی دربار میں ضم کر دیا۔

ڈلیوالیہ کا انتظام و انصرام دیوان محکم چند کو سونپ دیا گیا جس نے اسی برس رنجیت سنگھ کے دربار میں نوکری حاصل کی تھی۔ دیوان اس سے قبل بھنگیوں کے ہاں کام کر چکا تھا اور ماضی میں دربار کی فوجوں کے خلاف دو مرتبہ جنگ میں حصہ بھی لے چکا تھا۔ رنجیت سنگھ اس کی جنگی حکمت عملی اور سوجھ بوجھ سے بہت متاثر تھا۔ رنجیت سنگھ نے اسے اپنے پیدل دستوں اور گھڑ سوار فوج کے سپہ سالار کے عہدے کی پیش کش کی اور شمال مشرق میں راجپوت سرداروں کی سرکوبی کے لیے روانہ کیا۔ چند ماہ کی مختصر مدت میں دیوان نے پٹھان کوٹ، جاسروتہ، چمبا اور بسولی کو زیرِ نگیں کر لیا۔ اس نے مہاراجا کو مشورہ دیا کہ وہ دربار عام کا اعلان کرے اور اس میں تمام سرداروں کو شاہی خلعت پیش کرے۔ یہ ایک سوچا سمجھا اقدام تھا کیونکہ اس دعوت کو قبول کرنے سے انکار کا مطلب تھا دربار کی فرمانروائی سے انکار۔

تمام راجوں، مہاراجوں، شہزادوں اور سرداروں کو دعوت نامے بھجوائے گئے۔ دربار میں آنے والے تمام معزز مہمانوں

کوخلعت فاخرہ پیش کی گئی اور انھیں دربار کی طرف سے اپنے اپنے علاقوں میں حکومت جاری رکھنے کی اجازت دی گئی۔اس رسمی کارروائی کے بعد رنجیت سنگھ اور فتح سنگھ اہلیا نوالہ نے ان گنتی کے چند سرداروں کے خلاف کارروائی کا فیصلہ کیا جنھوں نے رنجیت سنگھ کی دعوت کو نظر انداز کر دیا تھا۔سیالکوٹ پر تین روزہ محاصرے کے بعد قبضہ کرلیا گیا۔اکھنوڑ نے بغیر لڑائی کے دربار کی اطاعت قبول کر لی۔ گجرات کے بھنگیوں نے صاحب سنگھ بیدی کو بیچ میں ڈال کر جان بخشی کرالی۔کنہیاؤں کو بھی جن کی ایک بیٹی کی رنجیت سنگھ کے جانشین سے شادی ہونا تھی تھوڑا سا نذرانہ ادا کیا۔ان کی جاگیر کا ایک حصہ وصول کرنے کے بعد انھیں بھی معاف کر دیا گیا۔اس برس کی آخری بڑی فتح شیخوپورہ کے قلعہ پر قبضہ کرنا تھا۔شیخوپورہ کا قلعہ پنجاب کے ان تین قلعوں میں سے ایک تھا جس پر سخت مخالف قوت کا قبضہ تھا اور اس کو دربار کے ساتھ وابستہ کرنا اس لیے بھی ضروری تھا کہ یہ دارالحکومت لاہور سے صرف 20 میل کے فاصلے پر تھا۔

دو برس کی مسلسل فوج کشی نے بہت سے علاقوں کو دربار کے ساتھ جوڑ دیا۔ان کے انتظام وانصرام کو ایک خاص ترتیب میں لانا اور مالی معاملات کو مربوط کرنا ضروری ہوگیا تھا۔اب تک رنجیت سنگھ کے مالی معاملات کی دیکھ بھال امرتسر کے مقامی بینک کا سربراہ رام نند کر رہا تھا۔رنجیت سنگھ نے شاہ زمان کی خدمت میں مامور منیم دیوان بھوانی داس کی خدمات بھی حاصل کیں۔بھوانی داس نے بڑے بڑے شہروں میں شاہی خزانے کے دفاتر قائم کیے اور حساب کتاب کا باقاعدہ نظام متعارف کرایا۔تاہم اس کی ایمانداری حساب کتاب میں اس کی مہارت کے مقابلے میں کہیں کم تھی اور اس حوالے سے اُس کی کئی مرتبہ سرزنش بھی کی گئی۔سوہن لال کے الفاظ میں ''اس کبڑے کی کُب بدعنوانیوں اور شیطانیوں سے بھری ہوئی تھی''۔

مہاراجا کے حرم اور دربار میں آنے والے ملاقاتیوں کی تعداد میں اضافہ ہوتا جا رہا تھا اور اس بات کی ضرورت بھی محسوس کی گئی کہ دربار میں ایک معتمد خاص ہونا چاہئے۔رنجیت سنگھ کی نظرِ انتخاب میرٹھ سے تعلق رکھنے والے برہمن نوجوان خوشحال چند پر پڑی جو کہ دربار کی فوج کا ایک سپاہی تھا۔خوشحال چند کو "جمعدار" جو کہ رنجیت سنگھ کے ذاتی محافظ کا عہدہ تھا کے طور پر ترقی دی گئی اور بعد ازاں اُسے ''ڈیوڑھی دار'' یعنی شاہی محل کا نگران بنا دیا گیا یہ ایک اہم منصب تھا کیونکہ ہر اس شخص کو جو مہاراجا سے ذاتی حیثیت میں ملنا چاہتا تھا پہلے ڈیوڑھی دار سے اجازت لینا ہوتی تھی۔اس منصب کے رکھوالے کی حیثیت سے اسے نہ صرف اچھی خاصی سیاسی قوت حاصل ہوگئی بلکہ تحائف کی شکل میں اس کی آمدن میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہونے لگا۔خوشحال چند نے سکھ دھرم اپنا لیا اور اب اسے جمعدار خوشحال سنگھ کہا جانے لگا۔اُس نے دربار میں اپنے دو رشتہ دار بھی متعارف کرائے؛ایک بھتیجا تیج سنگھ (جس نے رنجیت سنگھ کی موت کے بعد سکھ فوج کے کمانڈر کی حیثیت سے انگریز۔سکھ جنگ میں غداری کی) اور چھوٹا بھائی، رام چند جس نے سکھ مذہب اختیار کرنے کے بعد اپنا نام رام سنگھ رکھ لیا تھا۔برہمن خاندان نے دربار پر تباہ کن اثر ڈالا۔خوشحال سنگھ کا انتخاب ان خال خال واقعات میں سے ایک تھا جب رنجیت سنگھ نے لوگوں کی صلاحیتیں پرکھنے میں غلطی کی۔

7

دوست اور دریا

رنجیت سنگھ کے پنجاب کا مہاراجا بننے کے ابتدائی عشرے کے دوران ہی ریاست کی سرحدوں پر صورتحال خاصی تبدیل ہو چکی تھی۔ اُس کی سلطنت کو درپیش خطرات میں سے اکثر دم توڑ چکے تھے۔ افغان قوم اندرونی ریشہ دوانیوں میں الجھی ہوئی تھی۔ شمال میں راجپوت اور جنوب میں گورکھے ایک دوسرے کے خلاف برسرِ پیکار تھے اور اس بات کا دور دور تک امکان نہیں تھا کہ وہ متحد ہو کر پنجاب کے پہاڑی علاقوں میں رنجیت سنگھ کے لیے کسی قسم کے خطرے کا باعث بنیں۔ مرہٹے جنھوں نے جارج تھامس سے حساب کتاب چکتا کیا تھا اب خود انگریزوں کے دیئے ہوئے زخم چاٹ رہے تھے۔ صرف انگریز ہی تھے جو ایک واحد قابلِ ذکر بیرونی قوت کے طور پر موجود تھے اور سندھ اور پنجاب کے علاوہ پورے ہندوستان پر ان کا قبضہ تھا۔

رنجیت سنگھ دریائے ستلج کے شمال میں پنجاب کے بڑے حصے پر اپنا قبضہ مضبوط کر چکا تھا۔ قصور کے پٹھانوں کا وہ خاتمہ کر چکا تھا، ملتان اور شمال مغربی پنجاب کی ریاستوں سے خراج وصول کر رہا تھا اور اس علاقے کی چھ مثلوں کو دربارِ لاہور میں ضم کر چکا تھا۔ اب پنجاب کو ایک آزاد اور خود مختار ریاست میں تبدیل کرنے کے لیے دریائے ستلج اور جمنا کے درمیانی علاقوں میں موجود چھ مثلوں کو ریاستِ لاہور میں ضم کرنا باقی رہ گیا تھا۔ اپنے دورِ حکومت کے ابتدائی دس برسوں میں اسے دو بڑے کام کرنا تھے: انگریزوں کے زیرِ نگرانی علاقوں کے ساتھ ملحقہ ریاستِ پنجاب کی سرحدوں کی حد بندی اور ستلج، جمنا کے درمیانی علاقوں کا پنجاب کے ساتھ الحاق۔

رنجیت سنگھ دو مرتبہ پہلے بھی ستلج کے اس پار جا چکا تھا۔ وہاں کے لوگ اسے پنجاب کا نجات دہندہ کہتے تھے البتہ ان ریاستوں کے راجوں کو ایسا کہنے میں ہچکچاہٹ محسوس ہوتی تھی۔ اگرچہ انھوں نے اس کے احکام کی بجا آوری میں اسے خطیر نذرانے بھی پیش کیے تھے مگر اس انداز میں جیسے کسی بیرونی آقا کی خدمت میں کچھ پیش کر رہے ہوں۔ ملاوی قوم اُسے عملی طور

پر اپنا مہاراجا تسلیم کرتی تھی تاہم اس کا باقاعدہ اعلان ہونا باقی تھا۔ ادھر ستلج اور جمنا کے مشرق میں موجود انگریزوں کی طرف سے بھی اس نئی ترکیب کو قبول کرنا ابھی باقی تھا۔

رنجیت سنگھ کے علاوہ پر دعوئی میں واحد کمزور عنصر وہ تجویز تھی جو اس نے لارڈ لیک کو 1805 میں دی تھی۔ ہوا یوں تھا کہ ہولکر کے ساتھ لڑائی میں لارڈ لیک ہولکر کا تعاقب کرتے ہوئے مشرقی پنجاب کے میدان عبور کرتا آندھی اور طوفان کی رفتار سے چلا آرہا تھا کہ رنجیت سنگھ نے اس خوف سے کہیں ہولکر کو شکست دینے کے بعد وہ (لارڈ لیک) پنجاب پر نہ چڑھ دوڑے اسے تجویز دی کہ دریائے ستلج کو دونوں ریاستوں کے درمیان سرحد کے طور پر تسلیم کرلیا جائے۔ لیکن اس وقت نہ تو لیک اور نہ ہی گورنر جنرل نے اس کی تجویز پر کان دھرے۔ ان کا واحد مقصد مرہٹوں کو شکستِ فاش دینا تھا۔ ایک مرتبہ یہ مقصد حاصل ہوجائے تو ایسٹ انڈیا کمپنی کی جو کہ مرہٹوں کے خلاف فوجی مہم میں دیوالیہ ہونے کے قریب پہنچ چکی تھی سخت ہدایات کی روشنی میں کسی اور جنگ یا مہم جوئی کا کوئی امکان نہیں تھا اور کمپنی کے احکامات کے مطابق دریائے جمنا مغربی ہندوستان میں انگریزوں کے زیرِ نگیں علاقوں کی آخری سرحد تھی۔

1805 (جب مرہٹوں کے خلاف فوجی مہم کا خاتمہ ہوا) اور 1808 کے درمیانی عرصہ میں ستلج اور جمنا سے بہت سا پانی گزر چکا تھا۔ رنجیت سنگھ نے پھر سے پنجاب کی ریاست اور سکھوں کے مہاراجا کا خطاب استعمال کرنا شروع کر دیا اور دو مرتبہ ملاوی ریاستوں کا دورہ کر کے اپنے اس دعوے کو سچ بھی ثابت کیا دوسری طرف ملاوی ریاستوں سے بھی اس کے خلاف کسی قسم کا احتجاج دیکھنے کو نہیں ملا۔ لیکن ان تین برسوں میں ملاوی ریاستوں نے ایک بار پھر اپنے صندوق اور تجوریاں بھر لی تھیں اور نئی فوجی مہمات کے لیے تیار بیٹھی تھیں۔

1807 میں تارا سنگھ گھیبا کے مرنے کے بعد اس کی ریاست کو دربارِ لاہور میں ضم کرنے کے رنجیت سنگھ کے اقدام نے ملاوی سرداروں میں ہل چل مچادی تھی۔ اس اقدام نے انھیں ایک ٹھوس ثبوت مہیا کر دیا تھا (اگر ثبوت کی واقعی ضرورت تھی) کہ وہ ریاستوں کے سرداروں کو محض پنشنرز کے مقام تک محدود کر دینا چاہتا ہے۔ گھیبا کی ریاست کو غصب کرنے کے تھوڑے ہی عرصہ بعد محکم چند نے ایک جنگی مہم کی قیادت کرتے ہوئے جارحانہ انداز میں ستلج کو عبور کیا اور آنند پور، مکھووال اور ونڈی (جو کہ فیروز پور کے نزدیک واقع ایک گاؤں ہے) سمیت پندرہ دیہاتوں کو دربارِ لاہور میں ضم کر دیا۔ اس مہم نے ملاوی سرداروں کے خدشات کو پریشانیوں میں تبدیل کر دیا اور انھوں نے اُس واحد قوت کی طرف مدد کے لیے رجوع کیا جو اُن کے اور ان کے خاندانوں کے محلات اور مراعات کو محفوظ کر سکتی تھی یعنی انگریز۔ صورتحال ان کے حق میں یکلخت پلٹا کھا چکی تھی۔ تاہم جو واقعات اِس صورتحال میں اس یکلخت تبدیلی کا باعث بنے وہ نہ تو ستلج کے کنارے وقوع پذیر ہوئے اور نہ ہی جمنا کے بلکہ دریائے ٹیمز (لندن) اور دریائے سین (پیرس) کے کنارے۔ فرانس کا نپولین بونا پارٹ یورپ کے اُفق پر یکا یک ایک بڑی طاقت بن کر ابھرا تھا۔ تمام یورپی ممالک ایک ایک کر کے اس کے سامنے گھٹنے ٹیکتے جا رہے تھے: آسٹرلٹز کے مقام پر

آسٹریا، جینا کے مقام پر پروشیا (جرمنی)، فریڈلینڈ کے مقام پر روس۔ روس کے زار الیگزنڈر اور بونا پارٹ کے درمیان ہونے والے معاہدے کے مطابق اگر برطانیہ نے فرانس کے خلاف جارحیت کا آغاز کیا تو روسی فوجیں فرانس کا ساتھ دیں گی۔ اگرچہ سمندروں پر برطانوی نیوی کا قبضہ تھا لیکن ایران، افغانستان، سندھ اور پنجاب سے ہندوستان کی طرف جانے والے زمینی راستوں پر فرانسیسی اور اور روسی افواج پنجے گاڑھے بیٹھی تھیں۔ برطانوی حکومت نے دریائے جمنا کو بطور مغربی سرحد تسلیم کرنے کی اپنی پالیسی پر نظر ثانی کا فیصلہ کر لیا تھا۔ لارڈ منٹو جو 1807 میں ہندوستان کا گورنر جنرل مقرر ہوا اس نے اپنی فوجوں کو کرنال تک پیش قدمی کا حکم دیا تا کہ دہلی کو شمال کی طرف سے آنے والے حملہ آوروں سے بچایا جا سکے۔ گھڑ سواروں کو ہریانہ میں گشت پر مامور کر دیا گیا۔ پھر ایک بڑی حکمت عملی کے تحت ممکنہ فرانسیسی و روسی حملے کے پیش نظر مختلف ممالک میں مختلف مقامات پر بند تعمیر کیے جانے کے سلسلے کا آغاز ہوا۔ یہ بند ایران، افغانستان، سندھ اور پنجاب میں تعمیر کیے جانے تھے۔ فوری طور پر چار سفارتی وفود روانہ کیے گئے: مالکولم کو ایران، ایلفنسٹن کو کابل، پوٹنگر کو سندھ اور میٹکاف کو رنجیت سنگھ کے ساتھ مذاکرات کے لیے منتخب کیا گیا۔

تاج برطانیہ کو ایک وفد لاہور بھیجے جانے کا خیال سب سے پہلے 1808 میں آیا جب برطانوی خفیہ ایجنسیوں نے اطلاع دی کہ رنجیت سنگھ دریائے گنگا میں غسل کے لیے ہندوؤں کے مقدس مقام ہردوار آ سکتا ہے۔ برطانوی حکومت نے رنجیت سنگھ کی ممکنہ آمد اور قیام کو زیادہ سے زیادہ آرام دہ اور پر مسرت بنا کر اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھانے اور اس بنا پر تختِ لاہور سے مستقبل میں تعلقات استوار کرنے کا فیصلہ کیا 1۔ مہاراجا کا استقبال کرنے کے لیے منکاف کا انتخاب کیا گیا۔ اُس کو دی گئی ہدایات برطانوی حکومت کا ہندوستان کی شمالی سرحد کے بارے میں موقف واضح کرتی ہیں۔ منکاف کو حکم دیا گیا کہ دریائے جمنا کے کنارے جا کر رنجیت سنگھ کا انتظار کرے۔ واپسی کے سفر پر بھی اس نے مہاراجا کو ''برطانوی سرحد'' تک چھوڑنا تھا جس کی حد دریائے جمنا کے کنارے پر ختم ہو جاتی تھی۔ رنجیت سنگھ نے آخری لمحے اپنا ہردوار کا دورہ منسوخ کر دیا اور نتیجتاً منکاف کو خود پنجاب جانا پڑا۔

اس دوران ملاوی سردار سمانا میں اکٹھے ہوئے اور مستقبل پر تبادلہ خیال کیا۔ اجلاس کی متفقہ رائے میں برطانوی فوجیں جو پہلے ہی شمال میں جمنا کے کنارے تک پہنچ چکی تھیں وقت کے ساتھ ساتھ اس سمت میں مزید آگے بڑھیں گی ان کے مطابق انگریز فوج قوت میں رنجیت سنگھ کی فوجوں سے کہیں زیادہ تھی۔ اجلاس کی رائے میں برطانوی راج میں اُن کا اور ان کے جانشینوں کا مقام، مرتبہ اور ذاتی مراعات محفوظ رہیں گے جبکہ رنجیت سنگھ کے اُن کی ریاستوں پر قبضے کی صورت میں انھیں ان تمام آسائشوں سے محروم کر دیا جائے گا۔ ایک معزز بزرگ نے ملاوی سرداروں کے جذبات کا ان الفاظ میں اظہار کیا: "ہم طویل عرصہ تک اقتدار میں رہنے والے نہیں کیونکہ تاج برطانیہ اور رنجیت سنگھ دونوں ہمیں نگلنا چاہتے ہیں۔ لیکن (برطانوی حکومت کی طرف سے دیا جانے والا) تحفظ تپ دق کے مرض کی طرح ہے جو مارنے میں وقت لیتا ہے جبکہ رنجیت سنگھ کا

برسرِ اقتدار آنا فالج کے حملے کی ایک شکل ہوگا اور ہمیں گھنٹوں میں تباہ و برباد کر دے گا۔" اجلاس نے ایک وفد کو دہلی میں برطانوی ریذیڈنٹ کے پاس بھیجنے کا فیصلہ کیا۔

وفد میں جند، کیتھال اور جگادھری کے سردار اور پٹیالہ اور نابھا کے نمائندے شامل تھے۔ رنجیت سنگھ کو ملاوی سرداروں کے منصوبے کا علم ہوا تو اس نے اپنے نمائندے کو بھیجا کہ وہ بھی دہلی جائے اور ملاوی سرداروں کے وفد اور برطانوی ریذیڈنٹ کے درمیان ملاقات کی بابت اسے آگاہ کرے۔ ملاوی وفد اور برطانوی ریذیڈنٹ کے درمیان تین چار ملاقاتیں ہوئیں مگر ہر مرتبہ رنجیت سنگھ کا نمائندہ اس ملاقات میں موجود ہوتا جس کے باعث دونوں طرف سے سرحدی صورتحال پر ایک جملے کا بھی تبادلہ نہیں ہو سکا۔ رنجیت سنگھ کا نمائندہ یہ سمجھتے ہوئے کہ اس کے آقا کے خدشات بے بنیاد ہیں دہلی سے گیا کی طرف یاترا پر روانہ ہو گیا۔ اس کے روانہ ہوتے ہی وفد کے اراکین برطانوی ریذیڈنٹ کی خدمت میں حاضر ہوئے اور ایک لمبی چوڑی یادداشت کے ذریعے رنجیت سنگھ کے خلاف تحفظ فراہم کرنے کی اپیل کی۔ برطانوی ریذیڈنٹ سیٹن نے اس یادداشت کو آگے گورنر جنرل کو ارسال کر دیا۔ چونکہ کمپنی ابھی تک ''جمنا سے آگے نہیں'' کی پالیسی پر قائم تھی گورنر جنرل نے وفد کو سرکاری طور پر نظرانداز کرنے کا فیصلہ کیا۔ وفد کے اراکین نے دو ماہ تک دہلی میں انتظار کیا اور بالآخر بغیر کسی یقین دہانی کے جس کی امید میں وہ دہلی آئے تھے واپس پنجاب روانہ ہو گئے۔ اب انہیں رنجیت سنگھ کی طرف سے متوقع شدید ردِعمل کا انتظار تھا۔ رنجیت سنگھ نے ملاوی سرداروں کو امرتسر مدعو کیا اور یقین دہانی کرائی کہ وہ ان کی ریاستوں کو دربار میں ضم نہیں کرے گا اور انھیں اپنے مساوی حکمران کا درجہ دے گا۔ ملاوی سردار رنجیت سنگھ کے خیمے (گروپ) میں آنے پر رضامند ہو گئے۔ ''شیر اور بھیڑیے کے درمیان انھیں زیادہ خطرناک درندے سے معاملات طے کرنا تھے''۔ 2

مٹکاف جولائی 1808 کے آخری ہفتے میں پنجاب کے لیے روانہ ہوا3۔ گورنر جنرل کی طرف سے اسے واضح ہدایات ملی تھیں کہ اُس نے رنجیت سنگھ پر باور کرنا ہے کہ برطانوی حکومت کا ملاوی ریاستوں پر کوئی دعویٰ نہیں۔ اس نے واضح کیا کہ وہ رنجیت سنگھ کی طرف سے اس سمت میں آگے بڑھنے کی راہ میں حائل نہیں ہوں گے'' کیونکہ ایسا کرنے سے ہم پر دفاعی اتحاد کے معاہدہ کے تحت تاجِ برطانیہ سے غیر منسلک ریاستوں کے دفاع کی ذمہ داری آن پڑے گی'' اس کے علاوہ برطانوی حکومت مذکورہ ریاستوں کے حوالے سے رنجیت سنگھ کے جارحانہ عزائم میں براہِ راست رکاوٹ نہیں بننا چاہتی اور جب تک یہ واضح نہیں ہو جاتا کہ برطانوی حکومت کو اپنے مفادات کے تحفظ کی خاطر رنجیت سنگھ کے مفادات کا کتنا احترام کرنا ہے اس بات کا فیصلہ کرنا آسان نہ ہوگا کہ برطانوی حکومت کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے کون سی قربانی دینا چاہئے اور کون سی نہیں 4۔ قصہ مختصر شطرنج کے اس کھیل میں ملاوہ کی حیثیت پیادے سے زیادہ کی نہ تھی۔

رنجیت سنگھ یہ ماننے پر تیار نہیں تھا کہ برطانوی حکومت کا یہ سب کرنے کا مقصد ممکنہ فرانسیسی چڑھائی سے خود کو محفوظ کرنا ہے کیونکہ فرانس کی طرف سے انڈیا پر حملے کی کوئی شہادت موجود نہیں تھی اور بہرحال فرانس بہت دور واقع تھا۔ فرانسیسی حکومت

نے اُس سے یا سندھیوں وافغانیوں سے اس حوالے سے رابطہ کرنے کی کوشش بھی نہیں کی تھی۔ دوسری طرف برطانوی حکومت اپنا ایک سفیر کابل بھیج رہی تھی تاکہ افغانیوں کے ساتھ جو کہ پنجابیوں، خصوصاً سکھوں کے روایتی دشمن تھے اور جن کے ساتھ رنجیت سنگھ مسلسل تصادم کی حالت میں رہتا تھا اتحاد قائم کیا جا سکے۔ انگریز سندھ کے امیر کے پاس بھی ایک سفیر بھیج رہے تھے وہ بھی ایک ایسے وقت میں جب رنجیت سنگھ اُس سمت میں اپنی ریاست کی سرحدیں سمندر تک بڑھانے کے منصوبے کا جائزہ لے رہا تھا۔ دوسری طرف اس کے پاس یہ اطلاعات بھی تھیں کہ انگریز ایجنٹس ملاوہ کے سرداروں کو اس بات پر قائل کرنے میں لگے ہوئے تھے کہ وہ اپنی درخواست کو نئے سرے سے دائر کریں کیونکہ برطانوی حکومت انھیں اس طرح کا تحفظ فراہم نہیں کر سکتی۔ یہ بات واضح تھی کہ انگریز چاہے انھیں مطلوبہ تحفظ فراہم نہ کریں وہ اُن کی جانب سے اس طرح کی درخواست دائر کرنے کے مخالف بھی نہیں تھے اور وقت آنے پر اس درخواست کو رنجیت سنگھ کے ساتھ سودے بازی کے طور پر استعمال کیا جا سکتا تھا۔

رنجیت سنگھ نے فقیر عزیز الدین کے بھائی حکیم امام الدین کو مٹکاف کا استقبال کرنے کے لیے پٹیالہ بھیجا؛ اس سے مٹکاف کو یہ بتانا مقصود تھا کہ وہ انگریزوں کے زیرِ انتظام علاقے سے رنجیت سنگھ کی سرزمین پر آ گیا ہے۔ رنجیت سنگھ نے ملاوہ کے چند سرداروں کو بھی جن میں اس کا چچا جند کا سردار بھاگ سنگھ، کیتھل کا سردار لال سنگھ بھی شامل تھے لاہور بلوالیا۔ مٹکاف نے ان سرداروں کی اپنی ریاستوں سے غیر حاضری اور رنجیت سنگھ کے دربار میں موجودگی کو اپنے مشن کے لیے برا شگون خیال کیا اور انھیں برطانوی حکومت کو ناخوش کرنے کے فطری نتائج سے خبردار کیا5۔ اس نے ان تمام دوسرے سرداروں کو ملاقات کا موقع دیا اور رنجیت سنگھ کے خلاف ان کی گفتگو سنی۔ پٹیالہ کے صاحب سنگھ نے ملاقات کے دوران ڈرامائی انداز میں اپنے قلعے کی چابیاں برطانوی نمائندے کے حوالے کیں اور اس سے درخواست کی کہ وہ چابیاں اسے واپس کر دی جائیں اس طرح علامتی طور پر وہ پٹیالہ کے لیے انگریزوں کا تحفظ حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا۔ ''یہ عمل سراسر غیر ضروری تھا'' مٹکاف نے بعد میں اپنی رپورٹ میں لکھا۔ ''تاہم میں نے اپنی طرف سے اسے یقین دلانے کی بھرپور کوشش کی کہ برطانوی حکومت اس کے جذبات کو قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہے''۔6

ملاوہ سرداروں نے رنجیت سنگھ اور انگریزوں کو ایک دوسرے سے لڑانے کی کوششیں ایک بار پھر شروع کر دی تھیں۔ انھوں نے رنجیت سنگھ کو بتایا کہ انگریز اس کی ریاست کو ہندوستان میں ضم کر دینا چاہتے ہیں۔ دوسری طرف انھوں نے مٹکاف کو بتایا کہ رنجیت سنگھ برطانوی فوج کے ساتھ جنگ کی خاطر فوج منظم کر رہا ہے۔ امام الدین کی یہ یقین دہانی کہ فوج کو اس کی آمد سے بہت پہلے طلب کر لیا گیا تھا اور وہ ملتان اور بہاولپور کی طرف رواں دواں تھی بھی مٹکاف کے خدشات کم نہ کر سکی۔ دونوں طرف کا ماحول شک اور بے اعتباری کی وجہ سے آلودہ ہو چکا تھا۔

رنجیت سنگھ نے اپنے وزیروں کا اجلاس طلب کیا۔ اسے بتایا گیا کہ انگریزوں کے ساتھ بات چیت کرنے کا فن صرف ایک شخص کو آتا ہے اور وہ فتح سنگھ اہلیا نوالہ کا ملازم پربھ دیال ہے۔ پربھ دیال کو دربار لاہور کی جانب سے فقیر عزیز الدین اور مٹھ سنگھ کی مٹکاف کے ساتھ مذاکرات میں معاونت کرنے کو کہا گیا۔ 7

نوجوان سکھ فرمانروا (27 برس) اور اس سے بھی کم عمر برطانوی سفیر (24 برس) کے درمیان پہلی ملاقات قصور کے قریبی گاؤں کھیم کرن میں 12 ستمبر 1808 کو ہوئی۔ مٹکاف آغاز سے ہی جارحانہ انداز اپنائے ہوئے تھا۔ اسے پٹیالہ میں اپنے استقبال کے لیے امام الدین کو دیکھ کر ناگواری کا احساس ہوا تھا اسی طرح رنجیت سنگھ کے ساتھ ملاقات سے پہلے دیوان محکم چند اور فتح سنگھ سے ملنا بھی اسے برا لگا تھا۔ اسے لاہور سے دور قصور کے مقام پر پرتکلف انتظامات کے بغیر اس طرح پھیکی پھیکی ملاقات پسند نہیں آئی تھی۔ اپنے خیموں کو خشک دریا کے کنارے لگا دیکھ کر اسے مزید برا لگا تھا بغیر موسم کے بادلوں کی گرج چمک بھی اس کے مزاج کو بحال نہ کر سکی۔ وہ بار بار پروٹوکول اور پرتکلف رسمی ملاقات پر اصرار کرتا رہا اور اس سے ہٹ کر ذرا سی بھی بات اسے بطور برطانیہ کے بادشاہ کے نمائندے کے اپنی شان میں گستاخی محسوس ہوتی۔

رنجیت سنگھ نے مٹکاف کا والہانہ استقبال کر کے اس کا غصہ ٹھنڈا کیا۔ وہ اپنے ذاتی خیمے سے باہر نکل کر مٹکاف سے ملا اور اسے اور اس کے وفد کے ارکان کو گلے سے لگایا۔ وہ انھیں شاہی محل کے اندر لے گیا اور اپنی ساتھ والی کرسیوں پر انھیں بٹھایا اور مٹکاف کو ایک ہاتھی، ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا، موتیوں کے ہار اور کشمیری شالیں پیش کیں۔ وفد کے دیگر ارکان کو بھی تحائف پیش کیے گئے۔ اس ملاقات میں کوئی رسمی بات چیت نہیں ہوئی تاہم رنجیت سنگھ نے اپنے مہمان سے یہ پوچھنا ضروری سمجھا کہ آخر کس وجہ سے اُس نے برساتی موسم (ساون) میں ہندوستان کا دورہ کرنا ضروری خیال کیا جب دریاؤں میں طغیانی آئی ہوئی ہے اور سورج گرمی برسا رہا ہے۔ مٹکاف اس براہِ راست سوال کو ٹال گیا۔ جب وفد کے ایک رکن نے کہا کہ انگریزوں کو ان کی اچھی نیت کی وجہ سے جانا جاتا ہے تو رنجیت سنگھ زیرِ لب بولا ''اب ہمیں یہ معلوم ہوگا کہ برطانوی حکومت کا حکم حرفِ آخر ہے۔''

حتیٰ کہ قصور میں بھی مٹکاف نے بغیر کسی تکلف کے ملاوی سرداروں سے ملاقات کی۔ اس بات سے رنجیت سنگھ چڑ گیا اور اس نے مٹکاف کو پیغام بھیجا کہ اسے توقع ہے کہ وہ تین چار دنوں میں واپس چلا جائے گا۔ ''اگرچہ آپ جیسے دوستوں کے ساتھ ملاقاتوں اور باتوں سے دل بھرنے کا نام نہیں لیتا لیکن امور سلطنت پر توجہ دینا بھی ضروری ہے۔ مجھے کچھ اضلاع میں معاملات ٹھیک کرنے کے لیے فوری طور پر نکلنا ہوگا۔ میری قوم میں چاند کی پہلی تاریخ کو گھر سے نکلنا بہت مبارک سمجھا جاتا ہے۔ گورنر جنرل کے ترجمان کی حیثیت سے مجھے آپ سے مل کر بہت مسرت ہوئی۔ میری مصروفیات مجھے مزید ملاقاتوں کا متحمل نہیں بنا سکتیں''۔

مٹکاف نے رنجیت سنگھ کے اس پیغام کو ناجائز طور پر حسد کے اظہار پر مامور جانا۔ رنجیت سنگھ کے نام جواب میں اس نے دونوں ریاستوں کے درمیان اچھے تعلقات کا ایک بار پھر ذکر کیا اور تین روز بعد مٹکاف نے اپنی آمد کے اصل مقصد کا اظہار کیا۔ رنجیت سنگھ کے بھرے دربار میں اس نے ایک بیان پڑھ کر سنایا جس کے مطابق اس کی حکومت کے پاس ایسی اطلاعات تھیں کہ فرانسیسی فوج کی جو ایران میں اپنا اثر و رسوخ قائم کرنا چاہتی ہے نظریں کابل اور پنجاب پر بھی لگی ہیں اور ''تمام ریاستوں کے مشترکہ مفادات کا تقاضا ہے کہ وہ اپنے اپنے علاقوں کے دفاع کی خاطر متحد ہو کر دشمن فوج کو شکست دیں''8

مہاراجا اور اس کے درباریوں نے مٹکاف کی جوشیلی تقریر کی خوب تعریف کی پھر رنجیت سنگھ نے اس سے تفصیلات جاننے کے لیے سوالات کرنے شروع کیے۔

''برطانوی فوج کتنا باہر نکل کر فرانسیسیوں کا مقابلہ کرے گی؟'' اس نے دریافت کیا۔

''کابل سے بھی آگے اگر ضروری ہوا''

''کیا برطانوی فوج اس اقدام کے لیے تیار ہے؟''

''برطانوی فوج ہر وقت تیار رہتی ہے''

''فرانسیسی کب تک ان علاقوں پر حملہ آور ہو سکتے ہیں؟''

''دشمن کس وقت حملہ آور ہو گا یہ بتانا مشکل ہو گا۔''

''اگر ایسا ہے تو ہمارے پاس اس معاملے پر غور کرنے کے لیے خاصا وقت موجود ہے۔''

اس نے پر جوش تقریر کرنے پر انگریز نمائندے کا شکریہ ادا کیا اور تعاون کے لیے اپنی آمادگی کا اظہار بھی اور بتایا کہ اس کی شدید خواہش تھی کہ برطانوی حکومت کے ساتھ اتحاد میں داخل ہو ''میرے دل میں طویل عرصے سے یہ خواہش موجود تھی''، رنجیت سنگھ نے اپنے مشیروں کو بھی مٹکاف سے سوال پوچھنے کو کہا۔

''برطانوی حکومت کا کیا ردِ عمل ہو گا اگر شاہ شجاع فرانسیسی فوجوں میں شامل ہو جائے؟'' ان میں سے ایک نے دریافت کیا۔

''وہ اپنے مفادات سے اتنا بے خبر کیسے ہو سکتا ہے کیونکہ فرانسیسیوں کی تاریخ رہی ہے کہ وہ اپنے اتحادیوں کو آخر کار اپنی رعایا بنا کر ان پر ظلم کرتے ہیں۔ وہ اپنے اتحادیوں کی حکومت ختم کرنے کے بعد وہاں لوٹ مار کرتے ہیں اور پھر اس ملک کو اپنا تابع بنا لیتے ہیں'' مٹکاف نے جواب دیا

''ان تجاویز کے بارے میں ہولکر کا کیا ردِ عمل ہے؟''

''وہ اس وقت برطانوی حکومت کے ساتھ حالتِ امن میں ہے۔''

اس موقع پر پربھ دیال اپنی نشست سے اٹھا اور مہاراجا کے کان میں کچھ کہا اور پھر مٹکاف کو بتایا کہ انھیں سوچنے کے لیے کچھ وقت درکار ہے اور اس کی تجاویز کا جواب اگلے روز دیا جائے گا۔

اگلے روز رنجیت سنگھ کے مشیر مٹکاف سے ملے اور برطانیہ کے مشترکہ دفاع کے نظریے کا خیر مقدم کرتے ہوئے تجویز پیش کی کہ انھیں ایک قدم آگے جا کر ''دونوں ریاستوں میں مضبوط اتحاد قائم کرنا چاہئے اس سے پنجاب میں پھیلی افواہوں کا خاتمہ ہو جائے گا کہ انگریزوں اور راجا کے درمیان لڑائی شروع ہونے کو ہے'' اپنی بات میں وزن پیدا کرنے کے لیے انھوں نے رنجیت سنگھ کی طرف سے گورنر جنرل کے نام لکھے گئے ایک خط کا حوالہ بھی دیا جس میں انگریزوں کو رنجیت سنگھ کے متعلق پالیسی واضح کرنے کو کہا گیا تھا اور مطالبہ کیا گیا تھا کہ اسے تمام سکھوں کا فرمانروا تسلیم کیا جائے۔ مٹکاف کا اس سوال پر مذاکرات کرنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا کیونکہ یہ صرف ایک طرف کے مفادات کا احاطہ کر رہا تھا جبکہ وہ صرف باہمی مفادات کا مینڈیٹ لے کر آیا تھا۔ فقیر عزیز الدین نے اس بات پر اس کی تصحیح کی۔ ایک مشترکہ سرحد کے جھگڑے کا حل دراصل دونوں ریاستوں کے مفاد میں ہے اور اتنا ہی اہم ہے جتنا کہ دونوں ریاستوں کا اتحاد۔ مٹکاف نے یہ کہہ کر اس موضوع کو ٹالنے کی کوشش کی کہ "اس کی حکومت کی سرحدوں کا فیصلہ ہو چکا ہے اور اس کے آگے جانے کے کوئی عزائم نہیں۔''

''حکومتِ برطانیہ نے اپنی سرحدوں کی حد بندی کہاں تک کی ہے؟'' فقیر عزیز الدین نے دریافت کیا

مٹکاف اب بری طرح پھنس چکا تھا۔ انگریز تو دلی سے ساٹھ، ستر میل دور شمال مغرب کی سمت میں کرنال میں بھی اپنا فوجی اڈا قائم کر چکے تھے۔ شاید اس جگہ کو بطور سرحد بیان کرنا ٹھیک رہے گا۔ ''کرنال میں'' مٹکاف نے جواب دیا۔

پربھ دیال نے مٹکاف کو بتایا کہ کرنال کی ریاست کا سردار گردت سنگھ ہے جو مہاراجا رنجیت سنگھ کا پرانا دوست ہے۔ مٹکاف نے اس موضوع سے توجہ ہٹانے کے لیے ایک بار پھر نپولین بوناپارٹ کے مظالم کا ذکر کرنا شروع کر دیا۔ جب وہ خاموش ہوا تو دیوان محکم چند نے ایک تجویز پیش کی جس نے مٹکاف کو حقیقتاً پریشانی سے دوچار کر دیا۔ ''انگریزوں کو کابل کی طرف وفد بھیجنے سے پہلے مہاراجا کے ساتھ ایک معاہدے پر دستخط کرنا ہوں گے'' دیوان نے کہا۔ مٹکاف کے پاس اس کے جواب میں فرانسیسیوں کو برا بھلا کہنے کے علاوہ کچھ نہیں تھا۔ تاہم اگلے روز مہاراجا نے اسے طلب کر کے انگریزوں کی ملاوہ ریاستوں کے حوالے سے پالیسی کے بارے میں دریافت کیا۔ مٹکاف نے براہِ راست جواب دینے کی بجائے انگریزوں کی میانہ روی اور دہلی میں ان کے راج کے حوالے سے باتیں کیں اسی میانہ روی کی وجہ سے وہ اپنی سرحدیں ستلج سے آگے نہیں لے کر گئے۔ تاہم مٹکاف نے خبردار کیا اگر رنجیت سنگھ ان کی واضح پالیسی کے بارے میں جاننا چاہتا ہے اور اسے غیر واضح اور مبہم نہیں رکھنا چاہتا تو اسے اس بات کے لیے تیار رہنا چاہئے کہ گورنر جنرل ستلج کو اپنی سرحد میں شامل کرنے کا اعلان کر سکتا ہے۔ اپنی بات کی کڑواہٹ کچھ کم کرنے کے لیے مٹکاف نے رنجیت سنگھ کو ایک لالچ دیا۔ جو کہ اس کی سفارتکاری کے فن میں مہارت کی عمدہ مثال ہے اس نے رنجیت سنگھ کو بتایا وہ ایک حقیقی دفاعی معاہدے کی تجویز کے ساتھ لاہور آیا تھا لیکن اگر رنجیت

سنگھ اپنی ریاست کو افغانستان تک وسعت دینا چاہتا ہے تو انگریز اس میں کوئی مداخلت نہیں کریں گے۔ مٹکاف کی اس دہری پالیسی کا رنجیت سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہوا کیونکہ اسے علم تھا کہ آنے والے دنوں میں افغان اور انگریز اسی موضوع پر مذاکرات کرنے جا رہے ہیں۔ وہ اپنے مشیروں کی طرف لوٹا اور شدید ناراضگی کے عالم میں اپنے خیمے اکھاڑنے کا حکم دیا۔

اگلی صبح مٹکاف کیا دیکھتا ہے کہ راجا کا قافلہ واپسی کے سفر پر رواں دواں ہے۔ اس نے اپنے منشی کو بھیجا کہ وہ جا کر رنجیت سنگھ سے دریافت کرے کہ وہ کس طرف جا رہا ہے۔ رنجیت سنگھ نے جو اپنی فوج کو اپنی نگرانی میں دریا عبور کرتا دیکھ رہا تھا جواب دیا ''فرید کوٹ'' فرید کوٹ کا انتخاب بہت اہم تھا۔ راجا نے پٹیالہ کے سرداروں کی عملداری کو چیلنج کر دیا تھا اور پٹیالہ کے بیرونی آقا کی حیثیت میں وہ اس ریاست کو واپس اپنی عملداری میں شامل کرنے جا رہا تھا۔

فرید کوٹ پر مہاراجا کا قبضہ ہونے کے ایک روز بعد مٹکاف ایک بار پھر منظر پر نمودار ہوا۔ اپنے استقبال کو آنے والے رنجیت سنگھ کے مصاحبوں سے اس نے ایک بار پھر مذاکرات شروع کرنے کو کہا۔ مذاکرات کے دوران ایک مرتبہ پھر ایک نرم گرم لہجے میں بات ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے مٹکاف پر واضح کیا کہ وہ اگلے آٹھ روز تک فرید کوٹ میں رہے گا اور اس دوران انگریز نمائندہ جب چاہے اس سے مل سکتا ہے۔ اس کا کہنا تھا کہ آٹھ دن کا عرصہ خاصا طویل ہوتا ہے۔ مٹکاف نے جواب دیا اگر راجا چاہے تو ایک دن بھی کافی ہے، اور اگر نہ چاہے تو سو دن بھی بیکار ہیں۔ رنجیت سنگھ نے کہا اسے یہ سن کر خوشی ہوئی ہے کہ بات چیت کے لیے صرف ایک دن چاہیے۔ کیا انگریز مہمان اپنی تجاویز واضح کرنا پسند کرے گا؟

جو دستاویز مٹکاف نے راجا رنجیت سنگھ کی خدمت میں پیش کی وہ تین اہم دفعات پر مشتمل تھی۔ فرانسیسی حملے کی صورت میں مشترکہ جنگی حکمت عملی، فرانسیسی فوج سے مڈبھیڑ کی صورت میں انگریز/برطانوی دستوں کے لیے پنجاب سے سرحد کی طرف محفوظ راستہ اور جنگ کے دریائے سندھ کے پار چھڑنے کی صورت میں پنجاب میں جنگی ساز و سامان پر مبنی ڈپوؤں اور چوکیوں کا قیام۔

تین روز بعد دربار کی طرف سے جوابی تجاویز مٹکاف کے حوالے کی گئیں۔ یہ دستاویز بھی تین دفعات پر مشتمل تھی: انگریز دربار کو سب سے زیادہ پسندیدہ ریاست کا درجہ دیں گے اور دربار انگریزوں کو (افغانیوں کو یہ درجہ نہیں دیا جائے گا، نہ ہی انگریز بہاولپور یا ملتان کے نوابوں کے ساتھ کسی قسم کا اتحاد تشکیل دیں گے)؛ تمام سکھ قوم پر رنجیت سنگھ کی حکومت کو تسلیم کیا جائے گا اور انگریز کسی علیحدگی پسند سکھ کا ساتھ نہیں دیں گے نہ ہی خالصہ جی کی روایات میں مداخلت کریں گے اور یہ کہ انگریزوں کے ساتھ اتحاد دائمی ہوگا۔

مٹکاف دربار کے ساتھ اتحاد کو دائمی بنیادوں پر استوار کرنے کو تیار تھا مگر وہ باقی دو دفعات کو ماننے پر تیار نہیں تھا اس نے اس بات پر بھی اپنی حیرت کا اظہار کیا کہ دربار نے فرانسیسیوں کے حملے کے خلاف انگریزوں کے ساتھ مجوزہ اتحاد پر کوئی بات نہیں کی۔

دو ہفتے بعد رنجیت سنگھ مالرکوٹلہ کو روانہ ہوا۔ مٹکاف نے اس کا پیچھا کیا۔ مالرکوٹلہ کے پٹھان سردار نے رنجیت سنگھ کا حقِ حکمرانی قبول کیا۔ مٹکاف نے اس کی رنجیت سنگھ کو سفارش کروا کر ٹیکس کم کروانے کی درخواست نظرانداز کر دی۔

مالرکوٹلہ کے مقام پر رنجیت سنگھ نے ایک بار پھر بھرے دربار میں مٹکاف سے ملاقات کی۔ درباریوں نے مٹکاف پر زور دیا کہ ان کے مہاراجا کو فی الفور سکھ قوم کا بلاشرکتِ غیرے رہنما اور حکمران تسلیم کیا جائے۔ مٹکاف نے جواب دیا ایسا اسی وقت ممکن ہے جب فریقین میں مکمل بھروسے کی فضا موجود ہو۔ رنجیت سنگھ نے گفتگو اپنے ہاتھ میں لیتے ہوئے کہا: ''مجھے تمہاری چٹھیوں اور مراسلوں سے تو یوں لگتا تھا کہ ہمارے درمیان مطلوبہ بھروسا موجود ہے''

''نہیں ان چٹھیوں میں ایسا کچھ نہیں تھا'' مٹکاف نے جواب دیا ''میں دربارِ لاہور کے رویے کو حسد اور شک پر مبنی قرار دے چکا ہوں''

رنجیت سنگھ نے انگریز سفیر کی بے باکی اور صاف گوئی کا اسی کے لفظوں میں جواب دیا: ''مجھے تو یہ بتایا گیا تھا کہ انگریزوں کا پنجاب پر قبضہ کرنے کا ارادہ ہے''

''مہاراجا کے بارے میں ہمارے پاس بھی اطلاعات تھیں کہ دربار کی فوجیں دہلی پر چڑھائی کرنے جا رہی ہیں لیکن ہم نے انھیں نظرانداز کر دیا'' مٹکاف نے جواب دیا

اس کے وفد کے ایک رکن کا کہنا تھا: انگریز اتنے طاقتور ہیں کہ اس طرح کی افواہوں کو نظرانداز کیا جا سکتا ہے۔

"مجھے انگریزوں کے خلوص پر کوئی شبہ نہیں ماسوائے اس کے کہ وہ سکھوں پر میری عملداری تسلیم کرنے کو تیار نہیں۔ مجھے خود ان سے ایسا کہنے کی ضرورت بھی نہیں کیونکہ تمام سکھ قوم خالصہ ریاست کی برتری کو دل سے تسلیم کرتے ہیں" رنجیت سنگھ کا کہنا تھا۔

''پھر اس نکتے پر اتنا اصرار کیوں کیا جا رہا ہے'' مٹکاف نے کہا۔ تاہم اس نے بتایا کہ وہ اس معاملے کو گورنر جنرل کو بھیج چکا ہے۔

مہاراجا نے کہا کہ اس کی رعایا یہ جاننا چاہتی ہے کہ ہم نے ان چھ ہفتوں کے مذاکرات کے نتیجے میں کیا حاصل کیا ہے۔

مٹکاف نے قدرے طیش میں آ کر کہا وہ خود یہ سوال پوچھنا چاہتا ہے۔ فریقین کے درمیان مذاکرات اسی طرح بے مقصد بے نتیجہ آگے بڑھتے رہے۔ رنجیت سنگھ نے مٹکاف کو بتایا کہ وہ انبالہ کی طرف روانہ ہو رہا ہے۔ انگریز مذاکرات کار بات چیت کو جاری رکھنا چاہتا ہے تو وہ اس کے پیچھے وہاں بھی آ سکتا ہے۔

مٹکاف جو طیش میں آیا ہوا تھا نے پہلے کہا کہ اس کا انبالہ جانے کا کوئی ارادہ نہیں۔ پھر اس کو اس بات پر راضی کیا گیا کہ وہ رنجیت سنگھ کے پیچھے اس کی اگلی منزل فتح گڑھ۔ گونگرانا تک جا سکتا ہے۔ وہاں اس طرح کے مزید اجلاس ہوئے، کاغذات کا تبادلہ ہوا اور مٹکاف نے لمبی چوڑی تقریر میں ان مفادات کا ذکر کیا جو دربار کو برطانیہ کے ساتھ اتحاد میں داخل ہو کر حاصل ہو

سکتے ہیں۔ٹھیک اس وقت جب اس نے سمجھا کہ اس کی خطابت رنگ لے آئی ہے اور وہ اپنا مقصد حاصل کرنے کے قریب پہنچ گیا ہے دربار کے ایک مشیر بھوانی داس نے کچھ کہنے کی اجازت چاہی اور کہا: فرانسیسی حملے کے پس منظر میں حاصل ہونے والے مفادات سکھوں کے مقابلے میں انگریزوں کو ہوں گے۔

"نہیں آپ فرانسیسیوں کو اتنا نہیں جانتے جتنا میں جانتا ہوں۔ وہ آپ کی آزادی ختم کر دیں گے'' اس کے ایک اور مشیر کے الفاظ میں'' اور اگر ایسا ہوا تو دربار کا انگریزوں کے ساتھ اتحاد کرنے یا نہ کرنے کا سوال ختم ہو جائے گا۔ انگریز مذاکرات کار کی مدد کے لیے اس کے ساتھیوں نے فرانسیسیوں کے خلاف ٹھیٹھ پنجابی زبان میں مغلظات بکیں۔ مہاراجا اور اس کے درباری انبالہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

مٹکاف کونگرانا میں ہی رہ گیا جہاں اسے اپنی سوچ کو کاغذ پر منتقل کرنا تھا۔ اس کی تحریروں سے تو یہ محسوس ہوتا ہے کہ وہ رنجیت سنگھ کی ملاوی ریاستوں پر عملداری کو ایک تسلیم شدہ حقیقت سمجھتا تھا؛ وہ صرف ان سرداروں کے خیال سے اس کا اعتراف کرنے سے گھبراتا تھا جنھوں نے ابھی تک رنجیت سنگھ کے حقِ حکمرانی کو تسلیم نہیں کیا تھا۔ اگر اس کی حکومت رنجیت سنگھ کو غیر مشروط طور پر مہاراجا تسلیم کرتی ہے تو اس کا مطلب ہوگا کہ چند ایسے لوگوں کو زبردستی رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا جائے جو ایسا نہیں چاہتے۔ اور اگر مہاراجا کے دعوے کو اس بات سے مشروط کر دیا جائے کہ پہلے وہ ان لوگوں کو اپنی صلاحیتوں کی بنیاد پر دربار کی عملداری میں لے کر آئے تو دوسرے لفظوں میں یہ اس کی حوصلہ افزائی کرنے کے مترادف ہوگا کہ وہ ان ریاستوں کے خلاف جارحیت کا ارتکاب کر سکتا ہے۔ مٹکاف کی اصل پریشانی "تسلیم کیا جانا" کے لفظی معنوں سے تھی نہ کہ اس بات سے کہ اس سے کیا مراد ہے۔

اس دوران رنجیت سنگھ نے اپنی فاتحانہ پیش قدمی جاری رکھی۔ جہاں جہاں سے وہ گزرا لوگوں نے اسے خوش آمدید کہا۔ انبالہ سے وہ شاہ آباد گیا اور وہاں سے پٹیالہ۔ پٹیالہ میں وہ خوف سے سہمے صاحب سنگھ بھنگی سے ملا۔ یہ شخص اسے ایک سے زیادہ مرتبہ دھوکا دے چکا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اسے گلے لگایا اور قابلِ عزت بزرگ ہستی صاحب سنگھ بیدی کی موجودگی میں (جو ہمیشہ اس وقت میں ظاہر ہوتا جب سکھ قوم میں نفاق کا خطرہ بڑھنے کا اندیشہ ہوتا) اس کے ساتھ اپنی پگڑیاں تبدیل کیں۔ یوں رنجیت سنگھ نے اس بات کا ثبوت دیا کہ جمنا اور ستلج کی درمیانی پٹی پر بھی اس کی حکومت ہے اور یہاں کے تمام سردار اس کی برتری کو تسلیم کرتے ہیں۔

اس موقع پر انگریز سرکار نے یکلخت پینترا بدلا۔ مٹکاف اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہونے والے مذاکرات کے بعد انگریز کسی بھی قوت کے خلاف رنجیت سنگھ پر اعتبار کرنے کو تیار نہ تھے تو پھر کیوں نہ ملاوہ کو ایک طاقتور اور مستقل دشمن کی گود میں پکے ہوئے پھل کی طرح گرنے سے روکا جائے۔ لارڈ منٹو نے ملاوی ریاستوں کو انگریز حکومت کی پناہ میں لینے کا فیصلہ کیا۔ اس نے اپنے کمانڈر ان چیف کو حکم دیا کہ دلی کے گرد و نواح میں موجود فوجوں کو شمال میں پنجاب کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا

جائے۔ساتھ میں مٹکاف کو بھی حکم دیا گیا کہ رنجیت سنگھ کو مذاکرات میں الجھا کر زیادہ سے زیادہ وقت حاصل کیا جائے اور اس دوران کرنل اکٹرلنی جنگ کے لیے تیار ہو جائے۔

کیا فرانسیسی حملے کی کہانی محض ایک دکھاوا تھا؟9 کیا رنجیت سنگھ کے ساتھ دوستی کے دعوے اور مذاکرات اس کے علاقوں کے بارے میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنے کی غرض سے کیے گئے تھے؟ لارڈ منٹو سامراجی ذہنیت کا مالک تھا اور مٹکاف سمیت بہت سے نوجوان انگریز بھی اسی سوچ کے مالک تھے۔تمام مقامی ریاستوں کو تحلیل کر کے متحدہ ہائے برطانیہ کا قیام ان کا دیرینہ خواب تھا۔

رنجیت سنگھ اس بات سے قطعی بے خبر تھا کہ آنے والے دنوں میں منٹو کی طرف سے اس کی پیٹھ میں خنجر گھونپ دیا جائے گا۔ملاوہ کے دورے سے فارغ ہو کر وہ امرتسر لوٹا۔وہاں پہنچنے پر عوام نے اس کے شاندار استقبال کیا۔انھوں نے گیت گاتے ہوئے اس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کیں اور اس کے حق میں نعرے لگائے۔کئی روز تک اس کی رہائش گاہ اور گولڈن ٹیمپل برقی قمقموں سے جگمگاتے رہے اور شہر میں آتش بازی اور چراغاں جاری رہا۔مہاراجا اور اس کے عوام خوشیاں منانے اور شراب کے نشے میں مدہوش تھے۔مٹکاف اب مچان پر مورچہ بند شکاری کی مانند تھا جو اپنی تسبیح ہاتھ میں لیے شکار پر گھات لگائے بیٹھا ہو اور آنے والے خطرے سے اس کی بے پروائی پر ہنس رہا ہو۔گورنر جنرل کے نام اپنے خط میں اس نے مہاراجا کی امرتسر کو واپسی کو یوں بیان کیا:"رنجیت سنگھ یوں تو ہر کام میں بے صبری کا مظاہرہ کرتا ہے مگر اس مرتبہ اس کی غیر معمولی بے صبری کی وجہ اپنی پسندیدہ داشتہ موہراں سے ملاقات تھی جس سے بچھڑے ہوئے اسے تین ماہ کا عرصہ ہو چلا تھا۔حالیہ دورے کی تھکان کو وہ موہراں کے بازوؤں میں آرام کر کے اتار رہا ہے۔"10

مٹکاف 10 نومبر 1809 کو گورنر جنرل کا الٹی میٹم لے کر امرتسر آیا۔تاہم اب کی بار اسے چیزوں کو الجھانے کا فرض سونپا گیا تھا۔اکٹرلنی کو اپنی فوج پنجاب کی سرحد تک لانے کے لیے وقت درکار تھا، برطانوی جاسوسوں نے ملاوی سرداروں اور انگریزوں کے درمیان تعاون کو یقینی بنانا تھا اُدھر مٹکاف کے ساتھی ایلفنسٹائن کو بھی کابل میں اپنے مشن کو مکمل کرنا تھا۔کبھی کبھی مٹکاف کو اس کا ضمیر کچوکے لگاتا۔اپنی ڈائری میں اس نے ایک جگہ یوں لکھا:"میں یہ بات کیسے بھول جاؤں کہ مجھے اتحاد قائم کرنے کے لیے بھیجا گیا تھا نہ کہ جنگ چھیڑنے کے لیے۔"

لیکن یہ (خود ملامتی) زیادہ دیر تک نہ رہی۔اسے یقین تھا کہ انگریز حکومت کو رنجیت سنگھ کے رویے میں کچھ نہ کچھ ایسا دکھائی دے گا جو انھیں سکھوں کے خلاف جنگ کرنے کا بہانہ فراہم کرے گا۔"جلد ہی اس کا رویہ ایسا موقع فراہم کرے گا جس کی وجہ سے ہمیں اُس شرمندگی سے نجات مل جائے گی جو اس کے ساتھ حالیہ مذاکرات کے نتیجے میں پیدا ہو سکتی ہے "مٹکاف نے لکھا۔اس نے کچھ تذبذب کا بھی اعتراف کیا جو اس کی حکومت کی پالیسی کی وجہ سے اس کے دماغ میں پیدا ہوا۔" مجھے یوں لگا جیسے حکومت کو رنجیت سنگھ کے ہتھیاروں کے دکھاوے سے کچھ غرض نہیں اور یہ انگریز حکومت کی گزشتہ تین

برس کی پالیسی کا حصہ ہے جس نے رنجیت سنگھ کو اپنے عزائم پورا کرنے کی شہہ دی ہے؛ اور آپ کی طرف سے مشترکہ ہدایات کے بعد میں اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ حکومت اس مسئلے کو بغیر کسی فیصلے یا بحث مباحثے کے یونہی چھوڑنا چاہتی ہے اگرچہ مجھے یوں لگا اس کے قابلِ اعتراض رویے کے خلاف حکومت کا حرکت میں آنا ممکن ہے پر میں اس بارے میں پُر اعتماد نہیں تھا"

رنجیت سنگھ کو آنے والے دنوں میں انگریزوں کے ساتھ جنگ کے خطرے کا کتنا احساس تھا اس بات کا اندازہ اس حقیقت سے لگایا جا سکتا ہے کہ دیوالی کے دنوں میں اس کی فوج کے بیشتر سپاہی ستلج عبور کر کے واپس چلے گئے تھے (بس گنتی کے چند سوار انبالہ اور آس پاس کے علاقوں میں رہ گئے تھے)

مٹکاف نے خود جا کر گورنر جنرل کا خط رنجیت سنگھ کے حوالے کیا تا کہ وہ اُس کے تاثرات دیکھ سکے۔ تاہم وہ یہ خوشی حاصل نہ کر سکا کیونکہ رنجیت سنگھ نے پرسکون انداز میں اسے ایک طرف رکھ کر اسے دیوالی کے جشن میں شریک ہونے کی دعوت دی۔ "میں ان کی رنگ رلیوں میں شامل ہو گیا تاہم جلد واپس لوٹ آیا؛ مہاراجا اور اس کے احباب کسی قسم کی سنجیدہ گفتگو یا مذاکرات کے قابل نہیں تھے۔ 11"

اگلا تمام دن مٹکاف نے اس ٹائم بم کے دھماکے کا انتظار کرتے ہوئے گزارا۔ دوسری طرف رنجیت سنگھ اپنی جیب میں پڑے اس سرکاری مراسلے سے بےخبر موجیں کر رہا تھا۔ جب مٹکاف کے اعصاب جواب دے گئے تو اس نے مہاراجا کو اپنے ایک کلرک کے ذریعے یاد دہانی کرائی۔ رنجیت سنگھ نے اسی کلرک سے وہ خط پڑھنے کو کہا۔ اس خط کے ذریعے ہی رنجیت سنگھ کو معلوم ہوا کہ گورنر جنرل اس بات پر حیران ہے کہ مہاراجا ان سرداروں کو زبردستی اپنی رعایا میں شامل کرنا چاہتا ہے جنھیں لمبے عرصے سے ہندوستان کے شمال میں حکومت کرنے والی طاقت (انگریز) تحفظ فراہم کر رہی ہے 12۔ گورنر جنرل نے رنجیت سنگھ کی طرف سے لیک کو لکھے گئے خط کا بھی حوالہ دیا جس میں ستلج کو دونوں ریاستوں کے درمیان سرحد کے طور پر تسلیم کرنے کا مشورہ دیا گیا تھا۔

راجا نے مکمل سکون اور خاموشی سے خط کے مندرجات سنے۔ ایک شخص جو اس کے پاس دوستی کا معاہدہ کرنے آیا تھا اب اسے جنگ کا الٹی میٹم دے رہا تھا۔ اس نے کہا وہ جلد ہی گورنر جنرل کے نمائندے کو اس خط کے جواب سے آگاہ کرے گا۔

کہتے ہیں کہ اس نے اپنا گھوڑا منگوایا اور نامعلوم سمت میں روانہ ہو گیا۔ دیر تک خوب گھڑسواری کے بعد جب اس کا دماغ ٹھنڈا ہوا تو اس نے اپنی کابینہ کا اجلاس طلب کیا ان کی آمد سے قبل مٹکاف نے ایک اور خط رنجیت سنگھ کے حوالے کیا جس میں مشرق کی سمت میں موجود اس سارے علاقے کو جس پر رنجیت سنگھ نے اُس وفد کے آنے کے بعد قبضہ کیا تھا فوری طور پر خالی کرنے کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ اب رنجیت سنگھ نے اپنے دارالحکومت لاہور لوٹنے کا فیصلہ کیا۔ 13

مٹکاف امرتسر میں وہاں کے لوگوں سے براہِ راست رابطے کی غرض سے موجود رہا۔ 14 وہ دربار صاحب کی زیارت کو

گیا، دل کھول کر خیرات میں اپنا حصہ ڈالا اور وہاں موجود متولیوں کی خدمت میں قیمتی نذرانے پیش کیے 15۔

مٹکاف 17 دسمبر کو لاہور مہاراجا کے دربار پہنچا۔ اس نے دربار میں مہاراجا کو عام نوعیت کے موضوعات پر دلچسپ باتیں کرتا پایا، تاہم مٹکاف کے الفاظ میں گفتگو کے دوران "مہاراجا سوچوں میں گم ہو جاتا اور وہ اپنی بات چیت میں خاصی احتیاط سے کام لے رہا تھا16"

ایک مرتبہ پھر مذاکرات کا آغاز ہوا۔ مٹکاف مزید انتظار کرنے کے لیے تیار تھا کیونکہ ابھی تک اسے اکٹرلنی کی طرف سے یہ پیغام موصول نہیں ہوا تھا کہ اس نے جنگی تیاریاں مکمل کر لی ہیں۔

اس نے اپنی حکومت کو لکھا: " میں اس وقت تک بات چیت کو التوا میں ڈالنا جاری رکھوں گا جب تک مجھے اس بات کا علم نہیں ہو جاتا کہ فوجی دستوں کا سرحد کی طرف روانگی کا کام مکمل ہو گیا ہے 17"

رنجیت سنگھ اور مٹکاف کے درمیان 21 دسمبر کو ایک مرتبہ پھر ملاقات ہوئی رنجیت سنگھ کے تمام وزراء اس ملاقات میں موجود تھے۔ فقیر عزیز الدین اور پربھ دیال نے دربار کا موقف بیان کیا۔ انھوں نے کہا کہ مہاراجا پہلے دو مرتبہ ستلج کے پار جا چکا ہے اور دونوں مرتبہ وہاں کے مقامی سردار نے مہاراجا کو آنے کی دعوت دی تھی اور پہلے بھی دیوان محکم چند نے اس علاقے میں بہت سی ریاستوں اور دیہاتوں کو دربار کے ساتھ ضم کیا مگر انگریزوں نے اس حوالے سے کبھی بات نہیں کی بلکہ جب انھوں نے دہلی پر قبضہ کیا تھا انھوں نے یہ واضح کر دیا تھا کہ انھیں جمنا کے شمال میں ہونے والے معاملات سے کوئی غرض نہیں۔ مرہٹوں کو شکست دینے کے بعد لارڈ لیک نے اپنے تمام سپاہیوں کو اس علاقے سے بلوا لیا۔ اس وقت راجا اور پٹیالہ کی رانی کے درمیان تنازع اپنے عروج پر تھا اور لیک چاہتا تو اس کا کوئی حل نکل سکتا تھا مگر اس نے مداخلت کرنے سے انکار کر دیا۔ دہلی میں بیٹھے انگریز ریذیڈنٹ نے بھی ملاوہ کے معاملات میں دخل دینے سے انکار کر دیا تھا اور جب ان (ملاوی) سرداروں نے رنجیت سنگھ کی حکومت تسلیم کی تو انگریزوں کی طرف سے احتجاج یا مخالفت میں ایک لفظ بھی نہیں بولا گیا۔

مٹکاف کو یہ سب سن کر یوں لگا ہو گا جیسے یہ بالکل وہی دلائل ہیں جو وہ ایک ماہ پہلے تک اپنی حکومت کو ملاوی ریاستوں پر رنجیت سنگھ کے حقِ حکمرانی کو تسلیم کرنے کے لیے دے چکا تھا۔ لیکن وقت بدلتے دیر نہیں لگتی اب مٹکاف کا نقطۂ نظر مختلف تھا۔ ''نہیں''، اس نے سچائی کی بجائے جوشیلے انداز میں کہا اس کی حکومت کو اس بات کا علم نہیں تھا کہ رنجیت سنگھ کی اِن علاقوں میں آمد دراصل اِن "فتوحات کو یقینی" بنانے کی ایک کڑی ہے؛ اور یہ کہ سیٹن نے ملاوی ریاستوں کے تحفظ کی یقین دہانی اس لیے نہیں کرائی تھی کہ اُس وقت اس کی ضرورت محسوس نہیں کی گئی۔ اور جہاں تک ملاوی ریاستوں کی طرف سے رنجیت سنگھ کو اپنا حکمران تسلیم کیے جانے کا سوال ہے مٹکاف نے کہا "میرے علم میں ایسی کوئی بات نہیں اور نہ ہی انگریز حکومت کے علم میں ایسی کوئی بات ہے اور اگر ایسا ہوتا بھی تو وہ (انگریز سرکار) اس کو تسلیم نہ کرتی اور نہ اس پر کوئی توجہ دیتی 18"

مہاراجا خاموشی سے یہ دلائل سنتا رہا مگر اس کو دیکھ کر صاف محسوس ہو رہا تھا کہ اس بات چیت سے اسے سخت مایوسی ہوئی ہے۔ مٹکاف لکھتا ہے، مہاراجا نے یہ سب باتیں سن کر کہا" چونکہ میں (مٹکاف) صرف ایک مقصد کے لیے بھیجا گیا تھا اور وہ تھا دونوں ریاستوں کے درمیان دوستی کے رشتے کو مضبوط کرنا اور اسے انگریز حکومت سے امید تھی کہ وہ اس کی تمام توقعات پر پورا اترے گی؛ لیکن اب اس کی مایوسی کی کوئی انتہا نہیں اور اس نے اس طرح کی غیر معمولی دوستی کہیں نہیں دیکھی جس کے لیے میں لاہور گیا ہوا تھا" دربار ختم کرنے سے پہلے رنجیت سنگھ نے یہ کہا: ''دوستی میں ایسا زخم نہ دو جو بعد میں دشمنی میں بدل جائے''

تاہم انگریزوں کی دوستی ابھی ختم نہیں ہوئی تھی۔ اگلے روز مٹکاف نے یہ خبر سنائی کہ برطانوی فوج ستلج کی طرف پیش قدمی کر رہی ہے۔ اور جب اسے علم ہوا کہ رنجیت سنگھ نے بھی محکم چند کو طلب کر کے ضروری ہدایات دینا شروع کر دی ہیں اور امرتسر کی طرف روانہ ہونے کو تیار ہے تو اسے بہت غصہ آیا۔ اس نے الزام لگایا کہ رنجیت سنگھ انگریزوں کو طاقت کے ذریعے روکنا چاہتا ہے۔ فرانسیسی زبان میں اس کا کہنا تھا یہ جانور تو بہت تیز ہے اور جب اس پر حملہ کیا جائے گا یہ جوابی کارروائی ضرور کرے گا۔ انگریزوں کی طرف سے حملے کے جواب پر دربار تقسیم تھا۔ کچھ وزرا کے خیال میں منہ توڑ جواب دینا چاہیے جبکہ چند ارکان کابینہ کے نزدیک امن کی کوشش کرنی چاہیے چاہے اس کے لیے کوئی بھی قیمت کیوں نہ ادا کرنی پڑے۔ انگریزوں کے ساتھ جنگ کی حمایت میں بولنے والوں کی سربراہی محکم چند کر رہا تھا: عزت اور غیرت کا تقاضا ہے کہ ایک گولی چلائے بغیر معمولی شرائط کے عوض گھٹنے ٹیک دینے کی بجائے لڑتے ہوئے جان دے دی جائے۔ اس کے کہنے پر تمام سرداروں کو پیغام بھجوا دیا گیا کہ انگریزوں سے لڑنے کے لیے اپنی فوجیں لے کر ستلج کے کنارے پہنچ جائیں۔ لاہور، گوند گڑھ اور پھلہار کے قلعوں کو مضبوط بنانے اور لمبے عرصے تک محاصرے کا سامنے کرنے کے لیے تیار کر دیا گیا۔ چند دنوں میں ہی ایک لاکھ سے زائد پنجابی سپاہیوں کی فوج جنگ کے لیے تیار تھی۔ تاہم اتنی بڑی فوج کے باوجود محکم چند دربار کو کمپنی کی بہتر تربیت یافتہ اور طاقتور افواج کے خلاف فتح کی یقین دہانی نہ کرا سکا۔ فقیر عزیز الدین چاہتا تھا جہاں تک ہو سکے لڑائی سے بچا جائے۔ فقیر کے پیچھے سب سے مضبوط اور خاموش ہاتھ سدا کور کا تھا19۔ رنجیت سنگھ کو اس بات کا بخوبی علم تھا کہ اگر وہ اب ہارتا ہے تو سب کچھ ختم ہو جائے گا اور اگر وہ وقتی طور پر خطرے کو ٹالنے میں کامیاب ہوتا ہے تو آئندہ لڑنے کی بہتر تیاری کر سکتا ہے۔ اس نے اپنی آن اور شان کو وقتی طور پر پسِ پشت ڈالنے کا فیصلہ کیا اور ستلج کو پنجاب کی مشرقی سرحد تسلیم کرنے پر تیار ہو گیا۔ لیکن اگر اکٹرلنی نے ستلج کو عبور کر کے جنگ لڑنے کی کوشش کی تو وہ آخری سانس تک انگریزوں کا مقابلہ کرے گا۔

2 جنوری 1809 کو اکٹرلنی تین پیدل فوجی دستوں، ایک گھڑسواروں کے دستے اور چند گولہ بارود اگلنے والی رجمنٹوں کے ہمراہ کرنال کے لیے روانہ ہوا۔ اسے ہدایات ملی تھیں کہ دربار کو مجبور کرے کہ اپنی حالیہ فتوحات سے دستبردار ہو جائے؛ راستے میں اسے ملاوی سرداروں کی مدد حاصل ہوگی اور اگر ان میں سے کسی نے رنجیت سنگھ کے ساتھ ہمدردی ظاہر کی تو انھیں صاف لفظوں میں اس کے انجام کے بارے میں بتا دیا جائے۔ اسے یہ بھی کہا گیا تھا کہ لاہور دربار کے ناراض یا

ناخوش عناصر کے ساتھ بھی رابطے میں رہے۔

9 فروری 1809 کو اکٹرلنی نے اپنی حکومت کی طرف سے باقاعدہ اعلان کیا کہ ملاوی ریاستوں کے سرداروں کو انگریزوں کا تحفظ حاصل ہے۔ کھرڑ اور خانپور کے مقام پر تعمیر کیے گئے دربار کے قلعے مسمار کر دیئے گئے اور دربار کو اپنی فوجیں ستلج کے مغربی کنارے کی طرف پسپا کرنا پڑیں۔ رنجیت سنگھ نے مٹکاف کو مطلع کیا کہ اس نے اپنی فوجوں کو انبالہ خالی کرنے کا حکم دیا ہے۔ مٹکاف نے فرید کوٹ اور سنیوال بھی خالی کرنے کا مطالبہ کیا اور ایک بار پھر الزام لگایا کہ رنجیت سنگھ جنگ کی تیاریاں کر رہا ہے۔ انگریز مذاکرات کار کے لیے سب سے بڑی پریشانی دیوان محکم چند تھا جس کی لدھیانہ میں موجودگی دربار کے جارحانہ عزائم کا پتا دیتی تھی۔ مٹکاف نے انگریز فوجوں کے کمانڈر ان چیف کو پیغام بھجوایا کہ جنگ کے لیے تیار رہے۔ اس نے جواب میں اسے بات چیت کو مزید چند دن جاری رکھنے کا کہا تا کہ وہ اس حوالے سے اپنی حکمت عملی تیار کر لے۔ لیکن اس نے مٹکاف کو خبردار کیا کہ بات چیت کو بہت زیادہ طول نہ دے اور یہ بات ذہن میں رکھے کہ اس طرح سے بات چیت کا پُر امن ماحول خراب ہو سکتا ہے۔ 20

ملاوی سردار ایک بار پھر اسی روش کو اپنائے ہوئے تھے کہ جیتنے والے کا ساتھ دیا جائے۔ انھوں نے اکٹرلنی کو وفاداری کا یقین دلایا۔ سدا کور بھی ان کے ساتھ تھی اور رنجیت سنگھ کا چچا جند کا بھاگ سنگھ بھی۔ (اس نے انگریز کمانڈر ان چیف کو یہ یقین دلانے کی پوری کوشش کی کہ رنجیت سنگھ جنگ نہیں چاہتا) اُدھر دربارِ لاہور میں انہی سرداروں کے نمائندے مہاراجا سے وفاداری کا دم بھر رہے تھے۔

امرتسر میں پھر سے مذاکرات شروع ہوئے۔ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کی طرف سے لگائی گئی تمام شرائط تسلیم کیں تاہم اس نے فرید کوٹ پر اپنا دعویٰ ترک کرنے سے انکار کر دیا۔ مٹکاف فرید کوٹ کا مسئلہ کلکتہ بھیجنے پر رضا مند ہو گیا اصل میں اس کا مقصد معاہدۂ دوستی پر دستخط کی تقریب کو التوا میں ڈالنا تھا جس پر دربار پہلے سے زیادہ شدت سے اصرار کر رہا تھا۔ مٹکاف نے متاثرہ فریق کے لب و لہجے کو جاری رکھتے ہوئے معاہدۂ دوستی کو لٹکائے رکھا۔ رنجیت سنگھ نے اس کی کئی طریقوں سے خوشامد کی: ''تم ارسطوئے دوراں ہو؛ خوشی خوشی اس معاہدے پر دستخط کر کے اس کا اعلان کرو۔ اس طرح فوجی چوکیاں بھی قائم ہو جائیں گی۔ آخر میرے دل کو قرار کب آئیگا؟'' وہ پہلے ہی انگریزوں کی تمام شرائط مان چکا تھا، کیا انگریز اب بھی رضا مند ہونے پر تیار نہیں تھے؟ ''ایک سیپ بھی بارش کی بوند پڑنے پر موتی لوٹا دیتی ہے،'' اس نے انگریز مذاکرات کار سے اصرار کیا۔

مٹکاف اپنے مؤقف سے پیچھے ہٹنے کو تیار نہ تھا۔ شاید اب وہ چاہتا تھا کہ رنجیت سنگھ کی ستلج کے اِس طرف موجود راجدھانی کو بھی زیرِ نگیں کر لیا جائے اور اس کے اقتدار کا خاتمہ ہو جائے۔ اس نے اپنی حکومت کو تمام پنجاب پر چڑھائی کرنے کی سفارش کی اور اس کا جواز ڈھونڈنے کی سرتوڑ کوششیں کیں۔ اس نے رنجیت سنگھ کے مشیروں پر اعتراض کیا؛ محکم چند ''سر

پھرا'' جنگجو ہے۔ محکم چند نے دیوان کے خلاف رنجیت سنگھ کے کان بھرے اور کہا کہ دیوان گستاخ ہے۔ پنجاب کا اصل حکمران رنجیت سنگھ نہیں بلکہ محکم چند ہے۔ اس نے مٹھ سنگھ کا ذکر بھی طنزیہ انداز میں "رنجیت سنگھ کا پسندیدہ دوست" کہہ کر کیا۔ رنجیت سنگھ نے مٹکاف کی ان تمام طیش دلانے والی باتوں کے باوجود اس کو وہ بہانہ فراہم نہیں کیا جو وہ چاہتا تھا۔ نتیجتاً مٹکاف کے صبر کا پیمانہ لبریز ہوگیا اور اس نے کسی جواز کا انتظار کیے بغیر 22 جنوری 1809 کو کمانڈر ان چیف کو لکھا کہ ''راجا نے باقاعدہ صف بندی کر لی ہے'' یہاں تک کہ اس نے تاجِ برطانیہ کے کمانڈر ان چیف کو مکمل ''ذمہ داری'' کے ساتھ پنجاب کی صورتحال اور وہاں ہونے والے ظلم وستم کے تناظر میں حملے کی دعوت دے ڈالی۔ 22

مٹکاف کی طرف سے پنجاب پر حملے کے بار بار اصرار نے کمانڈر ان چیف اور دلی میں بیٹھے ریذیڈنٹ سیٹن دونوں کو حیرت زدہ کر دیا۔ تاہم دیگر انگریز یونٹوں کو چوکس کر دیا گیا اور میجر سارجنٹ لیگر کی سربراہی میں دستوں کو فوری حملے کے لیے تیار رہنے کا حکم دیا گیا۔ تاہم پنجاب پر چڑھائی کی ضرورت اچانک ختم ہوگئی کیونکہ نپولین نے سپین پر حملہ کر دیا اور اس کی فوجیں یورپ میں پھنس کر رہ گئیں اس طرح نپولین کی طرف سے ہندوستان کی طرف لشکر کشی کا خطرہ آنے والے چند برسوں کے لیے ٹل گیا۔ انگریزوں کی رنجیت سنگھ کے حوالے سے حکمت عملی بھی اسی لحاظ سے تبدیل ہوگئی۔ 30 جنوری 1809 کو اکٹرلنی کو نئے احکامات موصول ہوئے کہ ''راجا رنجیت سنگھ کی طاقت میں کمی یا اس کا خاتمہ جو پہلے والے حالات میں انگریز لشکر کی پنجاب کی سرحدوں کی طرف پیش قدمی کی وجہ سے ضروری اور نہایت اہمیت کا حامل سمجھا جا رہا تھا اب ہمارے لیے اُتنا اہم نہیں رہا" رنجیت سنگھ کو اس کے حال پر چھوڑا جا سکتا ہے۔ اس کی دوستی کی مزید ضرورت نہیں تاہم اس کی جھنجھلاہٹ اسے ملاوہ پر قبضے کی اجازت دے کر اور اپنی فوجی چوکیاں اس کی سرحدوں سے ہٹا کر کم کی جا سکتی ہے''۔

اکٹرلنی نے اپنی پیش قدمی جاری رکھی۔ پٹیالہ میں کم عقل صاحب سنگھ نے بچوں کی سی خوشی کے ساتھ اس کا استقبال کیا۔ البتہ نبھا زیادہ خوش نہ تھا۔ اس پر رنجیت سنگھ کے بہت سے احسانات تھے۔ یہی کیفیت جند کے سردار بھاگ سنگھ کی تھی وہ پٹیالہ شہر (جو اس کے بھتیجے نے اسے دیا تھا مگر جس پر انگریزوں کا قبضہ ہوگیا تھا) کے بدلے لدھیانہ، کرنال اور پانی پت لینا چاہتا تھا۔ مالرکوٹلہ کے نواب کو اس کی جاگیریں واپس دے دی گئیں۔

رنجیت سنگھ کی شہرت کا گراف اپنے لوگوں کی نظر میں انتہائی نیچے آ چکا تھا۔ دشمن پنجاب کی سرحدوں پر فوج اکٹھی کر رہا تھا۔ ستلج کے کنارے پر ایک فوجی چوکی قائم ہو چکی تھی اور رنجیت سنگھ ایک ایسی قوم کا سردار ہوتے ہوئے جو جنگیں لڑنے اور لڑائی جھگڑے کے لیے مشہور سمجھی جاتی تھی بغیر لڑے دشمن کی شرائط ماننے جا رہا تھا۔ گزشتہ چھ ماہ کی سرد جنگ نے تناؤ کی ایسی کیفیت پیدا کر دی تھی کہ ایک معمولی سا واقعہ جنگ کا باعث بنتے بنتے رہ گیا۔ 25 فروری 1809 دس محرم کا دن تھا اور مٹکاف

کے ہمراہ شیعہ مسلمانوں نے امرتسر کی گلیوں میں محرم کا جلوس نکالا۔ اتفاق سے اسی روز ہولی کا تہوار بھی تھا اور سکھوں کی بڑی تعداد جن میں نہنگ بھی شامل تھے اور ان کی قیادت اکالی پھلا سنگھ کر رہا تھا ہولی منانے شہر میں جمع ہو گئے۔ شیعہ مسلمان شہر کی مختلف گلیوں سے ہوتے ہوئے دربار صاحب کے سامنے سے گزرے جہاں سکھ اپنی عبادات میں مصروف تھے۔ اس موقع پر نہنگ سکھوں نے شیعہ مسلمانوں سے مطالبہ کیا کہ وہ اپنا جلوس کسی اور راستے سے لے جائیں۔ آپس کی بحث تکرار نے جھگڑے کی شکل اختیار کر لی اور شیعہ رضا کار نہنگ سکھوں سے الجھ پڑے۔ یہ بات کسی کو معلوم نہیں کہ جھگڑے کی ابتدا کس نے کی۔ حتیٰ کہ مٹکاف بھی اس بارے میں شک کا شکار تھا اور اس نے تسلیم کیا کہ اس کے ساتھ موجود شیعہ جلوس میں شامل کسی شخص نے پہلی گولی چلائی ہوگی 24 اس جھگڑے میں بہت سے نہنگ مارے گئے کچھ شیعہ بھی کام آئے مگر نہنگ سکھوں کی تعداد زیادہ تھی۔ اس حقیقت اور مٹکاف کے اِس اقرار کے بعد کہ اُس کے ہمراہ نکلنے والے جلوس میں سے کسی نے گولی چلائی ہوگی نہنگ سکھوں پر جارحیت کا الزام ثابت نہیں ہوتا۔ 25

مٹکاف اس واقعے کو بھی جنگ کے جواز کے طور پر استعمال نہ کر سکا۔ اس کی رپورٹ نے اکالی پھلا سنگھ کو قصوروار ٹھہرایا نہ کہ مہاراجا رنجیت سنگھ کو جو فوراً جائے وقوعہ پر پہنچا اور جھگڑے کو رفع دفع کرنے کے لیے اقدامات کیے۔ اس نے مٹکاف کی خدمت میں پیغام رساں بھیجے اور اس کے مہمانوں کے ساتھ ہونے والی بدمزگی پر معذرت طلب کی۔ ادھر دہلی میں سیٹن کو اس واقعے کی تحریف شدہ رپورٹ موصول ہوئی اور اسے یقین تھا کہ اب جنگ ہو کر رہے گی کیونکہ اس رپورٹ کی روشنی میں، اس نے تسلیم کیا کہ ''سکھ ایک وحشی، جنگجو قوم ہے''۔ اکٹرلنی نے بھی تسلیم کیا کہ اگر اس طرح کا مزید کوئی واقعہ ہو جاتا (نہنگ سکھوں نے انتقام کی دھمکی دی تھی) تو وہ ستلج عبور کرنے کا ذہن بنا چکا تھا۔ خوش قسمتی سے اس رپورٹ کے کلکتہ پہنچنے سے پہلے ہی گورنر جنرل دو معاہدوں کی دستاویز لاہور بھجوا چکا تھا جو کہ دربار میں پیش کیے جانے تھے۔ ان کی تفصیل بھی مٹکاف اور اکٹرلنی کو موصول ہوگئی تھی اس طرح کہیں جا کر بالکل آخری لمحے جنگ کا خطرہ ٹلا۔

یہ دونوں دستاویزیں تین ایک جیسی شقوں پر مشتمل تھیں اور ان میں انگریزوں اور رنجیت سنگھ کے درمیان دائمی دوستی کے نظریے اور دربار لاہور کے لیے پسندیدہ ترین ریاست کا درجہ دیئے جانے کے اعلان کیا گیا تھا تیسری شق کے مطابق انگریز سرکار ستلج کی شمالی ریاستوں پر مہاراجا کا حق حکمرانی تسلیم کرنے پر تیار تھی اور اس کو دریا کے جنوب میں بھی فوجیں رکھنے کی اجازت تھی تاکہ وہ اپنے علاقوں کی بہتر رکھوالی کر سکے۔ اس دستاویز میں ایک اضافی شق بھی شامل تھی جس کے تحت رنجیت سنگھ سے کہا گیا تھا کہ وہ ستلج کے جنوب میں موجود ریاستوں پر سے اپنا حق حکمرانی واپس لے تاہم اگر وہ ایسا کرنے سے انکار کر دے تو اس پر اپنی پرانی فتوحات کو ترک کرنے کے لیے دباؤ نہیں ڈالا جائے گا۔

فرید کوٹ کے مسئلے پر تو تکار کچھ ہفتوں تک جاری رہی۔ منکاف کے صبر کا پیمانہ ایک بار پھر لبریز ہو گیا اور اس نے سارجنٹ لیکری پر زور دیا کہ وہ بذریعہ طاقت یہ قصبہ واپس لے۔ اس نے سارجنٹ کو یقین دلایا کہ جب تک سکھ اپنی فوجیں جمع کریں گے مون سون بارشیں ستلج کو ناقابل عبور بنا دیں گی۔ 3 اپریل کو فرید کوٹ کو بھی خالی کرالیا گیا۔ 25 اپریل کو امرتسر میں معاہدے پر باقاعدہ دستخط ہوئے۔ اس میں دوسری دستاویز کی اضافی شق شامل نہیں کی گئی تھی۔ منکاف کی رخصتی سے پہلے ایک ہفتے تک دعوتوں کا سلسلہ چلتا رہا اور بالآخر وہ 2 مئی کو پنجاب سے ہنسی خوشی اور مطمئن روانہ ہوا۔

اس معاہدے اور اس کے بعد ہونے والی تقریبات کے باوجود دونوں جانب کچھ عرصہ تک بدنیتی اور شک وشبہے کی فضا برقرار رہی۔ دربار میں دیوان محکم چند اور اکالی پھلا جیسے لوگ "لڑنے مرنے" کے نظریے کے حامی تھے اور چاہتے تھے کہ مہاراجا معاہدے کی دستاویز کو پرزہ پرزہ کردے اور انگریزوں کے ساتھ جنگ کا اعلان کرے۔ مرہٹوں، روہیلوں اور بیگم سمرو سے رابطے کیے گئے اور شمالی ہندوستان میں یہ افواہ پھیل گئی کہ سکھ، مرہٹا اتحاد مل کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنے جا رہا ہے۔ انگریزوں نے ان افواہوں سے پریشان ہو کر فوج کا ایک دستہ ہانسی روانہ کیا تاکہ سندیا یا ہولکر کو پنجابیوں کے ساتھ ملنے سے روکا جائے۔

مہاراجا نے اپنا دماغ ٹھنڈا رکھا۔ اس نے محکم چند کو صبر سے سنا جس کے لیے اس کے دل میں بہت احترام تھا لیکن اس نے محکم چند کی مرہٹوں کو ساتھ ملانے کی بات پر دھیان نہیں دیا'' مرہٹوں سے کہو وہ پہلا قدم اٹھائیں اور میں ان کے ساتھ شامل ہو جاؤں گا'' وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یہ افواہیں دم توڑتی چلی گئیں۔ شک کے بادل چھٹ گئے اور اس کے اور انگریزوں کے درمیان تعلقات دوستانہ رخ پر استوار ہو گئے۔ سال کے آخر تک یہ تعلقات اتنے دوستانہ ہو گئے تھے کہ گورنر جنرل نے باقاعدہ خط لکھ کر دربار اور انگریزوں کے درمیان تعلقات پر اپنے اطمینان کا اظہار کیا۔ جواب میں رنجیت سنگھ نے لکھا: ''اپنے دل سے پوچھیں کہ میرے دل میں آپ کے لیے کتنی عزت ہے''۔

معاہدۂ امرتسر رنجیت سنگھ کے متحدہ پنجاب کے خواب پر کاری ضرب تھی۔ اگرچہ آنے والے دنوں میں وہ انگریزوں کی دوستی کا دم بھرتا رہا تاہم اس دوستی کے جذبے کے پیچھے ان کی بڑھتی ہوئی طاقت کا خوف چھپا ہوا تھا۔ یہ بات بہت عجیب ہے کہ منکاف جیسے (مکار) شخص کے ساتھ مذاکرات کے تجربے کے باوجود رنجیت سنگھ نے انگریزوں پر اعتبار کرنا ترک نہیں کیا اور کبھی کسی انگریز کو شک کی نگاہ سے نہیں دیکھا۔ 26

اس قرارداد کے فوری بعد کہ جمنا انگریزوں کے زیر انتظام علاقوں کی حتمی سرحد سمجھی جائے گی (جب تک کسی ریاست کی طرف سے اشتعال نہ دلایا جائے) لندن اور کلکتہ میں فوج کشی کے معیار اور اخلاقیات پر نظر ثانی کی گئی۔ بورڈ آف ڈائریکٹرز کی خفیہ کمیٹی نے معاہدۂ امرتسر کا جائزہ لیتے ہوئے اس امر کی نشاندہی کی کہ اس معاہدے میں 19 اکتوبر 1801 اور

27 فروری 1806 کے مغربی سرحدوں کے حوالے سے متعین کیے گئے اصولوں سے انحراف کیا گیا ہے۔ احساس ندامت کے باعث انگریز بار بار پرجوش انداز میں رنجیت سنگھ کو نیک تمناؤں کا پیغام بھجواتے رہے اور رنجیت سنگھ مٹکاف کے دورے کی تلخ یادیں بھلانے میں کامیاب ہو گیا۔

انگریزوں کا خطرہ ٹلنے کے بعد رنجیت سنگھ نے پنجاب کے ان حصوں پر توجہ دینا شروع کی جو ابھی تک اس کی ریاست کے دائرۂ کار میں نہیں آئے تھے۔ لیکن اس آزادی پر بھی معاہدۂ امرتسر کی پابندی لگ چکی تھی جیسا کہ بعد کے دنوں میں انگریزوں کی مداخلت سے ظاہر ہوتا ہے۔ اگرچہ انھوں نے اس بات پر رضامندی ظاہر کی تھی کہ ان کی جانب سے ستلج کے مغرب میں موجود ریاست (پنجاب) کے امور حکومت میں دخل اندازی نہیں کی جائے گی، لیکن ان کے نزدیک ستلج کی شناخت سمندر میں گرنے تک نہیں بلکہ دریائے سندھ میں شامل ہونے تک باقی تھی اور یہ بھی ظاہر تھا کہ دریائے سندھ کے مغرب میں واقع زمینیں ستلج کے مغرب میں واقع تصور نہیں ہوں گی۔

8

کانگڑہ پر قبضہ اور جنوبی پنجاب کا انضمام

انگریزوں کے دباؤ میں آ کر ملاوی ریاستوں سے دستبردار ہونے کے بعد رنجیت سنگھ کا وقار اپنے لوگوں کی نظروں میں گر چکا تھا اور اپنی کھوئی ہوئی ساکھ بحال کرنے کے لیے اسے کسی شاندار کارنامے / فتح کی اشد ضرورت تھی۔ معاہدۂ امرتسر پر دستخط ہوتے ہی دربار کی فوجوں کو ستلج سے واپس بلا لیا گیا اور کانگڑہ کی سمت کوچ کرنے کا حکم دیا گیا۔

امر سنگھ کی قیادت میں گورکھے ایک مرتبہ پھر مغرب میں ہمالیہ کے پہاڑی سلسلے کا رخ کر چکے تھے۔ انھوں نے پہاڑی سرداروں کی فوجوں کو پیچھے دھکیل دیا تھا اور اب کانگڑہ کے قلعے پر قبضہ کرنا چاہتے تھے۔ وہاں کے سردار سنسر چند نے انگریزوں اور رنجیت سنگھ دونوں کو مدد کے لیے پکارا۔ اس کی مدد کی اپیل کو غیر موثر بنانے کے لیے گورکھوں نے بھی کانگڑہ کا قلعہ فتح کرنے کے لیے انگریزوں سے مدد مانگی۔

انگریزوں نے راجپوتوں کی پکار یہ کہہ کر ٹھکرا دی کہ معاہدۂ امرتسر کے تحت انگریز ستلج کے مغرب میں ہونے والے معاملات میں مداخلت نہیں کر سکتے۔ دربار نے بھی گورکھوں کی طرف سے دوستی کا ہاتھ نظر انداز کر دیا کیونکہ اس کے نزدیک کانگڑہ پنجاب کا حصہ تھا اور یہ دربار کی ذمہ داری تھی کہ اس کا بیرونی عناصر کے خلاف دفاع کیا جائے۔ سنسر چند کی درخواست پر ہمدردانہ غور کیا گیا تاہم اس بات کو ضروری سمجھا گیا کہ کانگڑہ کی مدد سے پہلے اس کی طرف سے یہ اعلان کروایا جائے کہ وہ پنجاب کا حصہ ہے اور وہ دربار کی فوجوں کے سامنے قلعے کے دروازے کھول دے۔ سنسر چند جو ایک ہاری ہوئی جنگ لڑ رہا تھا فوراً دربار کی شرائط پر راضی ہو گیا۔

دربار نے کانگڑہ کی پہاڑی ریاستوں کے سرداروں کو حکم دیا تھا کہ گورکھوں کے آگے ہتھیار ڈالنے اور اپنی شرائط بتانے کی بجائے ان کی نیپال سے سپلائی لائن کاٹ دیں۔ رنجیت سنگھ کانگڑہ پہنچا اور قلعے میں داخل ہونے کا تقاضا کیا۔ سنسر چند نے

اس کا حکم ماننے کی بجائے ٹال مٹول شروع کر دی۔ اس نے وعدہ کیا کہ جونہی گورکھے واپس چلے جائیں گے وہ قلعے کو رنجیت سنگھ کے حوالے کر دے گا۔ رنجیت سنگھ اس چال میں آنے والا نہیں تھا اور وہ بھی ایک ایسے شخص کی چال جس کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ اپنی زبان کا پکا نہیں تھا۔ چونکہ یہ دلیل اور بحث و تکرار کا وقت نہیں تھا رنجیت سنگھ نے فوری طور پر سنسر چند کے بیٹے، انیرودھا چند جو کہ رنجیت سنگھ کے پاس یرغمال کے طور پر موجود تھا کی گرفتاری کا حکم دیا۔ سنسر چند کو اس کی بات ماننا پڑی اور 24 اگست 1806 کو دربار کی فوج کے ایک دستے نے قلعے پر قبضہ کیا۔

سرکش گورکھوں نے اپنے محدود راشن کے باوجود مقابلہ جاری رکھا۔ رنجیت سنگھ نے ان کی خوراک اور دیگر سامان کے ختم ہونے کا انتظار کیا اور ان کے پسپا ہونے پر پوری قوت سے حملہ کیا۔ رنجیت سنگھ کی فوجوں نے قلعے سے دو میل دور تک ان کا تعاقب کیا۔ اس پر امر سنگھ تھاپا نے پلٹ کر رنجیت سنگھ کی فوج کا مقابلہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس نے پہاڑی گھاٹی کے بیچ جسے گنیش گھاٹی کے نام سے پکارا جاتا تھا اپنے سپاہیوں کی صف بندی کی۔ اُدھر پہاڑی علاقے کے راجپوتوں نے جنھیں گورکھوں کے ہاتھوں نقصان پہنچ چکا تھا ان پر حملہ کر دیا۔ گورکھوں نے راجپوتوں کا حملہ با آسانی پسپا کر دیا۔ پنجابی گولہ بارود والی بٹالین نے بھی ایک مورچے کے پیچھے پناہ لیے ہوئے ان گورکھوں کا کچھ نہیں بگاڑا۔ یہ جانتے ہوئے کہ تھاپا کے سپاہی جو کئی دنوں سے بھوکے تھے اور دو بدو لڑائی کے قابل نہیں رنجیت سنگھ نے پیدل دستوں کو حملہ کرنے کا حکم دیا۔ اپنی لمبی لمبی کرپانوں کے ساتھ سکھ چھوٹی چھوٹی تلواروں (کھکری) والے گورکھوں پر پل پڑے۔ رنجیت سنگھ جو ایک بڑے ٹیلے کے اوپر اپنے گھوڑے پر بیٹھا یہ نظارہ دیکھ رہا تھا نیچے اتر کر لڑائی میں شامل ہو گیا۔ طویل جنگ سے تھکے ہارے فاقہ زدہ گورکھا اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور افراتفری کے عالم میں میدانِ جنگ سے فرار ہو گئے۔

گورکھوں کے ہٹیلے پن نے رنجیت سنگھ کو خاصا متاثر کیا شاید اسی لیے اس نے امر سنگھ تھاپا کو میدانِ جنگ سے فرار ہونے کی مہلت دی اور اپنے سرداروں کو حکم دیا کہ گورکھوں کو اپنا سامان اکٹھا کرنے دیا جائے۔ رنجیت سنگھ نے ان چند پہاڑی راجپوت سرداروں کو جنھوں نے اس موقع کو غنیمت جان کر اپنے شکست خوردہ دشمن کا سامان لوٹنا شروع کر دیا تھا سختی سے ڈانٹا اور لُٹی ہوئی اشیاء واپس دلوائیں۔ بچی کھچی گورکھا فوج نے منڈی کے مقام پر جا کر تھوڑا دم لیا اور پھر دربار کی فوجوں کے دباؤ پر وہاں سے اُٹھ کر دوبارہ گھر کے راستے پر گامزن ہو گئی۔ اس طرح پنجاب سے گورکھوں کا خطرہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے ٹل گیا۔

24 دسمبر 1809 کو مہاراجا کانگڑہ کے قلعے میں داخل ہوا۔ اسے نذرانہ پیش کرنے والوں میں کانگڑہ کے علاوہ چمبا، نورپور، کولو اور دتارپور کے سردار بھی شامل تھے۔

اب رنجیت سنگھ ایک بار پھر اپنے لوگوں کا سامنا کر سکتا تھا۔ ان تمام گاؤں اور قصبوں کو جہاں جہاں سے اس کا گزر ہوا اُس کے استقبال کے لیے سجا دیا گیا۔ جب وہ جنوری کے آغاز میں امرتسر پہنچا تو گوبند گڑھ کی توپوں نے اسے سلامی دی اور رات کے وقت گولڈن ٹیمپل سمیت امرتسر کے تمام مکانات روشنیوں سے جگمگاتے رہے۔ مہاراجا اپنے سب سے بڑے ہاتھی

پر سوار امرتسر کی روشن گلیوں سے گزرا اور استقبال کرنے والوں پر چاندی کی اشرفیاں نچھاور کیں۔ پٹیالہ، لاہور اور جند میں بھی جشن کا ساماں تھا اور وہاں کے درباروں کے نمائندوں نے بطور خاص جشن میں شرکت کی۔ یوں رنجیت سنگھ کی قسمت پر تھوڑے عرصے کے لیے چھایا گرہن ختم ہو گیا۔

رنجیت سنگھ کی زندگی میں کانگڑہ کی فتح سنگِ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔ دس برس پہلے جب جب وہ پنجاب کا مہاراجا بنا تھا مخالف قوتوں نے چاروں طرف سے اس کی سلطنت کو گھیرا ہوا تھا۔ جبکہ اب اس کا صرف ایک طاقتور ہمسایہ (انگریز) تھا اور اس کے ساتھ بھی رنجیت سنگھ کے مراسم دوستانہ تھے۔

رنجیت سنگھ نے اپنی توجہ پنجاب میں جا بجا پھیلی چھوٹی بڑی ریاستوں کی جانب مبذول کی۔ اب چونکہ مغلوں کا اثر و رسوخ ختم ہو چکا تھا اور شمال کی طرف سے ہونے والے حملوں نے ان کا انتظامی کنٹرول ختم کر دیا تھا ہر گاؤں اور قصبے نے اپنی حفاظت خود کرنا تھی۔ جس شخص کے پاس بھی تھوڑے بہت ذرائع ہوتے وہ اپنا قلعہ تعمیر کر لیتا جتنے زیادہ اوباش لوگوں کی فوج بنا سکتا بنا لیتا اور قریبی گاؤں سے ٹیکس وصول کرتا۔ خود سکھوں نے بھی اسی طرح طاقت حاصل کی تھی لیکن کوئی بھی حکومت ایسی نجی فوج، نجی قلعے یا اسلحہ خانوں کو برداشت نہیں کر سکتی تھی۔ بعد میں یہی قلعے اور فوجیں سرکار کی عملداری کو چیلنج کرنے کے لیے استعمال ہو سکتے تھے۔

اس مشکل سے نمٹنے کے لیے ایک سادہ طریقہء کار اپنایا گیا۔ اگر کوئی مسًلدار مر جاتا حکومت اس کے وارث کو صرف اس صورت میں اس کی جانشینی کی اجازت دیتی جب وہ اپنا قلعہ حکومت کے حوالے کر دیتا، فوج کو ترک کر دیتا اور ریاست کی طرف سے دی گئی جائیداد کا جاگیردار بننا قبول کر لیتا۔ اگر ایک مسًلدار کے خاندان میں تنازع پیدا ہو جاتا تب بھی یہی طریقہء کار اپنایا جاتا۔ اس طرز پر رنجیت سنگھ کی حکومت نے فیاض اللہ پوریا مسًل اور گجرات کے بھنگی سرداروں کی مسًلوں کو دربار میں ضم کیا۔

بلوچ قبائل کے خلاف کارروائیوں کی رنجیت سنگھ نے ذاتی طور پر نگرانی کی۔ مختصر جنگی مہم کے بعد اس نے خوشاب اور ساہیوال پر اپنا قبضہ مضبوط کیا۔ ایک طرف رنجیت سنگھ بلوچ قبائلی سرداروں کو رام کرنے میں مصروف تھا تو دوسری طرف اس کے جرنیل ریاست میں موجود چھوٹی چھوٹی ریاستوں کو لاہور دربار کی مرکزی حکومت میں ضم کرنے میں مصروف تھے۔ دیوان محکم چند نے فیاض اللہ پوریا مسًل کو جالندھر کی ریاست کے ساتھ منسلک کیا؛ میاں غوثا نے تاراں تاراں کے قریبی دیہاتوں پٹی اور دیگر پر کیسری جھنڈے لہرائے؛ حکم سنگھ چمنی نے جموں کو زیر نگیں کیا اور پھر سالٹ رینج میں کسک قلعے پر قبضے میں مہاراجا کی مدد کو پہنچا اس طرح سالٹ رینج میں واقع نمک کی کانوں پر دربار کی اجارہ داری قائم ہوئی؛ دیسا سنگھ مجھیٹیا نے منڈی اور سکوٹ کی پہاڑی ریاستوں پر قبضہ کیا۔ غرض بگولے کی طرح تیز اس جنگی مہم میں ڈسکہ، ہلووال اور جہلم کے مقام پر منگلا دربار کی ریاستوں میں شامل ہوئے جس سے دربار کی فوج کی شمال میں ہمالیہ کی ریاستوں کی جانب پیش قدمی آسان ہو گئی۔

نکئی تو مکمل طور پر ختم ہو چکے تھے۔ دربار پر مہاراجا یا اس کے ولی عہد کے اس مثل سے تعلقات ہونے کی وجہ سے کوئی دباؤ نہیں تھا اور نہ ہی اس بات سے کہ نکئی مثل کا سردار کاہن سنگھ لاہور دربار میں ملازمت کرتا تھا۔ دربار نے کاہن سنگھ کو 20 ہزار روپے مالیت کی جاگیر عطا کی تھی جس میں چونیاں، دیپالپور، شرقپور اور کمالیہ شامل تھے۔ جب نکئی ایجنٹ نے احتجاج کیا تو رنجیت سنگھ نے معصومانہ لہجے میں کہا کیا یہ علاقے شہزادہ کھڑک سنگھ کو واپس نہیں ملیں گے اور کیا شہزادہ نکئی سردار کا نواسا نہیں تھا؟ سدا کور کی مثل کنہیا بھی اس نئی پالیسی کی وجہ سے تھوڑی بہت متاثر ہوئی۔

سدا کور کے زیرِ نگیں علاقوں پر کوئی قبضہ نہیں کیا گیا مگر اس کے برادرِ نسبتی کے علاقے جو دریائے بیاس کے کنارے واقع تھے ریاست میں ضم کر لیے گئے۔ اوپر تلے ان فتوحات نے مہاراجا کو مزید جوش اور ولولہ دیا۔ دو جولائی 1810 کو جب اس نے نئے چاند کو دیکھا تو اسے توپوں کی سلامی دینے کا حکم دیا۔

مہاراجا ابھی خوشاب میں ہی تھا کہ اس نے شاہ زمان کے بھائی شاہ شجاع کی پنجاب آمد کی خبر سنی۔ افغانستان کے واقعات پر بات چیت حالیہ مہمات کے تناظر میں اچھی تبدیلی کا باعث ہو سکتی تھی۔ احمد شاہ ابدالی اور اس کے بیٹے تیمور کے مرنے کے بعد افغانستان میں اصل طاقت شاہی خاندان (جو کہ سدوزئی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا) سے منتقل ہو کر برکزئی قبیلے کو منتقل ہو گئی تھی جس کی سربراہی وزیر فتح خان کر رہا تھا۔ تیمور کے فرزندان زمان، شجاع اور محمود کے درمیان اقتدار کی میوزیکل چیئر جاری تھی۔ زمان جس نے چار مرتبہ ہندوستان کو فتح کرنے کی کوشش کی اب بادشاہ نہیں رہا تھا برکزئیوں نے اس کی جگہ محمود کو کٹھ پتلی حکمران مقرر کر دیا تھا۔ محمود نے زمان کی آنکھیں نکلوا کر اسے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے اقتدار کی رسہ کشی سے باہر کر دیا تھا مگر اب زمان کی جگہ اس کے تیسرے بھائی شجاع نے لے لی تھی اور محمود کو کابل سے نکال باہر کیا تھا۔ جب لارڈ منٹو نے اپنے سفیروں کو افغانستان بھیجا تاکہ فرانسیسیوں کے خلاف انگریز افغان اتحاد قائم کیا جائے تو اس وقت یوں لگتا تھا جیسے شجاع افغانستان کے سیاہ و سفید کا مالک ہے تاہم الفنسٹون (انگریز ایلچی) کے افغانستان سے روانہ ہونے کے تھوڑے عرصہ بعد ہی برکزئیوں نے شجاع کی جگہ محمود کو افغانستان کا حکمران مقرر کر دیا۔ اب جس وقت کی ہم بات کر رہے ہیں شجاع غالباً محمود کے خلاف رنجیت سنگھ کی مدد کی امید لیے پنجاب آیا تھا۔

رنجیت سنگھ نے شجاع کا بڑے پُرتپاک طریقے سے استقبال کیا لیکن ان دونوں کے درمیان کیا بات چیت ہوئی اس کا اندازہ صرف اُن قدامات سے لگایا جا سکتا ہے جو رنجیت سنگھ نے شجاع کے جانے کے بعد اٹھائے۔ بظاہر تو یوں معلوم ہوتا ہے کہ شجاع نے ملتان اور کشمیر پر اپنے حقِ حکمرانی کی بات کی اور رنجیت سنگھ سے اُن علاقوں کو دوبارہ فتح کرنے کے لیے مدد مانگی۔ مہاراجا نے اسے کسی قسم کی یقین دہانی نہ کرائی اور شجاع عجلت میں پشاور کو روانہ ہو گیا۔

اگرچہ رنجیت سنگھ نے شجاع کو کوئی خاص اہمیت نہیں دی تاہم اسے یوں لگا کہ وہ ملتان پر اپنی حکومت دوبارہ سے قائم کرنے کی کوشش کر سکتا ہے اور اس شہر کو اپنی مہمات کے بیس کیمپ کے طور پر استعمال کر سکتا ہے۔ رنجیت سنگھ نے اس امکان کو

ختم کرنے کے لیے اپنی بکھری ہوئی فوجوں کو ملتان کی طرف بڑھنے کا حکم دیا۔

مظفر خان نے انگریزوں کو مدد کے لیے پکارا اس نے ملتان شہر اور قلعہ بھی ان کے حوالے کرنے کی پیش کش کی۔ انگریز معاہدۂ امرتسر کی خلاف ورزی نہیں کر سکتے تھے لہٰذا انھوں نے اپنی لاچاری کا اظہار کیا۔ پھر مظفر خان نے تنِ تنہا رنجیت سنگھ کا مقابلہ کرنے کی ٹھان لی۔

دربار کی فوجوں نے شہر کا گھیراؤ کر لیا۔ سردیوں کا مختصر عرصہ گزرا تو ملتان شہر پر جو ریتلے طوفانوں اور گرم ہوا کی وجہ سے مشہور ہے ریتلی آندھی تھپیڑے برسانے لگی۔ موسم کی شدت نے مہاراجا کو چڑچڑا بنا دیا اور اس نے قلعے میں داخل ہونے کے لیے متعدد غیر روایتی حربے آزمائے۔ اس کی فوج کو اس بے صبری کی بھاری قیمت ادا کرنا پڑی اور کئی جوان اور افسر مارے گئے۔ مظفر خان کو یہ خبر پہنچی کہ قلعے کا محاصرہ کرنے والے ابتری کے عالم میں ہیں تو اس نے قلعے سے نکل کر دربار کی فوجوں پر حملہ کیا۔ حملہ آور فوجوں کو دفاعی حکمتِ عملی اپنانا پڑی اور انھوں نے خندقیں کھود کر مقابلہ کیا۔ تاہم گرمی کی شدت نے دونوں اطراف کی فوجوں کے حوصلے پست کر دیئے اور معاملہ نمٹا لیا گیا۔ مظفر خان نے دربار کی خدمت میں برائے نام خراج ادا کیا تاہم رنجیت سنگھ ملتان کے قلعے کو فتح نہ کر سکا۔

سال 1811 جنگی حالات وواقعات سے بھرپور رہا۔ بمشکل ایک ہفتہ گزرتا کہ لاہوری آدھی رات کے وقت یا دوپہر کو فتح کے جنگی سائرن بجنے یا محاذ سے جنگ کی خبر لانے والوں کے گھوڑوں کی ٹاپوں سے سے ہڑ بڑا کر اُٹھ بیٹھتے پھر توپ کے گولے چلا کر فتح کا اعلان کیا جاتا۔ موسم خزاں کی آمد تک مہاراجا واپس گھر آ چکا تھا۔ وہ قلعے میں واقع اپنے محل سے باہر نکل کر شالیمار باغ آ گیا اور گرم موسم میں گزاری لمبی فوجی مہمات کی تھکن اتارنے لگا۔

دیوالی کے موقع پر مہاراجا نے امرتسر میں ریاست کے سرداروں، جرنیلوں اور مشیروں کا اجلاس طلب کیا۔ عزت مآب صاحب سنگھ بیدی نے اجلاس کی صدارت کی۔ اجلاس کے شرکا نے گزشتہ برس کی مہمات کا جائزہ لیا اور اس بات پر اتفاق کیا کہ اگرچہ دربار کی فوج نے اچھی کارکردگی کا مظاہرہ کیا، پیشہ وارانہ لحاظ سے یہ ابھی تک انگریز فوج سے بہت پیچھے تھی (رنجیت سنگھ کا چچا جند کا بھاگ سنگھ شرکائے اجلاس کو اس بات کا یقین دلاتا رہا)۔ بہت سے بھگوڑے کمپنی کی فوج چھوڑ کر پنجاب آ گئے تھے۔ فقیر عزیز الدین اور بھوانی داس کو ہدایات دی گئیں کہ اُن میں اچھی جسامت والے خوبصورت جوانوں کا انتخاب کرنے کے بعد جتنے زیادہ ممکن ہوسکیں دربار کی فوجوں میں شامل کیا جائے۔ ملتان کا مسئلہ بھی زیر بحث آیا اور اجلاس کے شرکا کا یہ موقف تھا کہ مظفر خان کی طرف سے نذرانے کی ادائیگی کافی نہیں تھی؛ ملتان پنجاب کا اٹوٹ انگ تھا۔ اس کے بعد مہاراجا اور اس کے مصاحب گھوڑوں پر سوار ہو کر سجے سجائے بازاروں سے گزرے اور مقامی لوگوں نے بازار کے دونوں اطراف کھڑے ہو کر ان کا استقبال کیا۔

سال کے اختتام سے پہلے افغان شاہی خاندان ایک بار پھر مہاراجا کے در پر آ چکا تھا۔ شجاع جسے مہاراجا نے خوشاب

کے مقام پر خدا حافظ کہا تھا کسی نہ کسی طرح دوبارہ افغان تخت حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ مگر بہت کم عرصے کے لیے: وزیر فتح خان بارکزئی ایک مرتبہ پھر اس کی جگہ محمود کو تخت پر بٹھانے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ شجاع اٹک پہنچنے میں کامیاب ہو گیا جہاں مقامی گورنر جہاں داد خان نے اسے جلاوطنی کی زندگی گزارنے کی اجازت دیدی۔ پھر یہ شک ہونے پر کہ شجاع وزیر فتح خان کو خوش کرنے کی کوششوں میں مصروف ہے (جہاں داد خان وزیر کا سخت مخالف تھا) اس نے شجاع کو زنجیروں میں جکڑ کر اپنے بھائی اور کشمیر کے گورنر عطا محمد کے پاس بھجوادیا۔ 1

شجاع کی بیگمات اور نابینا بھائی زمان پہلے ہی دربار کی طرف سے مقرر کی گئی پنشن پر راولپنڈی میں رہ رہے تھے۔

رنجیت سنگھ کو جنگی مہمات کے دنوں میں اطلاعات مل رہی تھیں کہ زمان نے چند بیرونی طاقتوں سے کابل میں اپنی حکومت کی بحالی کے لیے رابطہ کیا ہوا ہے اور اس حوالے سے ایلچی بھی بھجوائے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے اپنی ہی ریاست میں زمان کی طرف سے جلاوطن حکومت کے قیام کی کوششوں کو اپنی سبکی محسوس کی۔ زمان کے بیرونی حکمرانوں سے رابطوں کو ختم کرنے کی خاطر اس نے افغان مہمانوں کو نرمی سے یہ تجویز پیش کی کہ وہ پنڈی کی بجائے لاہور آ کر زیادہ تحفظ اور سکون کے ماحول میں رہیں۔ نومبر کے مہینے میں ایک وقت میں لاہور کا فاتح اپنی بیگمات اور رشتہ داروں کے ہمراہ بھکاریوں کی صورت لاہور میں داخل ہوا۔ شاہ کا عزت و احترام کے ساتھ استقبال کیا گیا۔ ریاست کی سرکاری فوج اسے اس کی رہائش گاہ تک چھوڑنے گئی جو شہر سے باہر تعمیر کی گئی تھی۔

وہاں زعفرانی لباس میں موجود مہاراجا خود شاہ زمان کا استقبال کرنے کے لیے پہلے ہی سے موجود تھا۔ اس نے شاہ زمان کو گلے سے لگایا اور ایک ہزار روپے نقد اس کی خدمت میں پیش کیے۔

اس کے تھوڑے ہی عرصے بعد وزیر فتح خان کے ایلچی لاہور دربار آ پہنچے اور مہاراجا سے کشمیر کو فتح کرنے کی درخواست کی جہاں شجاع کو قید میں رکھا گیا تھا۔ وزیر کے ایلچیوں کی آمد نے افغان پناہ گزینوں کا چین سکون برباد کر دیا۔

سال کا اختتام خوشگوار طریقے سے ہوا۔ کرسمس کی آمد کے موقع پر ایک انگریز ایلچی ایواز علی خان گورنر جنرل کی طرف سے ایک بگھی سمیت دیگر تحائف لے کر لاہور دربار پہنچا۔ انگریزوں کی طرف سے اٹھائے گئے اُس خوشگوار اقدام کی بدولت انگریز۔ سکھ تناؤ اور باہمی شک کی فضا کا خاتمہ ہو گیا۔ 1812 کے آغاز میں مٹکاف نے جو دہلی میں ریذیڈنٹ مقرر ہو چکا تھا اپنی حکومت کو یہ رپورٹ بھیجی:

''رنجیت سنگھ کی بڑھتی ہوئی قوت اور مسلسل عروج اس کی ریاست کو آس پاس کی کمزور، منتشر اور بے سمت ریاستوں میں ایک جداگانہ حیثیت عطا کرتی ہے۔ پنجاب میں اس وقت وہ طاقت کے سب سے اعلیٰ درجے پر موجود ہے۔ ریاست کے اندر لوگ اس کے سامنے سر اٹھانے سے ڈرتے ہیں اور ملک سے باہر بھی اس کی تعظیم کی جاتی ہے۔ اس طرح وہ اپنی حکومت بغیر کسی خوف و خطرے یا پریشانی کے نہایت قابلیت کے ساتھ چلا رہا ہے۔''

یہ بات واقعی سچ تھی کہ سال 1812 کے پہلے مہینے میں رنجیت سنگھ سب فکروں اور پریشانیوں کو پس پشت ڈال کر اپنے بڑے بیٹے کھڑک سنگھ کی شادی کو شاندار طریقے سے کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھا۔ مٹکاف نے اپنی مختصر رپورٹ میں کچھ ایسا غلط نہیں کہا تھا: ''کھڑک سنگھ کی شادی ہندوستان میں اب تک ہونے والی شادیوں میں سب سے زیادہ شاندار ہو گی[2]''۔

9

ایک پنجابی شادی

جنوری 1812 میں ہندوستان کے گورنر جنرل، راجوں، مہاراجوں، نوابوں اور معززین شہر کو شہزادہ کھڑک سنگھ کی شادی کے دعوت نامے بھجوائے گئے۔ گورنر جنرل نے کرنل اکٹرلنی کو شادی میں اپنی نمائندگی کے لیے مقرر کیا۔ کرنل اکٹرلنی اپنے ہمراہ ستلج کے اس پار سے پٹیالہ، نابھا، جند، اور کیتھال کے راجے اور سردار بھی لایا۔ دوست دشمن سبھی کو خوش آمدید کہا گیا۔ کانگڑہ سے سنسر چند خود آیا۔ ملتان اور بہاولپور کے نوابوں نے اپنے نمائندے بھیجے۔ شہزادوں، مصاحبوں، درباریوں، عام لوگوں سمیت گھوڑوں، ہاتھیوں اور اونٹوں کی فوج لاہور سے شہزادہ کھڑک سنگھ کی بارات کے ہمراہ روانہ ہوئی۔ امرتسر سے گزرتے ہوئے وہ ضلع گورداسپور میں دلہن کے گاؤں فتح گڑھ آ کر رکے۔ شادی کی تمام رسومات کھلے دل سے ادا کی گئیں۔ مغلوں کے وقت سے آج تک اتنی زبردست شادی غالباً کسی نے نہیں دیکھی ہوگی۔ دلہن کے باپ جیمل سنگھ کنہیا نے شادی پر آئے مہمانوں کو تحائف مثلاً جواہرات، ہاتھی، گائے اور کمخواب وغیرہ سے لاد دیا[1]۔ حتیٰ کہ رنجیت سنگھ کو بھی اس بات کا احساس ہوا کہ وہ بہت فضول خرچی کر رہا ہے۔ اسی لیے جب بارات واپسی کے لیے روانہ ہوئی تو امرتسر کے مقام پر رنجیت سنگھ نے کوشش کر کے نہایت نرمی کے ساتھ مہمانوں کو واپس لوٹ جانے کو کہا۔

لیکن اپنی نرم طبیعت کے باعث وہ انھیں لاہور بلانے سے بھی نہ رہ سکا۔ اکٹرلنی، جند کے بھاگ سنگھ، سنسر چند اور کیتھال کے راجا نے اس کی دعوت قبول کر لی۔

امرتسر پہنچ کر رنجیت سنگھ کرنل اکٹرلنی کو گوند گڑھ لے گیا جہاں ریاست کا خزانہ جمع تھا اور جہاں سوائے انتہائی قابلِ بھروسا ملازموں کے کسی کو جانے کی اجازت نہیں تھی۔ رنجیت سنگھ نے دیوان محکم چند کے احتجاج کو کہ یہ ایک غیر دانشمندانہ قدم ہوگا غالباً اس لیے نظر انداز کر دیا کہ وہ انگریز مہمان پر یہ ثابت کرنا چاہتا تھا کہ معاہدۂ امرتسر دوستی کا معاہدہ تھا اور دوستی صرف

مکمل اعتبار اور اعتماد ہی سے قائم ہو سکتی ہے۔ لاہور میں ایک بار پھر اپنے کئی درباری مصاحبوں کے منع کرنے کے باوجود رنجیت سنگھ کرنل اکٹرلنی کا ہاتھ تھامے اسے قلعے کے ہر حصے کی طرف لے گیا؛ وہ جگہ جہاں بندوقیں / توپیں نصب تھیں، اس کے خفیہ راستے حتیٰ کہ وہ حصے بھی جو سب سے زیادہ کمزور تھے اور ان میں آسانی سے شگاف کیا جا سکتا تھا۔ کرنل اکٹرلنی نے شاندار الفاظ میں مہاراجا کی مہمان نوازی اور برجستہ پن کو خراجِ تحسین پیش کیا۔ رنجیت سنگھ نے کشمیر کو افغانیوں کے قبضے سے چھڑوانے کی خواہش کا اعتراف کیا۔ اس نے اپنی ملتان کی شکست کو بھی برملا تسلیم کیا۔ اس نے انگریزوں کی عسکری قوت کا بہت احترام سے ذکر کیا۔ بعد میں اکٹرلنی اپنی ڈائری میں لکھتا ہے "رنجیت سنگھ اچھی طرح جانتا ہے کہ وہ اس قابل نہیں کہ انگریزوں سے ٹکر لے سکے" رنجیت سنگھ اور کرنل اکٹرلنی دیر تک خیالات کے گھوڑے دوڑاتے رہے۔ ان کے خیال میں پنجابیوں اور انگریزوں کا اتحاد افغانستان اور ایران کو زیرِ نگیں کر سکتا ہے جس سے ہندوستان پر فرانسیسیوں کے قبضے کا خطرہ ہمیشہ کے لیے ٹل جائے گا۔ تاہم اتنی دور جانے سے پہلے یہ دونوں مشترکہ طور پر ملتان اور کشمیر کو فتح کرنا چاہتے تھے۔ اکٹرلنی رنجیت سنگھ کی تجاویز سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے گورنر جنرل کو اس حوالے سے باقاعدہ ایک مراسلہ لکھا۔ چونکہ وہ ایک عملی شخص تھا اس نے لاہور میں ان جگہوں کا دورہ بھی کیا جہاں جنگ کی صورت میں ممکنہ طور پر اسلحہ ڈپو بنائے جا سکیں تاکہ جنگ کے دوران انگریز دستوں کو اسلحے کی بروقت اور مسلسل فراہمی متاثر نہ ہو سکے۔

"میرے ذہن میں یہ خیال بھی پیدا ہو رہا ہے کہ عارضی طور پر جہانگیر کے مقبرے کو غلے اور شراب کے گودام کے طور پر استعمال کیا جا سکتا ہے جو ایک بڑی فوج کو ایک ماہ تک راشن کی ترسیل کے لیے کافی ہوگا۔"

گورنر جنرل کرنل کی طرف سے رنجیت سنگھ کے جذبۂ مہمانداری کو شاندار الفاظ میں یاد کرنے پر بیحد خوش ہوا اور وعدہ کیا کہ وہ رنجیت سنگھ کی طرف سے بندوقوں کا تحفہ مانگے جانے پر غور کرے گا۔ کچھ ہی دنوں کے بعد رنجیت سنگھ کو بندوقوں کا تحفہ موصول ہوا اس کے ساتھ ایک اعلیٰ نسلی کا گھوڑا اور طرح طرح کے مصالحہ جات کی ایک ٹوکری۔ یہی مصالحہ جات دلی میں موجود شہنشاہ کی خدمت میں باقاعدگی سے بھجوائے جا رہے تھے۔ تاہم گورنر جنرل نے مثبت انداز میں رنجیت سنگھ کی طرف سے دی گئی ملتان اور کشمیر کو ایک ساتھ فتح کرنے کی تجویز کو نظرانداز کر دیا اور یہی بات رنجیت سنگھ چاہتا تھا۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ اب انگریز اس کی جنگی مہمات میں کسی قسم کی دخل اندازی نہیں کریں گے۔

10

کشمیر اور کوہِ نور

شادی کے مہمانوں کے رخصت ہوتے ہی افغان مسئلے نے سر اٹھالیا۔ اس سارے عرصے کے دوران وزیر فتح خان کا ایلچی یہ جاننے کے لیے صبر سے رنجیت سنگھ کا منتظر تھا کہ آیا وہ کشمیر کی فتح کے لیے بارکزئیوں کا ساتھ دے گا یا نہیں۔ (فتح وزیر اور رنجیت سنگھ کے درمیان ممکنہ تعاون پر) زمان کے خدشات اپنی جگہ تھے اور اُس سے زیادہ پریشان شجاع کی بڑی بیوی وفا بیگم اور اس کے بیٹے تھے۔ بارکزئیوں اور محمود کے ہاتھوں میں کشمیر کے چلے جانے کا تصور کر کے ہی ان کا دل بیٹھا جا رہا تھا کیونکہ شجاع کہیں اور نہیں کشمیر میں ہی قید تھا۔ انھوں نے رنجیت سنگھ کے آگے فریاد کی کہ وہ خود کشمیر کو فتح کرے اور محمود اور بارکزئیوں کو اس سارے کھیل سے باہر رکھے۔ افغان ایلچی نے رنجیت سنگھ کو کشمیر آپس میں تقسیم کرنے اور دربار کی خدمت میں ہر برس نو لاکھ روپے نذرانے کی تجویز دی۔ پناہ گزیں خاندان نے بھی مہاراجا کو بارکزئیوں کی طرف سے کی جانے والی پیشکش کے جواب میں کچھ دینے کی پیش کش کی، ایک ایسی چیز جس کی کچھ نہ کچھ قیمت تھی، بیش قیمت کوہِ نور ہیرا![1]

موسم بہار کے آغاز میں دربار کی فوجوں کو دیوان محکم چند کے زیرِ سربراہی کشمیر کی طرف کوچ کرنے کا حکم ہوا۔ شہزادہ کھڑک سنگھ بھی بطور قائم مقام حکمران لشکر کی ہمراہی کر رہا تھا۔ جموں اور اکھنوڑ جو پہلے ہی دربار کے علاقوں کا حصہ تھے ان میں فوجی کیمپ قائم کیے گئے؛ بھمبر اور راجوڑی کو حملہ کر کے فتح کیا گیا اور ان شہروں کے سرداروں سلطان خان اور اگر خان کو قیدی بنا کر لاہور لایا گیا۔ موسم گرما کی آمد سے قبل تک مشرق سے کشمیر کو جانے والے تمام راستوں پر پنجاب کا قبضہ ہو چکا تھا۔ وزیر فتح خان جسے دیوان محکم چند کی جنگی چالوں کا اچھی طرح علم تھا فوری طور پر اٹک کے راستے پنجاب میں داخل ہوا۔ جونہی مہاراجا کو افغانیوں کی دراندازی کا علم ہوا وہ فوری طور پر لاہور سے روانہ ہوا اور برق رفتاری سے قلعہ روہتاس کے مقام پر اپنی فوجوں کی صف بندی کی۔ وزیر فتح اب اس کا سامنا کیے بغیر کشمیر کو نہیں جا سکتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے وزیر سے اس کی پنجاب میں

موجودگی کی تحریری طور پر وضاحت طلب کی۔

وزیر نے مہاراجا کو ملاقات کا سندیسہ بھیجا۔ یوں لگتا تھا کہ وزیر کے ایلچی نے اسے درست رپورٹ نہیں دی تھی کہ آیا مہاراجا کشمیر کی فتح میں اس کے ساتھ تعاون کرے گا یا نہیں۔ اُس غیر یقینی کی کیفیت کو ختم کرنے کے لیے اب وزیر فتح پنجاب آیا تھا تا کہ وہ خود مہاراجا کے سامنے اپنی موجودگی کی وضاحت کر سکے۔ وہ وادی کو فتح کرنے کے لیے اتنا پرعزم تھا کہ اس نے رنجیت سنگھ کے عدم تعاون کی صورت میں اس کو مروانے کا منصوبہ بھی بنا رکھا تھا2 تاہم مہاراجا کے رضامند ہونے کی صورت میں وہ کشمیر کی لوٹ مار کو برابر تقسیم کرنے اور نو لاکھ روپے سالانہ نذرانے کی اپنی پیشکش پر قائم تھا3۔ وزیر اپنے اٹھارہ مسلح بھائیوں کے ہمراہ مہاراجا سے ملاقات کرنے آیا۔ اس کے بھائی اس کے ایک اشارے پر مہاراجا کو قتل کرنے کے لیے تیار تھے۔ تاہم مہاراجا کے قتل کی ضرورت ہی پیش نہ آئی کیونکہ رنجیت سنگھ نے اس مہم میں اس کا ساتھ دینے کی تجویز بخوشی تسلیم کر لی۔ اس بات میں کوئی شبہ نہیں کہ رنجیت سنگھ نے اپنی بات پر قائم رہنا تھا جبکہ افغانیوں کا اپنے وعدے پر قائم رہنے کا کوئی ارادہ نہیں تھا۔ رنجیت سنگھ نے اچھی نیت کے ساتھ تجویز دی کہ دونوں فوجوں کو کشمیر پہنچنے کے لیے راجوڑی کے راستے کو اپنانا چاہیے جو پہلے سے دربار کی فوجوں کے قبضہ میں ہے اور مظفر آباد کے راستے سے اجتناب کرنا چاہیے جو سال کے ان دنوں برف سے ڈھکا ہوتا ہے۔

اس نے اپنے بہترین جرنیلوں دیوان محکم چند اور ڈل سنگھ کو بارہ ہزار سپاہی دے کر وزیر فتح کے ہمراہ روانہ کیا۔ دونوں طرف کی فوجیں دسمبر 1812 میں جہلم سے روانہ ہوئیں۔

رنجیت سنگھ کے لاہور واپس پہنچنے پر وفا بیگم کے ہرکاروں نے ایک بار پھر اسے وفا بیگم کے شوہر کی بحفاظت رہائی کے بدلے کوہِ نور ہیرے کی پیشکش کی۔ رنجیت سنگھ نے بھی اسے ایک بار پھر یقین دہانی کرائی کہ ایسا ہی ہوگا۔ دیوان محکم چند کو خاص ہدایات ہیں کہ (کشمیر کی فتح کے بعد) سب سے پہلے شاہ کی بحفاظت رہائی کو یقینی بنایا جائے۔ رنجیت سنگھ کے جہاندیدہ سپہ سالار دیوان محکم چند کو یہ سمجھنے میں زیادہ دیر نہیں لگی کہ وزیر فتح اس کو الو بنا رہا ہے۔ اس نے دربار کو خبردار کیا کہ وزیر فتح نے دو قلعوں پر ان کے خزانے سمیت قبضہ کر لیا ہے اور دربار کو اس میں سے ایک پائی بھی نہیں دی گئی۔ تاہم رنجیت سنگھ نے محکم سنگھ کو واضح ہدایات دیں کہ وہ کسی قسم کے شک یا ناراضی کا اظہار نہ کرے اور فتح خان کی خواہشات کا احترام کرے اور اگر اس نے دربار کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی خلاف ورزی کی تو وہ خود اس سے نمٹ لے گا4۔ افغان لشکر برق رفتاری کے ساتھ دربار کے زیرِ انتظام علاقوں سے گزرا اور بہت جلد دربار کے لشکر سے دو کوس یا اس سے بھی آگے نکل گیا۔ دیوان کو مکمل یقین تھا کہ اگر افغان لشکر ان سے پہلے شیر گڑھ پہنچ جاتا ہے تو وہاں قید شجاع کے ساتھ تشدد آمیز سلوک کیا جا سکتا ہے۔ اس نے ایک مختصر راستے کا انتخاب کیا اور افغان لشکر سے پہلے وہاں پہنچ کر قلعے پر حملہ کر دیا۔ وزیر فتح خان بھی بروقت وہاں پہنچ کر حملے میں شریک ہو گیا اور شیر گڑھ قلعے کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا۔ قلعے کو فتح کرنے کے بعد جہاں ایک طرف افغان سپاہی لوٹ مار

میں مصروف تھے تو دوسری طرف دیوان محکم چند کے سپاہی قلعے کی کوٹھڑیوں اور قید خانوں میں شجاع کو تلاش کر رہے تھے۔ وہ شجاع کو وہاں سے نکال کر اپنے لشکر میں لے گئے۔ وزیر فتح خان نے شجاع کو اس کے حوالے کرنے کا مطالبہ کیا اور جب دیوان نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا تو اس نے طاقت کے استعمال سے ایسا کرنا چاہا۔ جب وہ اس میں بھی ناکام ہو گیا تو اس نے دیوان پر اپنے عہد کو توڑنے کا الزام لگاتے ہوئے مالِ غنیمت میں حصہ دینے سے انکار کر دیا۔ 5

اب رنجیت سنگھ کو وزیر فتح کی بد دیانتی کا یقین ہو چلا تھا۔ اس نے اٹک کے گورنر جہانداد خان (جس کے بھائی عطا محمد کو وزیر فتح نے کشمیر سے بے دخل کیا تھا اور جو وزیر سے اس کا انتقام لینے کے لیے بے چین تھا) سے مذاکرات شروع کر دیئے۔ جہانداد خان کو یہ احساس ہو گیا تھا کہ وہ اکیلا وزیر فتح کا مقابلہ نہیں کر سکتا اسے یہ بھی معلوم تھا کہ اگر وہ وزیر فتح سے شکست کھاتا ہے تو اس کا کیا انجام ہو گا لہٰذا اس نے رنجیت سنگھ کی طرف سے ایک جاگیر کی پیش کش قبول کرتے ہوئے بخوشی اٹک کا قلعہ فقیر عزیز الدین کے حوالے کر دیا۔

رنجیت سنگھ کا پیام بر آدھی رات کے وقت اٹک قلعے پر قبضے کی خبر لے کر آیا۔ مہاراجا کو نیند سے جگا کر یہ خوشخبری سنائی گئی۔ اس خبر پر رنجیت سنگھ اتنا خوش ہوا کہ اس نے محل کے تمام ملازمین کو جگا کر یہ خبر سنائی اور خوشی کے اظہار کے لیے توپوں سے گولے داغنے کا حکم دیا۔ پورے شہر میں توپوں کی آوازیں گونجتی رہیں اور رات بھر کوئی بھی چین سے نہ سو سکا۔ صبح سویرے مہاراجا اپنے ہاتھی پر سوار ہو کر محل سے نکلا اور رعایا میں اشرفیاں اور تحائف تقسیم کرتا ہوا شہر کی گلیوں سے گزرا۔

وزیر فتح کو یہ جان کر شدید جھنجلاہٹ ہوئی کہ وہ قلعہ جس کو ہندوستان میں داخل ہونے کا دروازہ سمجھا جاتا ہے پنجابیوں کے ہاتھوں میں چلا گیا ہے 6 اس نے رنجیت سنگھ کے اس اقدام کے خلاف انتقام لینے کی ٹھان لی اور کشمیر کو اپنے بھائی عظیم خان کے حوالے کرنے کے بعد پشاور لوٹ گیا۔

وہاں سے اس نے رنجیت سنگھ کو خط بھیجا جس میں اٹک قلعہ خالی کرنے اور بصورتِ دیگر نتائج بھگتنے کی دھمکی دی گئی تھی۔ شاہ شجاع کا اسی پرتپاک انداز اور گرمجوشی سے استقبال ہوا جیسا کہ اس کے بھائی کا ایک برس پہلے ہوا تھا۔ اسے (شجاع) کو بحفاظت وفا بیگم کے پاس مبارک حویلی میں پہنچا دیا گیا۔ یہ حویلی افغان پناہ گزینوں کے قیام کے لیے مخصوص تھی۔ اگلے ہی روز افغان کیمپ کو کوہِ نور ہیرے کو مہاراجا کی خدمت میں پہنچانے کا پیغام بھیجا گیا۔ تاہم وفا بیگم یا شاہ شجاع میں سے کسی نے اس پیغام کا جواب دینے کی زحمت گوارا نہیں کی۔ ان کی طرف سے اتنے بیش قیمت ہیرے سے جدائی پر ہچکچاہٹ کا اظہار قابلِ فہم تھا تاہم دربار کے لیے کشمیر کی مہم خاصی مہنگی ثابت ہوئی: 1000 سے زائد جانوں کا نقصان ہوا تھا اور شاہی خزانے پر بھی اس مہم کا اچھا خاصا بوجھ پڑا تھا 7۔ اس کے علاوہ وزیر فتح خان نے دربار کو مالِ غنیمت میں حصہ دیئے بغیر کشمیر پر قبضہ کر لیا تھا اور ظاہر ہے اس کا نو لاکھ روپے سالانہ دینے کا بھی کوئی ارادہ نہیں تھا۔

وفا بیگم کو اس کا وعدہ یاد دلایا گیا تو وہ صاف مکر گئی اور بتایا کہ قندھار میں ایک سود خور نے اس سے دھوکے سے وہ ہیرا

لے لیا تھا۔ رنجیت سنگھ جان گیا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس نے وفا بیگم کو 50 ہزار روپے سالانہ کی جاگیر اور تین لاکھ روپے نقد اس ہیرے کی منہ دکھائی دینے کی پیشکش کی۔ اس پیشکش کا بھی وفا بیگم یا اس کے شوہر پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اب رنجیت سنگھ کے صبر کا پیمانہ لبریز ہو گیا اور اس نے ہیرے کو فی الفور پیش کرنے کا تقاضا کرتے ہوئے اپنے سپاہیوں کو مبارک حویلی کا گھیراؤ کرنے کا حکم دیا۔ شجاع جس کی اب تک شاہی مہمان کے طور پر آؤ بھگت ہو رہی تھی کی حیثیت اب دربار کے قیدی کی ہو کر رہ گئی تھی۔

دن پر دن گزرتے گئے مگر شجاع کی طرف سے کسی ردعمل کا اظہار نہیں ہوا۔ اس کے گھر کو اناج کی فراہمی میں کمی کر دی گئی تھی اور کوتوال کو ہدایات دی گئی تھیں کہ ان سے گھر پر نظر بند قیدیوں والا سلوک کیا جائے۔ شجاع کو معلوم ہو گیا کہ اب اپنی بیوی کی طرف سے کیے گئے وعدے کی پاسداری کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بالآخر ہیرے کو پیش کرنے کی تاریخ مقرر کی گئی۔

یکم جون 1813 کو رنجیت سنگھ 600 گھڑ سواروں کے ہمراہ کوہِ نور ہیرا لینے مبارک حویلی پہنچا۔ شجاع رنجیت سنگھ کے ساتھ بغلگیر ہوا اور اسے شاہی حرم کی طرف لے گیا دونوں ایک دوسرے کی خیریت دریافت کی اور پھر خاموش ہو گئے۔ اس طویل خاموشی سے اکتا کر رنجیت سنگھ نے اپنے ساتھیوں میں سے ایک کے کان میں سرگوشی کی کہ وہ شجاع کو اس کی آمد کے مقصد کی یاددہانی کرائے۔ اس پر شاہ شجاع نے اپنے ایک ملازم کو اشارہ کیا کہ زنان خانے میں جا کر وہ ہیرا لے آئے۔ کچھ دیر بعد ملازم ہاتھوں میں ایک ڈبہ اٹھائے لوٹا اور اسے رنجیت سنگھ کی خدمت میں پیش کیا۔ رنجیت سنگھ نے وہ ڈبہ کھولا تو اس میں سے کوہِ نور ہیرا برآمد ہوا۔ رنجیت سنگھ نے اپنی اکلوتی آنکھ سے ہیرے کا بغور معائنہ کیا اور اچھی طرح گھما پھرا کر اس کا جائزہ لیا۔ رنجیت سنگھ نے تصدیق کی خاطر وہ ہیرا بھوانی داس کے حوالے کیا جو پہلے بھی شاہ شجاع کے خاندان کے پاس کوہِ نور ہیرا دیکھ چکا تھا۔ پھر اس نے وہ ہیرا دوبارہ اس ڈبے میں بند کیا اور شکریہ یا الوداعی کلمات کہے بغیر اٹھ کر حویلی سے باہر نکل گیا۔[8]

رنجیت سنگھ اس مشہور ہیرے کو پا کر بہت خوش تھا۔ ہیرے کو حاصل کرنے کے ایک ہفتے بعد اس نے اس ہیرے کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانے کی خاطر اسے باہر نکالا۔ ایک ہفتے بعد کے مرہٹی نیوز لیٹر (رسالے) کے مطابق: "گزشتہ روز حضور سرکار رنجیت سنگھ کوہِ نور ہیرے کو جو انھیں حضرت شاہ شجاع الملک نے پیش کیا تھا جوہریوں کو دکھاتے رہے اور اس کی قیمت کے بارے میں دریافت کرتے رہے۔ وزن میں یہ تین سو سے کچھ زیادہ شارک (تولے) کے برابر تھا۔ جوہریوں کے نزدیک یہ ایک انمول ہیرا تھا کیونکہ اس کے برابر کا کوئی دوسرا ہیرا دنیا میں موجود ہی نہیں تھا۔"

کوہِ نور دینے کے بعد شاہ شجاع مفلس ہو گیا تھا۔ اسے دربار کی طرف سے وظیفہ ملتا رہا اور ابھی بھی اس کے پاس، جیسا کہ بعد کے واقعات سے ثابت ہوا، خاصے ہیرے جواہرات اور سونا موجود تھا۔

رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے درمیان تعلقات خراب ہوتے چلے گئے۔ اس واقعے کے چند روز بعد رنجیت سنگھ کو شاہ شجاع کی ناشکری اور احسان فراموشی کی ایک ٹھوس شہادت ملی۔ 23 جون 1813 کے شمارے میں یہ واقعہ کچھ یوں درج ہے:

''پیر باتش، مقامی تھانے کا انچارج، دربار میں حاضر ہوا اور بتایا کہ حضرت شاہ شجاع الملک کے ساتھی ملا حسن اور قاضی شیر محمد خان نے اپنی طرف سے سردار فتح خان وزیر کو چند خطوط تحریر کیے ہیں جن پر ان کی اپنی مہر لگی ہے۔ اس کو ان خطوط کا اس وقت علم ہوا جب انھیں لے جانے والے شخص کو دربار کی پولیس نے گرفتار کیا۔ پیر باتش نے وہ خطوط سرکار کی خدمت میں پیش کیے۔ ان خطوط میں لکھا ہوا تھا کہ حضور سرکار کس وقت دربار میں اکیلے ہوتے ہیں اور ان کے پاس سپاہی بھی موجود نہیں ہوتے اور اگر وہ (وزیر فتح) ایسے وقت میں اپنا لشکر بھیج دے تو لاہور پر قبضہ کرنا کچھ اتنا مشکل نہیں ہوگا''

اگر چہ رنجیت سنگھ گرم مزاج شخص نہیں تھا مگر ایک بار اسے غصہ آ جائے تو اس کا پارہ آسمان سے باتیں کرنے لگ جاتا۔ اس نے نابینا شاہ زماں کے بیٹے اور شاہ شجاع کے بھتیجے شہزادہ حیدر اور قاضی شیر محمد خان کو بلا بھیجا اور ان سے سوالات کیے۔ ان کے پاس کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا۔ رنجیت سنگھ نے انھیں شاہ شجاع کے پاس واپس بھیجا اور ان کے رویے کی وضاحت کرنے کو کہا۔ جواب میں شاہ نے لکھا کہ ان لوگوں نے اس کے علم میں لائے بغیر مذکورہ خطوط تحریر کیے تھے اور یہ کہ رنجیت سنگھ ان سے جو چاہے سلوک کر سکتا ہے۔ یہ بات واضح تھی کہ شاہ جھوٹ بول رہا تھا9۔ رنجیت سنگھ اس واقعے میں ملوث افراد کے خلاف مروجہ طریقِ کار سے زیادہ کچھ بھی نہیں کرنا چاہتا تھا۔ دونوں افراد کو گرفتار کرنے کے بعد کوتوال کے حوالے کر دیا گیا۔

شجاع کو دربار طلب کیا گیا۔ 21 اگست 1813 کے جریدے کے مطابق رنجیت سنگھ نے کھڑک سنگھ کو تحریری طور پر حکم دیا کہ شاہ شجاع کو ''کڑے پہرے میں اور بحفاظت'' دربار کے روبرو پیش کرے اور دوسرے خط میں شاہ شجاع سے کہا گیا کہ "حضور سرکار کے ساتھ چند ضروری امور پر تبادلہ خیال کے لیے ''وہ شہزادہ کھڑک سنگھ کے ہمراہ فوراً دربار پہنچے''۔ رنجیت سنگھ اور شاہ شجاع کے درمیان کیا بات چیت ہوئی اس کا کسی کو علم نہیں لیکن یہ بات قرین از قیاس ہے کہ رنجیت سنگھ نے اُس سے جمع کی ہوئی دولت میں سے کچھ مزید کا تقاضا کیا اور شجاع نے ایک بار پھر اس سے انکار کیا۔ رنجیت سنگھ جان گیا کہ شاہ شجاع جھوٹ بول رہا ہے؛ پندرہ روز بعد رنجیت سنگھ نے دربار کو بتایا کہ شجاع کے پاس 25 لاکھ روپے مالیت کے ہیروں والی زین ہے اور قیمتی پتھر فیروزے کا بنا ایک ایسا تخت ہے جس کے ہر پائے پر ایک قیمتی ہیرا جڑا ہے۔ اس نے دربار کے سامنے شاہ شجاع سے وہ قیمتی اشیا طلب کرنے کی تجویز رکھی۔ درباریوں نے اسے محتاط رہنے کی تجویز دی کیونکہ کوہِ نور ہیرے کے واقعے نے پہلے ہی رنجیت سنگھ کو خاصا بدنام کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے دربار کے مشورے کو نظر انداز کرتے ہوئے خواتین پولیس اہلکاروں پر مشتمل ایک ٹیم شاہ شجاع کے حرم کی تلاشی کی غرض سے روانہ کی۔ 4 مارچ 1813 کے سرکاری اخبار نے اس کی تفصیل کچھ یوں بیان کی: ''حضور سرکار کی سیکورٹی کے معاملات سے متعلق انچارج رام سنگھ نے آج دربار میں پیش ہو کر بتایا کہ وہ شاہ شجاع الملک کے ڈیرے پر گیا اور اس سے زیورات کا تقاضا کیا۔ اس نے زنان خانے کی طرف خواتین اہلکار کو یہ ہدایات دے کر روانہ کیا کہ انھیں وہاں سے جو کچھ بھی ملے مثلاً ہیرے، جواہرات، فیروزہ، موتی، چھوٹی صندوقچیاں، قالین یا اور کوئی قیمتی چیز، وہ انھیں اٹھا کر باہر لے آئیں اس آپریشن کے دوران شجاع اونچی آواز کے ساتھ آہ وزاری کرتا رہا اور بار بار یہ کہتا رہا کہ وہ خدا کی

مرضی کے خلاف کوئی مزاحمت نہیں کرے گا۔''

مذکورہ واقعے کے خلاف افغان خاندان سوگ میں چلا گیا اور شاہ شجاع نے کئی روز تک کھانا بھی نہیں کھایا۔ مبارک حویلی کے باہر تعینات سنتریوں کی تعداد میں کمی کر دی گئی اور افغان شاہی خاندان کے افراد کو کسی حد تک نقل و حرکت کی آزادی دی گئی۔ کڑے پہرے میں کمی کا فائدہ اٹھا کر شاہ اور اس کی بیوی لاہور سے فرار ہونے میں کامیاب ہو گئے۔

وفا بیگم نومبر 1814 میں غائب ہو گئی۔ وفا بیگم کے بقول'' کیا اس شخص کو جو اداسی اور سوگ کی کیفیت میں مبتلا ہو باہر نکلنے کا بھی حق حاصل نہیں؟'' رنجیت سنگھ یہ جاننے کے لیے بے تاب تھا کہ اس فرار کی منصوبہ بندی کیسے کی گئی اس نے شاہ شجاع کے چھوٹے بیٹے شہزادہ صغیر سے اس بابت دریافت کیا۔ رنجیت سنگھ نے مبارک حویلی کے دوسرے مکینوں کو فرار سے روکنے کے لیے کوئی اقدامات نہیں کیے گئے نتیجتاً تقریباً پانچ ماہ بعد (13 اپریل 1815) شاہ شجاع کے دو بیٹے اور خاندان کے باقی لوگ بھی پنجاب سے فرار ہو گئے۔ 10

11

اٹک میں فتح، کشمیر میں شکست

وزیر فتح خان کی طرف سے شمال مغربی سرحدی صوبے کے قبائل کو پنجاب کے خلاف کھڑا کرنے کی دھمکی نے رنجیت سنگھ کی اٹک پر قبضے کی خوشیوں پر پانی پھیر دیا۔ اٹک قلعے کے اندر موجود چھاونی اتنی بڑی نہ تھی کہ ایک منظم حملے کا مقابلہ کر سکتی۔ لہٰذا دانشمندی کا تقاضا یہی تھا کہ باہمی گفت وشنید کو جاری رکھا جائے اور رنجیت سنگھ نے ایسا ہی کیا۔ اس نے فتح خان سے مذاکرات جاری رکھے اور دونوں کے درمیان تحائف کا تبادلہ بھی ہوا۔ وزیر خان نے رنجیت سنگھ سے وعدہ کیا کہ اگر وہ اٹک کا قلعہ اس کے حوالے کر دے تو وہ ملتان پر قبضے کی اس کی کوششوں میں مدد کرے گا۔ اس دوران دربار کی طرف سے ایک امدادی لشکر اٹک روانہ کیا گیا۔ پھر آہستہ آہستہ رنجیت سنگھ کے خطوط کا لب ولہجہ تبدیل ہوتا چلا گیا: اس نے افغان سردار پر واضح کر دیا کہ وہ اس وقت تک اٹک کے قلعے کے موضوع پر بات نہیں کرے گا جب تک وہ اس کے لیے ملتان فتح نہیں کر لیتے۔ اٹک پر اپنے قبضے کو مضبوط کرنے کی خاطر دربار کی فوج نے قلعہ سے کچھ آگے ہری پور کے مقام پر ایک چوکی کو بھی قبضے میں لے لیا۔ وزیر فتح خان نے رنجیت سنگھ سے گستاخانہ انداز میں بات کی اور پھر مقامی قبائل کو کافروں کو اپنے علاقے سے نکال باہر کرنے کے لیے رنجیت سنگھ کے خلاف بھڑکانا شروع کر دیا۔ افغان لشکر نے اٹک کے آس پاس کے علاقے کو گھیرے میں لے کر لاہور کے ساتھ اس کا رابطہ منقطع کر دیا۔

مہاراجا نے دیوان محکم سنگھ کو اس فوجی آپریشن کا نگران مقرر کیا۔

دیوان محکم چند نے ہری سنگھ نلوا اور میاں غوثا کا بطور حملہ آور جتھے کے سربراہ کے انتخاب کیا اور پنجاب کی اصل فوج کے ساتھ ان کے پیچھے چل پڑا۔ پنجابیوں نے دریائے اٹک عبور کیا اور فتح خان وزیر اور اس کے سپاہیوں کے سامنے آکر صف بندی شروع کر دی۔ تین ماہ تک دونوں فوجیں بغیر جنگ کیے ایک دوسرے کے سامنے صف آرا رہیں۔ سردیوں کے بعد مختصر

مدت کے لیے بہار کا موسم آیا اور پھر شدید گرمیاں شروع ہو گئیں۔ تب دیوان نے اپنی فوج وزیر خان اور دریا کے درمیان لا کھڑی کی اور خط کے ذریعے مہاراجا سے جنگ شروع کرنے کی اجازت چاہی۔ اسے مہاراجا کے جواب کا انتظار نہیں کرنا پڑا کیونکہ افغان فوج جو پینے کے پانی سے محروم ہو چکی تھی خود ہی حملہ کرنے پر مجبور ہو گئی۔ دریا تک پہنچنے کے لیے انھوں نے پنجابیوں پر متعدد حملے کیے مگر وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔ رنجیت سنگھ کے بہادر سپہ سالار دیوان محکم چند نے اپنے ہاتھیوں کی ٹانگیں زنجیر سے باندھی ہوئی تھی تا کہ افغان حملے کے نتیجے میں کہیں اس کی فوج کے پاؤں نہ اکھڑ جائیں۔ افغان حملوں کے جواب میں پنجابی فوج کی طرف سے گولہ بارود برسایا گیا۔ پنجابی دریا کے پانی سے پیاس بجھا کر واپس میدان جنگ میں پہنچ جاتے جبکہ افغان فوج کو پانی کے بغیر جولائی کی سخت گرمی میں یہ مقابلہ کرنا پڑا۔ پنجابیوں نے افغان حملہ آوروں کو اس وقت روکے رکھا جب تک وہ پیاس اور تھکاوٹ سے نڈھال نہ ہو گئے تب دیوان نے اپنے پیدل دستوں کو حملے کے آغاز کا حکم دیا۔ افغان سپاہی اس حملے کی تاب نہ لا سکے اور دو ہزار سے زائد لاشیں اور بھاری اسلحہ چھوڑ کر فرار ہونے پر مجبور ہو گئے۔[1]

پٹھانوں کے خلاف یہ پنجابیوں کی پہلی فتح عیسوی تھی۔ اٹک کے مقام پر اس لڑائی کی اور زیادہ اہمیت تھی اس قلعے کو روایتی طور پر ہندوستان کا پہریدار سمجھا جاتا رہا ہے۔ 1000 عیسوی میں محمود غزنوی نے ہندو راجا جے پال سے یہ قلعہ چھینا تھا تب سے یہ قلعہ بیرونی حملہ آوروں کے قبضے میں چلا آ رہا تھا اس پر دوبارہ قبضے کا مطلب واضح تھا: شمالی ہندوستان کی افغان حملہ آوروں سے آزادی۔

جب اٹک کے قلعے کی فتح کی خبر لاہور پہنچی تو پورا شہر خوشی سے بے قابو ہو گیا۔ شہر میں ہر قسم کا کاروبار روک دیا گیا اور لوگ باہر سڑکوں پر نکل آئے اور مسرت کے عالم میں ناچنے گانے لگے لاہور قلعے کی توپوں نے بھی گرجنا شروع کر دیا مہاراجا بھی لوگوں کی خوشیوں میں شریک ہونے کے لیے اپنے محل سے باہر نکل آئے اور خوشیاں مناتے ہجوم میں حسبِ معمول اشرفیاں نچھاور کرنے لگا۔

اٹک کی فتح رنجیت سنگھ کے سر پر سوار ہو گئی اور مہاراجا نے جولائی میں باقاعدہ دربار لگا کر اپنے درباریوں سے اٹک قلعہ کی فتح کی مبارکباد وصول کی۔ اس موقع کی تفصیل بیان کرتے ہوئے خبر نگار لکھتا ہے کہ بعض درباریوں کے مطابق وقت آ گیا تھا کہ انگریزوں سے جو کہ دوستی کا نقاب چڑھا کر ہماری شدید مخالف کرتے ہیں دو دو ہاتھ کر لیے جائیں۔ رنجیت سنگھ نے اس تجویز کا کچھ یوں جواب دیا "پشاور اور کشمیر کو فتح کر لینے کے بعد اس موضوع پر بھی سوچا جا سکتا ہے۔"[2]

اٹک کو فتح کیے بمشکل ایک ماہ ہی گزرا ہوگا کہ رنجیت سنگھ کا دماغ ایک بار پھر کشمیر کی وادی کی طرف مڑ گیا۔ اور جب ایک بار کسی چیز کا خیال اس کے ذہن میں آ جاتا تو پھر اسے کچھ اور سجھائی نہیں دیتا تھا۔ دسہرے کے سالانہ جشن اور دیگر سرداروں کی موجودگی میں اس نے اپنے منصوبے کا اعلان کیا۔ دیوان محکم چند نے اسے اس مہم جوئی سے باز رہنے کا مشورہ دیا کیونکہ یہ

وقت پہاڑی علاقے میں مہم جوئی کے لیے موزوں نہیں تھا۔لیکن گرم مزاج رنجیت سنگھ سن رسیدہ دیوان محکم چند کی بات بھلا کب سُننے والا تھااس نے دیوان کے لاابالی بیس سالہ پوتے رام دیال کو کشمیر پر حملہ کرنے والے لشکر کی قیادت سونپتے ہوئے کوچ کا حکم دیا۔

کشمیر کی طرف جاتے ہوئے مہاراجا امرتسر، پٹھان کوٹ، اور دیگر شہروں سے گزرا اور سیالکوٹ آ کر سپاہیوں کے قیام و طعام کے لیے پہاڑوں کے دامن کا انتخاب کیا۔ سپاہیوں کے اکٹھے ہونے اور حملے کی تفصیلات طے ہونے تک موسم خزاں گزر گیا اور موسم سرما یعنی سردیاں آن پہنچیں۔ رنجیت سنگھ قلعہ روہتاس کی طرف بڑھ گیا۔ اس دوران اسے پہلے سے اگلے محاذ پر بھیجے ہوئے سپاہیوں کی طرف سے اطلاع پہنچی کہ پیر پنجال سے کشمیر کو جانے والا راستہ قبل از وقت ہونے والی برفباری کی بنا پر بند ہو چکا تھا۔ اسی دوران یہ اطلاع بھی موصول ہوئی کہ فتح خان وزیر نے دربار کے لشکر کی نقل و حرکت پر گہری نظر رکھی ہوئی ہے اور اس بات کا قوی امکان ہے کہ دربار کی فوجوں کے پہاڑی راستے پر پھنس جانے کی صورت میں وہ پنجاب کے جنوب میں واقع ملتان کی سمت سے پنجاب پر حملہ کروا دے۔ یہ خبر موصول ہوتے ہی رنجیت سنگھ نے اپنے لشکر کا کچھ حصہ رام دیال کی کمان میں دیا اور یہ حکم دیتے ہوئے کہ موسم بہار میں حملہ کی بھرپور تیاری کی جائے واپس اپنے دارالحکومت لاہور کو چلا گیا۔

رام دیال نے سردیوں کا موسم علاقے میں راشن ڈپوؤں کی شاخیں کھولتے، وہاں موجود قلعوں کی مضبوطی، وہاں کے لوگوں کی وفاداری اور راجوڑی کے اگلے مورچوں اور کشمیر کے درمیان خوراک کی بلاتعطل ترسیل کے بارے میں معلومات جمع کرتے گزار دیا۔

پہاڑوں پر برف پگھلنے کی خبر ملتے ہی دربار کی فوج نے پیش قدمی شروع کر دی۔ جون کے مہینے میں 50 ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر وزیر آباد کے قریب خیمہ زن ہو گیا۔ دیوان محکم چند پھلور کے مقام پر بیمار پڑا تھا اور اس کی ذمہ داریاں ایک بار پھر اس کے بہادر مگر ناتجربہ کار پوتے رام دیال کو سونپ دی گئیں۔ پنجاب کے تمام معروف جرنیل فوج میں شامل تھے۔۔۔ ہری سنگھ نلوا، میت سنگھ بھرنیا، جودھ سنگھ خالصہ اور ماہر توپچی میاں غوثا۔ رام دیال نے 30 ہزار سپاہیوں کے ہمراہ بارم گولا اور شوپیاں کی طرف پیش قدمی کی۔ باقی ماندہ فوج رنجیت سنگھ کی ذاتی نگرانی میں پونچھ کی طرف بڑھی۔ دربار کی فوج نے جولائی کے آخری ہفتے میں باقاعدہ پیش قدمی کا آغاز کیا اور ٹھیک اسی وقت پہاڑوں پر مون سون بارشیں برسنا شروع ہو گئیں۔

مہاراجا راجوڑی میں پھنس کر رہ گیا تھا جبکہ رام دیال کی فوج جرات اور حوصلے سے آگے بڑھتی رہی یہاں تک کہ یہ بارم گولا کو جانے والے تنگ راستے پر آن پہنچی۔ اس مقام پر قریب موجود چھوٹے قلعے سے لشکر پر گولے برسنے لگ گئے وادی کی دوسری طرف موجود قلعے تک پہنچنا ممکن دکھائی نہ دیتا تھا جس کے راستے میں ایک پہاڑی چشمہ اور سینکڑوں فٹ بلند قلعے کی دیواروں سے ابلتی گولیاں حائل تھیں۔

اگر خان جو ابھی چند سال پہلے تک دربار کا قیدی تھا رام دیال کی مدد کو پہنچا۔ وہ رام دیال کو ایک ایسی گہری گھاٹی کے

سرے پر لے گیا جہاں آبشاروں نے پتھروں اور چٹانوں کے بیچ راستہ نکالا ہوا تھا۔ رام دیال نے اپنے ہاتھیوں کے پاؤں زنجیر سے باندھے اور انھیں اس تنگ راستے پر کھڑا کر دیا یوں اس کی فوج ہاتھیوں کے اوپر پاؤں رکھتے ہوئے پہاڑی راستے تک پہنچی اور دشمن پر زوردار حملے کا آغاز کیا۔ اس حملے کے نتیجے میں بارم گولا کا پہاڑی قلعہ 20 جولائی 1814 کو فتح ہوا۔

یہ فوجی دستہ آدم پور اور ہری پور سے ہوتا ہوا شوپیاں جا پہنچا۔ یہاں وزیر فتح خان کا بھائی عظیم خان جو کشمیر کا گورنر بھی تھا اپنے افغان سپاہیوں کے ہمراہ موجود تھا۔ تیز بارش نے پہلے ہی پنجابیوں کی مشکلات میں اضافہ کر دیا تھا جبکہ افغان سپاہی بارش سے محفوظ جگہوں پر مورچہ بند تھے۔ رام دیال نے اضافی فوج کے انتظار میں لڑائی کو ملتوی کرنے کا فیصلہ کیا۔ رنجیت سنگھ نے بھایا رام سنگھ کو پانچ ہزار سپاہیوں کے ہمراہ شوپیاں روانہ کیا۔ عظیم خان کے سپاہیوں نے رام سنگھ کی فوج کو تگنی کا ناچ نچا دیا اور ایک جگہ رکنے پر مجبور کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے بھی پونچھ کے مقام پر کوئی خاص فتح حاصل نہیں کی۔ اس کی جانب سے آگے کی طرف پیش قدمی کرتے ہی علاقے کی ساری آبادی گھروں کو چھوڑ اور فصلوں کو جلا کر علاقہ چھوڑ کر چلی گئی۔ اس طرح رنجیت سنگھ کے لشکر کے لیے خوراک کا مسئلہ شدت اختیار کر گیا اور پونچھ کے نشانہ باز رنجیت سنگھ کے سپاہیوں کو دور دراز کے علاقوں میں خوراک کی تلاش کے لیے جانے کی اجازت دینے والے نہیں تھے ابھی اس مشکل نے دربار کی فوج کی جان نہیں چھوڑی تھی کہ پنجابی لشکر میں ہیضے کی وبا پھوٹ پڑی (میاں غوثا بھی اس کا شکار ہو گیا اور لاہور جاتے ہوئے راستے میں دم توڑ گیا)۔ افغانیوں اور پونچھ کے سپاہیوں نے حملہ کر کے رنجیت سنگھ کو پہاڑوں سے پسپا ہونے پر مجبور کر دیا۔

تاہم رام دیال کسی نہ کسی طرح میدان میں ڈٹا رہا۔ وہ کشمیر کے دارالحکومت سری نگر سے زیادہ دور نہیں تھا عظیم خان کے لیے پنجابیوں کی اس کے علاقے میں لمبے عرصے تک موجودگی مشکلات پیدا کر سکتی تھی پس اس نے رام دیال کے ساتھ مذاکرات کا آغاز کر دیا۔ دونوں طرف سے تحائف کا تبادلہ ہوا۔ عظیم خان نے رنجیت سنگھ کے لیے دوستی کے کلمات کا اظہار کیا اور عہد کیا وہ کبھی بھی مہاراجا کے دشمنوں کے ساتھ ہاتھ نہیں ملائے گا۔ اس طرح رام دیال خود کو ایک مشکل صورتحال سے نکال کر لاہور کی طرف لوٹ آیا۔[3]

کشمیر میں یہ رنجیت سنگھ کی دوسری ناکامی تھی اس کی عزت وافتخار کے لیے ایک دھچکا۔ ابھی ایک اور بڑا دھچکا اس کا منتظر تھا۔

دسہرا کے تہوار کے بعد رنجیت سنگھ آرام کی خاطر کچھ دنوں کے لیے شالیمار باغ چلا گیا وہاں 29 اکتوبر 1814 کو اسے اپنے سپہ سالار دیوان محکم چند کے انتقال کی خبر موصول ہوئی (پھلور کے مقام پر اس کا انتقال ہوا)۔ مہاراجا صدمے سے نڈھال ہو گیا۔ وہ نہ صرف عسکری معاملات میں دیوان محکم چند کی رائے لیتا تھا بلکہ اسے اس طرح عزت اور تعظیم دیتا تھا جیسے وہ اس کا سگا باپ ہو۔ جنرل محکم چند کی آخری رسومات پورے فوجی اعزاز کے ساتھ ادا کی گئیں اور تمام ریاست میں سوگ کا اعلان کیا گیا۔ اس کے بیٹے موتی رام کو اس کا جانشین مقرر کیا گیا اور پوتے رام دیال کو فوج میں اس کے عہدے پر مستقل کر دیا گیا۔

لاہور کے مشرق میں گورکھوں اور انگریزوں کے درمیان جھڑپیں شروع ہو جانے کے باعث رنجیت سنگھ کو اپنی فوجی مہمات کچھ عرصہ کے لیے معطل کرنا پڑیں۔ نیپال سے ایک ایلچی پرتھی بلاس لاہور رنجیت سنگھ کے دربار میں حاضر ہوا اور ہندوستان سے انگریزوں کو نکال باہر کرنے کے لیے مدد کی درخواست کی۔ رنجیت سنگھ کو ہندوستان اور ہندوؤں کا "محافظ" اور "آخری امید" جیسے خوشامدانہ القابات سے مخاطب کرنے کے علاوہ اس نے مہاراجا کو گورکھوں کے ساتھ تعاون کرنے کے بدلے بڑی رقم کی پیشکش بھی کی۔ پرتھی بلاس نے رنجیت سنگھ کو انگریزوں اور گورکھوں کی پہاڑوں میں ہونے والی مڈبھیڑ کے بارے میں بھی بتایا جس میں اس کے بقول انگریزوں کو میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا تھا۔ گورکھوں کے نمائندے نے رنجیت سنگھ کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ انگریز اس طرح ناقابلِ تسخیر نہیں جتنا انھیں سمجھا جاتا ہے۔

دربار چھ برس پہلے گورکھا سردار امر سنگھ تھاپا کی طرف سے اکٹرلنی کو گورکھوں کے ساتھ مل کر لاہور پر قبضہ کرنے کے لیے دی جانے والی تجویز ابھی نہیں بھولا تھا یہ اکٹرلنی ہی تھا جس نے گورکھوں کی تجویز کو مسترد کر دیا تھا4۔ دربار میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ اس مشکل گھڑی میں مدد کے ذریعے انگریزوں کو ان کی نیکی کا جواب دینے کا وقت آ گیا ہے۔ فقیر عزیز الدین کو کرنل اکٹرلنی کے پاس مدد کی پیش کش کرنے کے لیے بھیجا گیا۔ گورکھوں کے خلاف جنگ میں انگریزوں کا پلڑا پہلے ہی بھاری ہو چکا تھا۔ گورنر جنرل نے مہاراجا کو شکریے کا خط بھیجا تاہم اس نے کسی قسم کی امداد حاصل کرنے سے انکار کر دیا۔ یہ بات سب جانتے تھے کہ رنجیت سنگھ بغیر مطلب کے کوئی بھی کام نہیں کرتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے لاہور میں بیٹھ کر انگریزوں اور گورکھوں کے درمیان لڑائی کا بغور مشاہدہ کیا۔ ساتھ میں اس نے پنجابیوں کو کشمیر میں ہونے والی شکست کا تجزیہ بھی کیا۔ یہ بات واضح تھی کہ اس کے سپاہی پہاڑی علاقے میں جنگ کے قابل نہیں تھے۔ اس نے 1809 میں گورکھوں کے ساتھ گنیش گھاٹی کے مقام پر ہونے والی جھڑپ کو یاد کیا؛ اس کی فوج میں بھی گورکھا قبیلے کے باغی شامل تھے اس نے گورکھوں کی بڑی تعداد کو اپنی فوج میں شامل کیا ہوا تھا بلکہ چند بٹالین ایسی بھی تھیں جو صرف گورکھا سپاہیوں پر مشتمل تھیں۔ اس کو یوں لگا کہ اس کی فوج کا انتظام و انصرام مناسب طریقے سے نہیں کیا جا رہا۔ مختلف گوداموں کی خریداری، اسلحہ کے حصول اور تنخواہوں کی ادائیگی میں ابہام پایا جا رہا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ایک دو برس پہلے کشمیر سے تعلق رکھنے والے گنگا رام کو دربار میں اکاؤنٹنٹ بھرتی کیا تھا۔ فوج میں بڑھتے ہوئے احساس محرومی کا تدارک کرنے کے لیے اس نے گنگا رام کو فوج کے تمام مالی معاملات اپنے ہاتھ میں لینے کا حکم دیا۔ اس کی سفارش پر ایک اور کشمیری پنڈت دینا ناتھ کو اس کا معاون مقرر کیا گیا5۔ ان دونوں افراد کی تعیناتی یا رقم کی خرد برد سے زیادہ سنگین بات وہ جارحیت تھی جس کا دربار کی فوج کو کشمیر میں سامنا کرنا پڑا اور جس کا نتیجہ کشمیر میں لاہوری فوج کی شکست کی صورت میں نکلا۔ اس شکست سے شہ پا کر بھمبر اور راجوڑی کے سرداروں نے لاہور دربار کے احکامات کی کھلم کھلا خلاف ورزی کرنا شروع کر دی تھی۔ دسہرے سے فارغ ہو کر مہاراجا نے اپنی فوج کے ایک دستے کے ہمراہ

وزیر آباد کی طرف پیش قدمی کی اور وہاں پہنچ کر اُسے آگے مختصر فوجی مہم پر روانہ کیا جس کے نتیجے میں بھمبر، راجوڑی اور کوٹلی دربار کی سلطنت میں شامل ہوئے۔ جنوری 1816 میں فوجی دستے نور پور، جسون اور کانگڑہ کی وادی کو روانہ کیے گئے۔ دربار کی فوجوں کی نقل وحرکت سے اس بات کے اشارے ملنے لگے کہ کشمیر کو فتح کرنے کی ایک اور کوشش کی جاسکتی ہے۔ پہاڑوں پر سے برف پگھلنے لگی تو ہر شخص اس بات کی توقع کرنے لگا کہ رنجیت سنگھ کسی بھی وقت کشمیر پر چڑھائی کا اعلان کر سکتا ہے لیکن متلون مزاج رنجیت سنگھ نے اپنی فوج کو جنوب کی طرف بڑھنے کا حکم دیا جہاں مارچ سے آگے چھ ماہ تک وہ علاقہ شدید گرمی کی لپیٹ میں رہتا ہے۔

جنوب کی طرف پیش قدمی کا مقصد ان علاقوں سے وزیر فتح خان کو دور رکھنا تھا۔ اس کے علاوہ جنوب میں موجود ریاستوں کے نواب دربار لاہور کو ٹیکس کی ادائیگی میں خاصے سست تھے۔

دربار کی فوج کا بڑا حصہ مصر دیوان چند کی قیادت میں دے دیا گیا جس نے مختصر سے عرصے میں مہاراجا کی نظروں میں جگہ بنالی تھی؛ باقی ماندہ فوج کو رنجیت سنگھ خود کمان کر رہا تھا۔ چونکہ علاقے کے مسلمان نواب سکھوں سے ہونے والی ہر جھڑپ کو ''جہاد'' سے تشبیہ دیتے اس طرح وہ اپنی فوج میں مقامی آبادی کی بڑی تعداد شامل کرنے کے قابل ہو جاتے۔ رنجیت سنگھ نے اکالی پھلا سنگھ کو اپنے نہنگ لانے کا حکم دیا ہوا تھا۔

دیوان چند کا پہلا مقصد بہاولپور کو زیرِ نگیں کرنا تھا۔ ریاست کے نواب نے 80 ہزار روپے دے کر اپنی جاں بخشی کرائی اس نے ہر سال 70 ہزار روپے ادا کرنے کا وعدہ بھی کیا۔ ملتان کے مظفر خان نے ہمیشہ کی طرح دربار کی فوجوں کو کچھ خاص اہمیت نہیں دی بلکہ ان کی راہ میں رکاوٹیں حائل کرنے کی کوشش کی۔ نتیجے کے طور پر دربار کی فوج نے اس کے چند قلعوں پر قبضہ کر لیا اور اکالی پھلا سنگھ کے نہنگ لڑاکوں نے ملتان کے مختلف حصوں میں لوٹ مار کا بازار گرم رکھا یہاں تک کہ نواب مظفر خان دربار کی فوجوں کو بقایاجات کی ادائیگی پر رضامند ہو گیا۔ منکیرہ کے نواب کے ساتھ بھی یہی ترکیب استعمال کی گئی۔

ملتان، ریگستان کا قلب رنجیت سنگھ کے لیے خاصا پریشان کن ثابت ہوا اور اس نے واپس لاہور کا قصد کیا تاہم اس کی فوج نے پیش قدمی جاری رکھی۔ احمد خان سیال کی جاگیر (اس نے گزشتہ تین برسوں سے ٹیکس نہیں بھجوایا تھا) دربار کے ساتھ منسلک کر دی گئی۔ نواب کے ساتھ پنشن اور جاگیر کا وعدہ کیا گیا۔ دوسری طرف فتح سنگھ اہلیا نوالہ نے اُچ شریف پر قبضہ کرنے کے بعد اسے دربار کے علاقوں میں شامل کر لیا۔

بعد ازاں موسمِ گرما میں ہی ملتان کے نواب مظفر خان کی طرف سے نواب عبدالصمد خان جس کا تعلق دین پناہ سے تھا لاہور دربار کے روبرو پیش ہوا اس نے شکایت کی کہ رنجیت سنگھ کے نامزد کیے نواب اور حکمران مقامی لوگوں کے ساتھ ناروا سلوک روا رکھے ہوئے ہیں۔ رنجیت سنگھ نے اس کی شکایات خندہ پیشانی سے سنیں، اس کا گرمجوشی سے استقبال کیا اور ریاست

کا مہمان بن جانے کی پیش کش کی۔مبارک حویلی کو جو شاہ شجاع کے خاندان چھوڑنے کے بعد سے خالی پڑی تھی عبدالصمد خان کے حوالے کردیا گیا۔رنجیت سنگھ کی طرف سے دین پناہ کے نواب عبدالصمد خان کا بڑھ چڑھ کر استقبال کرنا صاف ظاہر کررہا تھا کہ مہاراجا اسے ملتان پر قبضے کے لیے استعمال کرنے والا تھا۔

کشمیر اور ملتان پر فوجی چڑھائی کے لیے اب تمام راستے صاف ہو چکے تھے۔لیکن پہاڑوں یا ریگستان کی طرف جانے کا فیصلہ کرنے سے قبل گھر میں اٹھنے والے ایک مسئلے نے اس کی توجہ اپنی طرف مبذول کرادی۔

رنجیت سنگھ اپنے جانشین اور تختِ لاہور کے وارث کھڑک سنگھ کی پرورش اور تربیت کی وجہ سے خاصا فکرمند تھا۔اگرچہ نوجوان کھڑک سنگھ طبعاً شریف اور اچھی عادت واطوار کا مالک تھا مگر ذہانت میں وہ کچھ ایسا خاص تیز نہ تھا۔رنجیت سنگھ نے اسے اہم ذمہ داریاں سونپی ہوئی تھیں تاکہ اسے مستقبل میں ریاست کے سربراہ کی حیثیت سے اہم امور انجام دینے کا تجربہ ہو جائے۔ اسے زمینوں کا انتظام چلانے اور مختلف مہمات کی سربراہی کرنے کا کام سونپا گیا۔ایک قابل افسر بھایا رام سنگھ کو اس کا ساتھی اور اتالیق (تربیت کار) مقرر کیا گیا۔

بھایا رام سنگھ کشمیر کی مہم میں شرمناک کارکردگی کے باعث سب کی نظروں میں معتوب ٹھہرا تھا۔عوام کی تنقید نے دوسرے درباریوں کا بھی حوصلہ بڑھایا اور وہ طرح طرح کی افواہیں پھیلانے لگے کہ بھایا رام سنگھ نے شہزادہ کھڑک سنگھ کی جاگیر سے خوب مال وزر کمایا ہے۔مہاراجا نے کھڑک سنگھ اور رام سنگھ کو طلب کیا اور انھیں حساب کتاب کے تمام کھاتہ رجسٹر پیش کرنے کا حکم دیا۔رام سنگھ جب مہاراجا کے حضور پیش ہوا تو اس کی حالت غیر تھی اور وہ بہی کھاتوں میں پکڑی جانے والی بہت سی بے قاعدگیوں کی وضاحت پیش نہ کرسکا۔اس پر رنجیت سنگھ بھرے دربار میں اپنے غصے پر قابو نہ رکھ سکا اور اپنے بیٹے کو نظروں سے دور ہو جانے کا حکم دیا۔رام سنگھ کو اسی وقت گرفتار کرلیا گیا۔

رام سنگھ سے کی جانے والی تفتیش کے نتیجے میں یہ بات ثابت ہوگئی کہ اس نے بے تحاشا مال بنایا اور شہزادے کی جاگیر سے ہونے والی آمدنی میں اچھی خاصی خرد برد کی تھی۔امرتسر میں موجود اس کے منیم سے اس کے کھاتے میں پانچ لاکھ روپے اور زیورات برآمد ہوئے جنھیں سرکار نے ضبط کرلیا۔اس واقعے کے بعد کئی روز تک کھڑک سنگھ دربار کی طرف آنے سے اجتناب کرتا رہا۔

مہاراجا کے مشیروں کے مطابق وہ اپنے بیٹے کے ساتھ ضرورت سے زیادہ سختی سے پیش آیا اور اگر وہ واقعی کھڑک سنگھ کو اپنا جانشین دیکھنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ وہ عوام کی نظروں میں اُس کی ساکھ بنانے پر توجہ دے نہ کہ اس کی تذلیل کرے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے بیٹے کے ساتھ اختلافات کی افواہوں کو ختم کرنے کے لیے 27 ستمبر 1816 کو دربار کا اجلاس طلب کیا اور تمام سرداروں اور معززین کی موجودگی میں کھڑک سنگھ کے ماتھے پر اپنے جانشین کی حیثیت سے زعفرانی نشان لگایا۔

کھڑک سنگھ کی بطور پنجاب کے جانشین تاجپوشی کی تقریب کے ایک ماہ بعد مہاراجا دیوالی منانے کے لیے امرتسر روانہ ہوا۔ دیوالی کی شام کو شہر میں زلزلے کے شدید جھٹکے محسوس کیے گئے اور طوفانی ہواؤں نے لوگوں کو چراغاں کرنے نہیں دیا۔ یہ قصہ یہیں ختم نہیں ہوا اور اسی رات محل کے نگران اعلیٰ جمعدار خوشحال سنگھ کو دورہ پڑا اور اس بات کا خدشہ پیدا ہو گیا کہ وہ اپنا دماغی توازن کھو بیٹھا ہے۔ ان منفی واقعات کی تعبیر کچھ اس طرح کی گئی کہ یہ سب مہاراجا کی طرف سے کسی شخص کے ساتھ ناروا سلوک کا نتیجہ ہے۔ ایک وہمی شخص ہونے کے ناتے رنجیت سنگھ نے فوراً جوالا مکھی کا رخ کیا اور دیوی کے چرنوں میں بیٹھ کر بلاؤں سے نجات کی دعا کرنے لگا۔ جن لوگوں نے مہاراجا کی نرم دلی اور متغیر حالت کا فائدہ اٹھایا ان میں شہزادہ کھڑک سنگھ بھی شامل تھا اس نے مہاراجا سے اپنے منیم بھایا رام سنگھ کے لیے معافی حاصل کر لی۔ بھایا رام سنگھ کو نہ صرف رہائی مل گئی بلکہ اسے تحائف سے لاد دیا گیا۔ رام سنگھ کو دربار میں شامل ہونے والے کچھ نئے علاقوں کی ذمہ داری مل گئی جن میں رام گڑھیا مثل کے دو اہم شہر قادیان اور گوندپور شامل تھے۔

دعائیں اور عام معافی بھی رنجیت سنگھ کے دل کو خدشات سے نجات نہ دلا سکی اور وہ اتنا پریشان ہوا کہ خود کو تقریباً بیمار کر لیا۔ شکار کے دوران اس کے درباریوں نے اسے ہذیانی کیفیت میں گرفتار پایا۔ اس کا سارا جسم گرم ہو چکا تھا اور خود کو ٹھنڈا کرنے کے لیے وہ بارش کے پانی میں ڈبکیاں لگا رہا تھا۔ اس نے اسی پر بس نہیں کیا بلکہ جب وہ واپس اپنے خیموں کی طرف لوٹا تو اس نے برف میں ٹھنڈے کیے ہوئے پانی کے لمبے لمبے گھونٹ پیے۔ اس کو سردی لگ گئی پھر شدید بخار کا حملہ ہو گیا اور اسے پالکی میں بٹھا کر واپس لاہور لایا گیا۔ لاہور آنے کے بعد اس کی طبیعت مزید بگڑ گئی اور وہ اس خوف کا شکار ہو گیا کہ اس کا آخری وقت قریب ہے 6۔ آہستہ آہستہ اس کی طبیعت سنبھلتی گئی لیکن پھر بھی وہ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ اسے اپنے پاؤں پر کھڑا ہونے سے پہلے ایک ماہ تک بستر پر آرام کرنا پڑا۔ ڈاکٹروں کی طرف سے اپنی حالت کو تسلی بخش قرار دیئے جانے کے بعد ہی اس نے اپنے لمبے بالوں کو دھویا۔ رنجیت سنگھ کی صحت یابی کی خبر ملتے ہی شہر میں خوشی کی لہر دوڑ گئی اور لوگوں نے اپنے گھروں میں چراغاں کیا۔

12

ملتان پر قبضہ

چار نایاب چیزوں میں خود کفیل ہے ملتان
گرد ، گرما ، گدا گر اور گورستان

ملتان کے یہ چار ''تحفے'' جیسا کہ فارسی کی اصل ضرب المثل میں کہا گیا ہے اس شہر کی تاریخی اہمیت اور اس کی مخصوص جغرافیائی حیثیت پر روشنی ڈالتے ہیں۔ یہ شہر پنجاب کے دو اہم دریاؤں ستلج اور راوی کے درمیان ایک ریتلے، گرم میدانی علاقے پر واقع ہے۔ ان دونوں دریاؤں کا پانی اس شہر میں زراعت اور سامان کو دریا کے راستے سمندر تک لے جانے کے کام آتا ہے۔ چونکہ یہ شہر زراعت اور تجارت کا مرکز سمجھا جاتا ہے آس پاس کے علاقوں کے بھکاری جوق در جوق اس خوشحال شہر کا رخ کرتے ہیں۔ چونکہ یہ پنجاب کے قدیم ترین شہروں میں ایک ہے بے شمار لوگ نسل در نسل یہاں مختلف علاقوں میں پھیلے قبرستانوں میں مدفون ہیں۔ رنجیت سنگھ چار تحفوں والے اس شہر پر قبضے کی چار مرتبہ کوششیں کر چکا تھا لیکن صرف شہر کو زیر نگیں کرنے میں کامیاب ہوا تھا، شہر کے وسط میں موجود پہاڑ نما گارے اور اینٹوں کا بنا وسیع و عریض قلعہ اس کے لیے ہمیشہ سے ناقابلِ تسخیر چلا آ رہا تھا۔ قلعے پر خالصہ جھنڈا الہرائے بغیر شہر پر قبضہ بے معنی تھا۔ اس کی دیواروں پر نصب توپوں کی رسائی شہر کے ہر حصے تک تھی۔

یہ 1818 کے اوائل کی بات ہے دربار نے ملتان پر قبضے کی خاطر تمام وسائل بروئے کار لانے کا فیصلہ کیا۔ شہر کے آس پاس چھوٹی چھوٹی مسلم ریاستوں کی زنجیر پہلے ہی توڑی جا چکی تھی اب صرف شہرِ ملتان ہی آن بچا تھا۔ ملتان پر قبضے کا فیصلہ افغانیوں اور ان کے مغرب میں واقع ایران کے حکمرانوں کے درمیان جنگی تنازع کے پیشِ نظر لیا گیا۔ دربار کو خراسان کے مقام پر افغانیوں اور ایرانیوں کے مابین جھڑپوں کی خبریں موصول ہو رہی تھیں۔ وزیر فتح خان کے بارے میں اطلاعات

موصول ہو رہی تھیں کہ وہ ایک جھڑپ میں زخمی ہو گیا ہے اور کچھ مدت کے لیے میدانِ جنگ میں نہیں اتر سکتا۔

مصر دیوان چند کی زیرِ قیادت 20 ہزار سپاہیوں پر مشتمل لشکر ملتان کی طرف بڑھا۔ لشکر میں موجود سکھ سرداروں اور دیوان چند کے درمیان کشیدگی کو ختم کرنے کی خاطر (سرداروں کے نزدیک مصر دیوان اس مہم میں ایک نوآموز ناتجربہ کار سپہ سالار کے طور پر شریک ہو رہا تھا) رنجیت سنگھ نے شہزادہ کھڑک سنگھ کو فوج کا قومی سربراہ مقرر کر دیا۔ توپخانے کا جس نے اس مہم میں کلیدی کردار ادا کرنا تھا نگران الٰہی بخش کو مقرر کیا گیا۔

ملتان کی مہم کی بڑے پیمانے پر تیاریاں کی گئیں۔ ستلج اور راوی میں موجود تمام کشتیوں کو مسلسل اور بغیر کسی وقفے کے ضروری اشیاء کی ترسیل کو یقینی بنانے کی ہدایت کی گئی۔ سامان حرب اور خوراک کی ترسیل کی ذمہ داری کھڑک سنگھ کی ماں مائی نکیاں کو سونپی گئی جس نے کمالیہ میں اپنا ہیڈ کوارٹر قائم کیا۔ بھنگیوں کی عظیم توپ زم زم کو بھی ملتان میں اتارا گیا اسی طرح نہنگ بھی جوق در جوق جنگی مہم میں حصہ لینے کے لیے ملتان پہنچنے لگے۔

مہاراجا خود لاہور میں مقیم تھا اسے جنگ کی صورتحال کی بروقت خبر پہنچانے اور دربار سے احکامات لینے کی خاطر ملتان اور لاہور کے درمیان ہر تین میل کے فاصلے پر ایک تیز رفتار ہرکارہ مقرر کیا گیا۔

نواب مظفر خان کو بھی اس بات کا بخوبی علم ہو گیا تھا کہ دربار لاہور پورے لاؤ لشکر کے ساتھ ملتان کو فتح کرنے آن پہنچا ہے اور اس مرتبہ قیمتی تحائف یا بڑی رقم ادا کر کے بھی دربار کو خریدا نہیں جا سکتا۔ پس اس نے آس پاس کے دیہاتوں کے لوگوں کو جہاد یا مقدس جنگ کے نام پر اپنے لشکر میں شامل کر لیا اور قلعے کو ایک لمبے محاصرے کے لیے تیار کرنا شروع کر دیا۔

نواب مظفر خان نے تین مختلف محاذوں پر رنجیت سنگھ کی فوج کا مقابلہ کرنے کے لیے اپنی دفاعی حکمتِ عملی ترتیب دی: دیہاتی علاقے میں، شہر میں اور قلعے میں۔ چونکہ پہلے محاذ کی جھڑپ کھلے آسمان کے نیچے ہونا تھی اس نے اپنے غازیوں کو اس میں جھونک دیا۔ جنگ صرف ایک دن جاری رہی اور مظفر خان کے غازیوں نے اپنی خواہش کے عین مطابق جام شہادت نوش کیا۔ یہ نیزے بھالوں سے لیس غیر منظم سپاہیوں کا ایک ایسا دستہ تھا جس کا مقابلہ رنجیت سنگھ کی بندوق اور توپ بردار تربیت یافتہ فوج سے تھا۔ مظفر خان منصوبے کے عین مطابق اپنے باقاعدہ سپاہیوں کو صحیح سلامت شہر کی دیواروں کے اندر محفوظ مقام تک لے آیا۔ لڑائی کا دوسرا دور شروع ہوا اور لاہور کی فوجوں نے شہر کی دیواروں پر گولہ باری کرنا شروع کر دی۔ مظفر خان کے سپاہیوں نے حملہ آوروں کو کئی ہفتے شہر کے اندر گھسنے نہ دیا بالآخر مسلسل گولہ باری کی وجہ سے ملتان شہر کی دیوار میں کئی جگہوں سے شگاف پڑ گئے اور نواب مظفر کے سپاہی لڑائی کے تیسرے دور کے لیے قلعے کی دیواروں کے اندر چلے گئے۔

قلعے کے چاروں اطراف بڑی سی خندق موجود تھی۔ اگرچہ سال کے اس وقت (مارچ میں) خندق میں پانی موجود نہیں تھا، اس کے ہوتے ہوئے توپ قلعے کی دیواروں کے قریب نہیں لائی جا سکتی تھی اور قلعے کو کچھ خاص نقصان نہیں پہنچ سکتا تھا۔ اسی خندق کی وجہ سے قلعے کی دیواروں میں بارود نصب نہیں کیا جا سکتا تھا۔ ایک ماہ تک الٰہی بخش کے توپچی قلعے کی دیواروں پر

آگ برساتے رہے مگر اس سے کوئی فرق نہیں پڑا۔ مارچ اپریل میں تبدیل ہو گیا اور گرمی نا قابل برداشت ہونے لگی۔ دوسری طرف رنجیت سنگھ کا ہر نیا پیغام پہلے سے زیادہ غصے سے بھرا ہوتا۔ مہاراجا نے دیوان چند کو بلوا کر دریافت کیا کہ ملتان کی مہم پر اب تک ریاست کا کتنا پیسہ برباد ہو چکا ہے۔ اگر اتنا پیسہ لگنے کے باوجود وہ کامیاب نہیں ہوئے تو کتنی شرم کی بات ہے! دیوان چند کو بھی علم تھا اگر اس نے مون سون بارشوں سے قبل قلعے پر قبضہ نہ کیا تو قلعہ اس کے ہاتھوں سے نکل جائے گا کیونکہ مون سون کی بارشوں سے خندق پانی سے بھر جائے گی۔ قلعے پر جلد از جلد قبضے کی خاطر الٰہی بخش نے اپنی کوششوں کو بڑھاتے ہوئے گولہ باری کی شدت میں اضافہ کر دیا۔ بھنگیوں کی توپ اپریل میں لائی گئی۔ یہ ہر فائر کے ساتھ 80 پونڈ وزنی لوہے کا گولہ قلعے کی دیواروں پر پھینکتی جس سے قلعے کی دیوار میں بڑے بڑے سوراخ پیدا ہو گئے۔ نواب مظفر خان نے صورتحال کا جائزہ لینے کے لیے ایک جاسوس کو قلعے سے باہر بھیجا۔ اس نے واپس جا کر نواب مظفر خان کو بتایا کہ لاہور دربار کی فوج کے توپچی اور نشانہ باز الٰہی بخش کی قیادت میں نہایت جوش و جذبے سے لڑ رہے تھے۔ جب کسی توپ کا ایک پہیہ نکل جاتا اور وہ ٹھیک طرح گولہ باری نہ کر سکتی تو رنجیت سنگھ کے سپاہی اسے اپنے کاندھے کا سہارا دینے کے لیے ایک دوسرے سے لڑنے مرنے پر تیار ہو جاتے۔ ان میں سے کئی سپاہی توپ کے نیچے آ کر مر گئے مگر ان کے حوصلے میں کمی واقع نہیں ہوئی 1۔ قلعے کے محافظین کی پوری کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح گولہ باری کا سلسلہ بند کیا جائے اور قلعے کی دیوار کو پہنچنے والے نقصانات کا تخمینہ لگایا جائے اسی دوران نہنگ دستہ تاریکی کا فائدہ اٹھاتے ہوئے خندق میں اتر گیا اور قلعے کی دیوار کے ایک اور شگاف کے نیچے بارودی سرنگ نصب کر دی۔ اگلی صبح لوگوں نے دیکھا قلعے کی دیوار کا ایک بڑا حصہ دھماکے سے ہوا میں بلند ہوا اور دور جا گرا۔

مظفر خان نے جو کہ لڑ لڑ کر تھک چکا تھا اپنا نمائندہ بھیجا تا کہ مہاراجا کی فوج کے ساتھ ہتھیار ڈالنے کی شرائط طے کی جائیں۔ اسے شجاع آباد، خانگڑھ اور ایک اور بڑی جاگیر کی پیش کش کی گئی بشرطیکہ وہ قلعے سے دستبردار ہو جائے۔ مظفر خان نے یہ سب شرائط مان لیں اور اس حوالے سے باقاعدہ ایک معاہدہ تحریر کرنے کا مطالبہ کیا۔

جب رنجیت سنگھ کے پاس مظفر خان کی طرف سے تمام شرائط منظور کرنے کی خبر پہنچی تو وہ خوشی سے دیوانہ ہو گیا۔ فتح کا جشن منانے کے لیے توپوں سے گولے داغے گئے اور رات کے وقت لاہور شہر میں چراغاں کیا گیا لیکن جب معاہدے کی دستاویز مظفر خان کے پاس دستخط کے لیے بھجوائی گئی تو اس کے سپاہیوں نے اسے ایسا کرنے سے منع کر دیا۔ ان کا کہنا تھا کہ "ذلت کی زندگی سے عزت کی موت بہتر ہے" سپاہیوں نے مظفر خان کو تسلی دی کہ وہ گھبرائے نہیں۔ "ہم سکھوں کے ساتھ زندگی کی آخری سانس تک ڈٹ کر مقابلہ کریں گے"

اس نئے واقعے سے رنجیت سنگھ اشتعال میں آ گیا۔ اس نے جمعدار خوشحال سنگھ کو دیوان چند و دیگر جرنیلوں کے پاس ملتان اس پیغام کے ساتھ بھیجا کہ اگر اگلے چند دنوں تک ملتان نے ہتھیار نہ ڈالے تو وہ جاننا چاہے گا ایسا کیوں ہو رہا ہے۔ اس

نے جرنیلوں سے ملتان کی مہم جوئی کے دوران اپنے سپاہیوں کی طرف سے دکھائی جانیوالی اچھی کارکردگی اور انفرادی دلیرانہ واقعات کی تفصیل بھی طلب کرلی۔

مہاراجا کے لعن طعن نے سپاہیوں کو خوب جوش دلایا اور اس طرح جنگ کا ازسرِ نو آغاز ہوا۔

خالصہ فوج کی توپوں نے ریت کی اُن بوریوں کے پرخچے اڑا دیئے جو ثغلات میں قلعے کی دیواروں کے شگاف بھرنے کے لیے رکھی گئی تھیں۔ رہی سہی کسر نہنگوں نے پوری کر دی۔ ان کا سردار سادھو سنگھ اپنے جتھے کی سربراہی کرتے ہوئے اُن شگافوں میں سے ایک میں داخل ہو کر قلعے کے محافظوں کے سر پر پہنچ گیا2۔ انھوں نے ملتانیوں کو اپنے آگے لگالیا اور مظفر خان کی رہائش گاہ کی سیڑھیوں تک پہنچ گئے۔ عمر رسیدہ نواب بیٹوں کے ہمراہ اپنے نبی ﷺ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے سبز لباس پہنے، داڑھی میں خوشبو لگائے، ہاتھ میں ننگی تلوار اٹھا کر موت کے فرشتے کی آواز کا جواب دینے کے لیے رہائش گاہ سے باہر نکلا۔ نواب مظفر خان اس کے دو بیٹے اور ایک بھتیجا مارے گئے جب کہ اس کے دو چھوٹے بیٹے زندہ سلامت حراست میں لے لیے گئے۔

ملتان کا قلعہ 2 جون 1818 کو تسخیر ہوا اور تین روز بعد جب یہ خبر لاہور پہنچی تو شہنشاہ کی خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ رہا۔ اس نے خوشخبری لانے والے کو سونے کے دو کڑے انعام کے طور پر دیئے اور اپنی رعایا پر سونے اور چاندی کے سکوں کی بارش کرنے کے لیے ہاتھی پر سوار ہو کر قلعے سے باہر نکلا، میر دیوان چند کو ظفر جنگ بہادر کا خطاب دیا گیا۔

چند روز بعد مظفر خان کے لڑکوں میں سے ایک کو دربار میں لایا گیا۔ مہاراجا نے بوڑھے نواب کی بہادری کے بارے میں سن رکھا تھا اور چونکہ وہ بہادری اور شجاعت کو دیگر تمام بشری خصوصیات سے افضل گردانتا تھا وہ اپنے تخت سے اٹھا اور کم سن نواب کو گلے سے لگایا پانچ روز بعد مصر دیوان چند نواب مظفر کے ایک اور لڑکے کے ہمراہ دربار پہنچا۔ مہاراجا نے اسے بھی گلے سے لگایا اور تخت پر اپنے برابر نشست دی جب وہ مہاراجا سے دربار کے لشکر کی زیادتیوں کے حوالے سے شکایتیں کر رہا تھا قلعے کی فصیلوں پر نصب توپیں فاتح ملتان کی آمد پر اس کے استقبال کے لیے گرج رہی تھیں۔

ملتان پر قبضے کے ساتھ ہی پنجاب پر افغانیوں کا اثر ورسوخ ختم ہو گیا اور جنوب میں موجود مسلمان ریاستوں کا اتحاد پارہ پارہ ہو گیا۔ ملتان کی فتح نہ صرف قریبی ریاستوں بہاولپور، ڈیرہ غازی خان، ڈیرہ اسمٰعیل خان اور منکیرہ کے سرداروں کی اطاعت کا باعث بنی بلکہ اس نے سندھ کی طرف جانے والی سڑک بھی کھول دی۔ ان سب عسکری اور سیاسی فوائد کے علاوہ ملتان پر فتح ایک بڑی مالی منفعت کا باعث بھی بنی یعنی 7 لاکھ روپے سالانہ!3۔

ملتان پر قبضے کے تین ہفتے بعد مسلمانوں کا بڑا تہوار عید الفطر آن پہنچا۔ رنجیت سنگھ کے خیال میں اس کے وفادار سپاہی میاں غوثا کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا یہ بہترین موقع تھا۔ میاں غوثا نہ صرف رنجیت سنگھ کا وفادار تھا بلکہ وہ دربار کی فوج کے

توپخانے کا بانی انچارج بھی تھا۔ اسی توپخانے کی بہترین کارکردگی کی بدولت رنجیت سنگھ کئی محاذوں پر (ملتان سمیت) کامیاب ہوا تھا۔ وہ میاں غوثا کے تعمیر کیے گئے شاہ عبدالمالی کے مقبرے پر گیا اور اپنی مسلم رعایا کے ہمراہ چند لمحے کچھ دیر تک خاموش عبادت میں گزارے۔

یہ اچھا ہی ہوا کہ ملتان پر جون میں قبضہ ہو گیا کیونکہ چند روز بعد ہی مون سون کی تیز بارشیں شروع ہو گئیں جو کئی ہفتے جاری رہیں۔ رنجیت سنگھ جو ہمیشہ سے مون سون کے حسن سے لطف اٹھاتا چلا آ رہا تھا گھوڑے پر بیٹھ کر اپنے دیہی علاقوں میں بارش کا جوبن اور دریاؤں کی روانی دیکھنے کے لیے نکل کھڑا ہوا۔ ملتان کی فتح نے اس کے مزاج کو خوشگوار بنا دیا تھا۔ اس نے امور سلطنت معطل کیے اور درباریوں کے ساتھ دیہاتی علاقے میں نکل کھڑا ہوا۔ مون سون کے دنوں میں اس کی پسندیدہ موسیقی بانسری کی دھن ہوتی تھی اور اکثر رات گئے رقص و سرود کی محفلوں سے اُکتا کر وہ گھنٹوں بانسری نواز عطار خان سے بانسری پر مختلف دھنیں سنتا رہتا۔ یہ بے فکری کے شب و روز اس وقت اچانک ختم ہو گئے جب رنجیت سنگھ ایک واقعے میں مرتے مرتے بچا۔ یہ 28 ستمبر کا واقعہ ہے جب رنجیت سنگھ اُسی بے فکری اور نشاط کی کیفیت میں گھوڑے پر سوار دریائے راوی کے کنارے آن پہنچا۔ راوی میں سیلاب کو دیکھ کر جانے اسے کیا سوجھی کہ اس نے اپنے گھوڑے کو دریا میں اتار دیا۔ دریا کی طاقتور لہریں گھوڑے اور اُس پر موجود سوار کو بہا کر دریا کے وسط میں لے آئیں۔ قبل اس کے کہ وہ اپنے گھوڑے سمیت دریا میں بننے والے ایک بھنور کا شکار ہو جاتا رنجیت سنگھ نے بمشکل اپنے پاؤں گھوڑے کی رکابوں سے نکالے اور تیرتا ہوا کنارے تک پہنچا۔

مہاراجا کے بال بال بچنے کی خبر شہر بھر میں پھیل گئی۔ مسجدوں اور مندروں میں شکرانے کے نوافل اور عبادات کی گئیں۔ معززینِ شہر اور عام لوگوں کے نمائندوں نے اشرفیاں اور قیمتی سکے مہاراجا کے سر پر گھما کر غریب بھکاریوں میں تقسیم کیے۔

رنجیت سنگھ لمبے عرصے تک ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھ نہیں سکتا تھا۔ چونکہ ابھی ملتان کی مہم سر کرتے ہی نئی مہم پر نکلنا خاصی عجلت کو ظاہر کرتا، رنجیت سنگھ نے ریاست کے انتظامی معاملات پر توجہ دینا شروع کر دی۔ وزارتوں میں ردوبدل کافی عرصے سے التوا میں چلا آ رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کو بھوانی داس کے خلاف کافی عرصے سے شکایات موصول ہو رہی تھیں۔ ان میں سب سے سنگین یہ تھی کہ بھوانی داس کبڑے نے 1817 میں قلعہ ملتان کے محاصرے کو طول دینے کے بدلے نواب مظفر خان سے بھاری رقم وصول کی تھی۔ اُس وقت تو رنجیت سنگھ نے ان خبروں پر خاص دھیان نہیں دیا تھا۔ ملتان پر قبضے کے بعد بھوانی داس کا مظفر خان کے لڑکوں کو رنجیت سنگھ کے دربار میں لے آنا اس کی بددیانتی کی شہادت دینے کے لیے کافی تھا۔ بھوانی داس کو بغیر کسی رسمی کارروائی کے نوکری سے فارغ کر دیا گیا۔ دوسرا شخص جس کی دربار میں موجودگی تمام درباریوں کو کھلتی تھی جمعدار خوشحال سنگھ تھا۔ جمعدار دماغی مرض سے دوچار تھا اور اکثر دربار میں غیر متوقع بات کر جاتا جس سے پورے دربار کی سبکی ہوتی۔ رنجیت سنگھ اسے ''دنگا والا'' کہہ کر پکارنا شروع کر دیا تھا اور خود رنجیت سنگھ ایسے لوگوں سے شدید نفرت کرتا تھا۔ خوشحال سنگھ سے معتمد خاص

کی ذمہ داریاں واپس لے لی گئیں اور اس کی جگہ دھیان سنگھ ڈوگرا کو مذکورہ ذمہ داریاں سونپ دی گئیں۔ دھیان سنگھ ڈوگرہ کی شہرت بطور خوش شکل، خوش مزاج شخص کے چہار سو پھیلی ہوئی تھی۔ دھیان سنگھ اپنے ہمراہ دو بھائی دربار میں لے کر آیا۔ ان میں بڑا گلاب سنگھ نرمی سے گفتگو کرتا جبکہ دوسرا بھائی سچت سنگھ تھا جسے مقدمات کی سماعت کا کام سونپا گیا تھا۔ اپنے اچھے عادات واطوار کے علاوہ سچت سنگھ نہایت خوش شکل آدمی بھی سمجھا جاتا تھا۔ اِس برس (1818) کو لاہور دربار کے امور سلطنت میں ڈوگرہ قبیلے کی مداخلت کی ابتدا طور پر ہمیشہ یادرکھا جائے گا۔

13

پشاور اور کشمیر پر قبضہ

1818 کے موسم گرما میں رنجیت سنگھ کو اپنی سلطنت کی حدیں شمال مغرب کی سمت میں بڑھانے کا موقع ملا۔ اسی برس اگست میں وزیر فتح خان کا اپنے ہی پروردہ اور افغانستان کے کٹھ پتلی حکمران محمد کے بیٹے شہزادہ کامران کے ہاتھوں قتل ہوگیا۔ وزیر کے بھائیوں نے جو افغانستان کے مختلف حصوں، پشاور اور کشمیر میں جا بجا پھیلے ہوئے تھے اس کے قتل کا انتقام لینے کا اعلان کیا اور دیکھتے ہی دیکھتے افغانستان خانہ جنگی کی لپیٹ میں آ گیا۔ مہاراجا نے اکالی پھلا سنگھ کو جسے شمال مغربی سرحدی علاقے کا خاصا علم تھا طلب کیا اور اس سے اٹک کی بابت دریافت کیا۔ پھلا سنگھ کا جواب تھا کہ اٹک قبائلیوں کے سمندر میں موجود ایک جزیرے کی مانند تھا۔ اگر شمال مغربی سرحد کو افغانوں اور پختونوں سے محفوظ کرنا ہے تو سرحدوں کو مزید آگے پشاور تک لے جانا ہوگا یا اس سے بھی بہتر ہوگا کہ درۂ خیبر تک پنجاب کی سرحدوں کو وسعت دی جائے۔ پختونوں اور افغانوں کے درمیان قریبی اتحاد توڑنا ہوگا اور اُس سمت سے آنے والے حملہ آوروں پر ہندوستان کی طرف کھلنے والا یہ دروازہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے بند کرنا ہوگا۔ اب ضائع کرنے کے لیے مزید وقت نہیں تھا۔ وزیر خان کے بارکزئی برادران اور محمود کے سدوزئی قبیلوں کے درمیان اقتدار کی کشمکش شروع ہو چکی تھی۔ کابل پر قبضے کی خواہش میں انھوں نے پنجاب کی جانب کھلنے والی اپنی جنوب مشرقی سرحدوں کو عملی طور پر غیر محفوظ چھوڑ دیا تھا۔

15 اکتوبر 1818 کو رنجیت سنگھ اپنے لشکر کی سربراہی کرتا ہوا لاہور سے نکلا۔ اس کے جرنیلوں میں دو ایسے تھے جو اس سرزمین اور یہاں کے لوگوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ ان کے نام اُس علاقے میں دہشت کی علامت سمجھے جاتے تھے یہ دونوں جرنیل ہری سنگھ نلوا اور اکالی پھلا سنگھ کے نام سے جانے جاتے تھے۔ دربار کی فوج روہتاس سے گزرتی ہوئی راولپنڈی اور پھر حسن ابدال سے گزر کر ہزارہ کے میدانوں تک آ پہنچی۔ یہاں سے آگے اٹک کا دریا پڑتا تھا۔ دریا کے مشرقی کنارے پر فوج

کے پڑاؤ ڈال چکنے کے بعد ایک دستے کو دریا کے پار حالات کا جائزہ لینے کے لیے بھیجا گیا۔ مذکورہ گشتی پارٹی پر خٹک قبائل نے گھات لگا کر حملہ کیا۔ اس اچانک حملے میں اس دستے کا ایک بھی سپاہی نہ بچ سکا۔ جس جگہ یہ واقعہ پیش آیا وہ علاقہ دربار کے زیر نگیں تھا اور خٹک قبائل دربار کے خزانے میں سالانہ لگان بھی جمع کراتے تھے لہٰذا دربار کی فوج پر بے خبری میں اس طرح کا حملہ کوئی جنگی اقدام نہیں تھا بلکہ حکومت کے خلاف علمِ بغاوت بلند کرنے کے مترادف تھا۔ اپنے سپاہیوں پر حملے کی خبر سن کر رنجیت سنگھ اشتعال میں آ گیا۔ اس نے اپنی فوج کو دریائے اٹک کے کنارے صف بندی کا حکم دیا۔ پھر رنجیت سنگھ نے دریا میں ایک تھال بھر سونے کے سکے بطور نذرانے کے اچھالے اور اپنے ہاتھی کو دریائے اٹک کی طوفانی لہروں میں اتار دیا۔ رنجیت سنگھ کے اس عمل نے اس کی فوج کا بھی حوصلہ بڑھایا اور سب نے اپنے اپنے گھوڑے دریا میں اتار دیئے۔ ان میں سے کچھ کے گھوڑے دریائے کی لہروں کی نذر ہو گئے اور ان پر موجود سوار تیر کر دوسرے کنارے تک پہنچے۔ 1

خٹک قبائل نے زیادہ مزاحمت نہیں کی۔ دربار کی فوج ان کے دو مضبوط گڑھ خیر آباد اور جہانگیریہ پر قبضہ کر چکی تھیں۔ دربار کی فوج کو خٹک قوم کے گاؤں اور دیہاتی علاقوں میں لوٹ مار کرنے کی کھلی چھٹی دی گئی تھی۔ اس باغی قبیلے سے نمٹنے کے بعد رنجیت سنگھ نے نوشہرہ کا رخ کیا۔

اٹک کی شکست سے پشاور کا گورنر محمد خان دلبرداشتہ ہو گیا۔ وہ چودہ توپیں اور دوسرا جنگی ساز و سامان پیچھے چھوڑ کر شہر سے فرار ہو گیا۔ 19 نومبر 1818 کو رنجیت سنگھ پختونوں کے مشہور گڑھ میں داخل ہوا۔ اب تک کی افغان اور پختون حملہ آوروں کی روایات کے برعکس جو شمالی ہندوستان کے مفتوح علاقوں میں لوٹ مار کرنا اپنا حق سمجھتے تھے رنجیت سنگھ نے اپنے سپاہیوں کو کسی شخص یا جائیداد کو نقصان پہنچانے سے منع کیا۔ عوام کو ڈھول پر شہر میں جگہ جگہ منادی کے ذریعے یقین دلایا گیا کہ ان کو کسی قسم کے تشدد کا نشانہ نہیں بنایا جائے گا۔ لوگوں سے کہا گیا کہ وہ اپنا روزمرہ کا کاروبارِ حیات پہلے کی طرح جاری رکھیں۔ اگلی صبح مہاراجا اپنے ہاتھی پر سوار پشاور کے بازاروں سے گزرا۔ گزشتہ سات سو برسوں میں پہلی مرتبہ ایسا ہوا تھا کہ شہریوں نے کسی ہندوستانی حکمران کو شہر کی گلیوں سے گزرتے دیکھا۔

رنجیت سنگھ پشاور میں صرف چار دن رکا اس نے شہر کا نظم و نسق جہانداد خان کے حوالے کیا۔ یہ وہی جہانداد خان تھا جس نے اٹک کا قلعہ رنجیت سنگھ کے حوالے کیا تھا۔ رنجیت سنگھ کے لاہور پہنچنے پر لوگوں نے دیوانہ وار اس کا استقبال کیا اور اسے ''جنگوں کے فاتح'' کا خطاب دیا۔ قلعے کی دیوار پر نصب توپ نے بھی گرج گرج کر رنجیت سنگھ کو خوش آمدید کہا۔

مگر رنجیت سنگھ کے پاس آرام کرنے یا تلوار کو نیام میں ڈالنے کے لیے بالکل وقت نہیں تھا۔ جہانداد خان کو فتح وزیر کے بھائی دوست محمد بارکزئی نے پشاور سے بیدخل کر دیا تھا اور اب وہ (دوست محمد) افغان سٹیج پر سب سے اہم مہرے کی شکل اختیار کر گیا تھا۔

قبل اس کے کہ رنجیت سنگھ جہانداد خان کو واپس پشاور کا حکمران بحال کرنے کے لیے کوئی قدم اٹھاتا دوست محمد کے

ایلچی لاہور دربار میں آن پہنچے اور مہاراجا کو سالانہ ایک لاکھ روپے نذرانے کی پیش کش کی اور دربار کا شہر پر استحقاق بھی قبول کر لیا۔ مہاراجا جو اپنے سپاہیوں کو ایک اور خطرات سے بھرپور جنگی مہم سے بچانا چاہتا تھا اور اس کے نزدیک پشاور شہر کی دربار کے روبرو اطاعت اس کے انتظامی امور سے زیادہ اہم تھی لہٰذا اس نے یہ پیشکش قبول کر لی۔

رنجیت سنگھ جب سے لاہور واپس آیا تھا وہ برملا کشمیر پر لشکر کشی کی بات کر رہا تھا۔ اس کے نزدیک اگلا موسمِ بہار کشمیر کو افغانیوں سے چھٹکارا دلانے کے لیے موزوں ترین موسم تھا۔ جب یہ خبر کشمیر کے گورنر عظیم خان تک پہنچی تو اس نے اپنے ایلچی دہلی روانہ کیے تا کہ انگریزوں سے مہاراجا کے خلاف مدد طلب کر سکے۔ کرنل اکٹرلنی نے اس وفد سے ملاقات کی اور ان کی آمد کا سبب دریافت کیا۔ ایلچیوں نے عظیم خان کی شان میں قصیدے پڑھے اور انگریزوں اور عظیم خان کے درمیان اتحاد کی تجویز دی ان کے نزدیک ایسے اتحاد کا دونوں فریقوں کو فائدہ ہوگا اکٹرلنی نے جسے اس موضوع پر انگریز حکومت کی طرف سے پہلے ہی ہدایات مل چکی تھیں اس وفد سے معذرت کر لی۔ لارڈ اکٹرلنی کے الفاظ میں اس وفد کے اراکین کی آواز میں پہلا سا دم خم نہیں رہا اور انھوں نے انگریز سرکار سے درخواست کی کہ کشمیر کو اپنے قبضہ میں لے لیں۔ اپنے پہلے والے بیان اور موجودہ بیان کی وضاحت کرتے ہوئے وفد کے ایک رکن نے کہا ان کا سردار اپنے بھائی وزیر فتح خان کے قتل کا بدلہ لینے کے لیے کابل جانا چاہتا ہے مگر اسے یہ خدشہ ہے کہ اس کی عدم موجودگی میں رنجیت سنگھ کشمیر پر حملہ کر سکتا ہے 9۔ اکٹرلنی نے انھیں بتایا کہ حکومت برطانیہ رنجیت سنگھ کے ساتھ کیے گئے معاہدے کی وجہ سے مجبور ہے جس کی رو سے دریائے ستلج کے مغرب میں موجود علاقوں پر رنجیت سنگھ کا حق ہے اور انگریز ان علاقوں میں کسی قسم کی مداخلت نہیں کریں گے۔ سفارتی محاذ پر ناکامی کے باوجود عظیم خان نے رسک لیتے ہوئے کابل کا قصد کیا۔ وہ کشمیر کو اپنے چھوٹے بھائی جبار خان کے حوالے کر گیا اور سپاہیوں کا ایک لشکر بھی وہیں چھوڑ گیا جو اس کے نزدیک وادی کشمیر کا دفاع کرنے کے لیے کافی تھا۔ جبار خان کے خیال میں وادی کشمیر پر حکومت کا بہترین طریقہ یہ تھا کہ دربارِ لاہور کے ساتھ ساز باز کرنے والوں کے ساتھ آہنی ہاتھ سے نمٹا جائے۔ اس نے غیر مسلموں کے ساتھ بہت ناروا سلوک کیا اس کے سخت رویے کی وجہ سے بیشتر ہندو علاقہ چھوڑنے پر مجبور ہو گئے۔ ہجرت کرنے والوں میں جبار خان کا اپنا وزیرِ مال پنڈت بیربل دھر بھی موجود تھا۔ پنڈت لاہور آیا اور مہاراجا کو مشورہ دیا کہ کشمیر پر حملے کا اس سے اچھا کوئی اور موقع نہیں ہو سکتا۔ راجوڑی کے سردار اگر خان نے جو اس وقت لاہور میں موجود تھا، بھی اس مشورے کی تائید کی۔ اس نے اپنی انگلیاں زعفران (جو کہ کشمیر میں پیدا ہوتا ہے) میں بھگوئیں اور قران پر ہاتھ رکھ کر مہاراجا کو اس مہم میں ہر قسمی امداد فراہم کرنے کی قسم کھائی۔ اپنی پچھلی مہم میں رنجیت سنگھ نے کشمیر کو مغرب میں افغانستان اور قبائلی علاقوں سے جوڑنے والی سڑک سے علیحدہ کر دیا تھا۔ اب ان علاقوں سے کسی قابلِ ذکر مخالف قوت کی طرف سے لشکر کشی کا امکان نہ ہونے کے برابر تھا۔ حالات رنجیت سنگھ کے حق میں تھے۔

رنجیت سنگھ اس مہم میں کامیابی کی دعا کرنے امرتسر گیا۔ ہولی کے تہوار کے موقع پر وہ واپس لاہور آ گیا۔ اس تہوار کو روایتی جوش وجذبے کے ساتھ منایا گیا۔ اس تہوار کے بارے میں سوہن سنگھ شاعرانہ انداز میں یوں بیان کرتا ہے: "دن کا چوتھائی حصہ اس تہوار کی خوشیاں منانے والوں کی خوش گپیوں اور کھیل کود میں صرف ہو گیا۔ خوبصورت چاند جیسے حسین چہرے پتھر دلوں کو اپنی سریلی آواز کے ساتھ موم کرنے کے لیے کافی تھے؛ خوشی اور مسرت سے بھری موسیقی ساتویں آسمان کی طرف سفر کر رہی تھی۔ 3 اپریل تک برف پگھل چکی تھی اور جہلم کو جانے والے رستے صاف ہو چکے تھے۔ مہاراجا کے لشکر میں شامل دستوں کے سربراہ جہلم کے مقام پر ملے۔ اس شہر کا انتخاب کشمیر پر حملہ کرنے والی فوج کے بیس کیمپ کے طور پر کیا گیا تھا۔ دربار کی فوج کو تین حصوں میں تقسیم کیا گیا۔ ایک حصہ جس کی سربراہی مہاراجا کر رہا تھا بیس کیمپ پر رہ کر آگے لڑنے والی فوج کو رسد وراشن اور اسلحہ فراہم کرے گا۔ دوسرے دستے کی سربراہی مصر دیوان چند اور تیسرے دستے کی سربراہی شہزادہ کھڑک سنگھ کرے گا اور یہ دونوں دستے راجوڑی تک پیش قدمی کرتے ہوئے جائیں گے۔ راجوڑی کے مقام پر یہ دستے ایک دوسرے سے جدا ہو جائیں گے اور شوپیاں کے مقام پر دونوں طرف سے افغان فوج پر حملہ آور ہوں گے۔

جب دونوں دستے راجوڑی کے لیے روانہ ہو چکے تو مہاراجا کو خفیہ اطلاع ملی کہ اگر خان دربار کی فوج کا ساتھ دینے سے پیچھے ہٹ سکتا ہے۔ اگر خان کی طرف سے کسی ممکنہ بغاوت کا راستہ روکنے کے لیے مہاراجا نے بھمبر کے سردار سلطان خان کو قید سے رہا کیا (سلطان خان گزشتہ سات برسوں سے قید میں تھا) اور اس کے ساتھ دربار کی فوج کی پہاڑی علاقے میں رہنمائی کے بدلے دوبارہ سردار بحال کرنے اور خطیر انعام دینے کا معاہدہ کیا۔ رنجیت سنگھ کا یہ فیصلہ درست ثابت ہوا کیونکہ جیسے ہی دربار کی فوج کی افغانیوں کے ساتھ جھڑپیں شروع ہوئیں اگر خان دربار کی فوج کا ساتھ چھوڑ کر دوسری طرف چلا گیا اور دربار کو بھمبر کے سلطان خان پر انحصار کرنا پڑا۔

کھڑک سنگھ کا لشکر بغیر کسی مشکل کے مرکزی سڑک سے ہٹ کر آس پاس کی سڑکوں سے ہوتا ہوا پونچھ کو پیچھے چھوڑتا شوپیاں تک پہنچ گیا۔ دوسری طرف سے پیر پنجال کا پہاڑی سلسلہ عبور کر کے دیوان چند افغان نشانہ بازوں کے ہاتھوں اپنے ساتھیوں کی ہلاکتوں کے باوجود آگے بڑھتا رہا اور دونوں لشکر شوپیاں کے میدانی علاقے میں جبار خان کے 12 ہزار سپاہیوں کے اطراف میں آن پہنچے۔

دیوان چند نے اپنے سپاہیوں کو چند دن آرام کرنے دیا۔ ان کے تازہ دم ہونے کے بعد ایک صبح وہ خاموشی سے افغان لشکر کے سر پر جا پہنچا۔ افغانیوں کو اس کا علم تب ہوا جب دربار کی فوجوں نے ان پر گولے برسانا شروع کیے۔ جبار خان کے پاس دربار کی فوج جتنی توپیں موجود نہیں تھیں اس نے اپنے گھڑسواروں کو دربار کے لشکر پر حملے کا حکم دیا۔ افغان گھڑسواروں نے پنجاب کی بہت سی توپوں پر قبضہ کر لیا۔ اس پر اکالی پھولا سنگھ نے اپنے نہنگ دستوں کو افغان گھڑسواروں پر حملے کا حکم دیا۔ افغان فوجی نہنگ دستوں کی لڑائی کے انداز سے دہشت زدہ ہو گئے اور واپس پہاڑوں کی طرف بھاگ نکلے خود جبار خان زخمی

حالت میں میدان جنگ سے بمشکل فرار ہوا۔

مہاراجا کو کشمیر میں فتح کی اطلاع اگلے روز ملی جب وہ ان دونوں لشکروں کی مدد کے لیے آگے بڑھ رہا تھا۔ سوہن لال جو اس وقت رنجیت سنگھ کے ہمراہ تھا اس منظر کو کچھ یوں بیان کرتا ہے:

''دوپہر کو آسمانوں سے ایک فرشتہ کشمیر جنت نظیر کی فتح کی خبر لیکر آیا۔ یہ حسین وادی اب لاہور کی سلطنت کے بہی خواہوں کا حصہ بن چکی تھی۔ آس پاس ہر جگہ سے (یہ خبر سن کر) مبارک سلامت کا غلغلہ تھا اور ایک ہی نعرہ بلند ہو رہا تھا: واہ گرو جی کی فتح''۔ مصر دیوان چند اور شہزادہ کھڑک سنگھ اگلے روز سری نگر میں داخل ہوئے اور مہاراجا کا شایانِ شان استقبال کیا۔ شہزادے نے مقامی آبادی کو لوٹنے یا کسی قسم کے تشدد کا نشانہ بنانے کی سختی سے ممانعت کی۔

مہاراجا واپس میدانی علاقوں کی طرف لوٹ گیا۔ پہلے اپنے رب کا شکر بجالانے وہ امرتسر گیا۔ سارے شہر میں اس فتح پر خوشی کے شادیانے بج رہے تھے۔ 22 ستمبر کو وہ واپس لاہور پہنچ گیا جہاں وہ جشن مناتے عوام کی طرف سے بنائی گئی فتح کی نشانیوں یعنی محرابوں کے درمیان سے ہاتھی پر سوار گزرا۔

فقیر عزیز الدین کو کشمیر کے لوگوں، موسم، پیداوار، عام حالات پر مفصل رپورٹ تیار کرنے کا حکم دیا گیا۔ دیوان محکم چند کے بیٹے موتی رام کو کشمیر کا گورنر مقرر کر دیا گیا۔ سپاہیوں کو اس علاقے کے کونے کھدروں میں بچے کھچے افغانیوں کا صفایا کرنے پر لگا دیا گیا۔ یہ سب کچھ نوزائیدہ حکومت کی طرف سے دور دراز علاقوں تک اپنی سرحدوں کی وسعت اور ممکنہ افغان مزاحمت کو کچلنے کی خاطر کیا جا رہا تھا۔ کشمیر پنجاب کے علاقوں میں اہم اضافہ تھا۔ سالانہ 70 لاکھ روپے لگان کے علاوہ جو بات اسے دوسرے علاقوں سے ممتاز کرتی تھی اس کی سرحدوں کا چین اور تبت سے جڑا ہونا تھا۔

فروری 1820 میں رنجیت سنگھ نے اپنے جنوبی علاقوں کا دورہ کیا۔ اس کا پہلا طویل قیام ملتان میں تھا۔ وہاں پہنچ کر اس نے سب سے پہلے نواب مظفر خان کے مقبرے پر حاضری دی۔ ملتان میں ہی رنجیت سنگھ نے روایتی جوش و جذبے سے ہولی کا جشن منایا۔ وہ اپنے ہاتھی پر سوار شہر کے گلی کوچوں میں نکل آیا اور لوگوں پر اشرفیوں اور سکوں کی بارش کر دی۔ اس کی دو بیویوں دیا کور اور رتن کور کے ہاں بیک وقت دو لڑکوں کی پیدائش کی خبر نے ہولی کی خوشیوں کو دوبالا کر دیا[4]۔ اس نے اپنے دونوں لڑکوں کا نام حال ہی میں کامیاب عسکری فتوحات کی یاد میں پشورا سنگھ اور کشمیرا سنگھ رکھنے کا اعلان کیا۔

رنجیت سنگھ نے جمعدار خوشحال سنگھ کو ملتان سے ڈیرہ غازیخان روانہ کیا تاکہ وہاں کے نواب زمان خان کے ساتھ دو دو ہاتھ کر سکے۔ نواب کو شہر سے باہر نکال دیا گیا اور اس ضلع کی ذمہ داری بہاولپور کے نواب کو سالانہ تین لاکھ روپے کے عوض سونپ دی گئی۔ شمال مغربی علاقے میں گڑبڑ کی خبریں آنے پر رنجیت سنگھ نے ملتان میں اپنا قیام مختصر کر دیا۔ جب سے کشمیر پنجابیوں کے ہاتھوں میں آیا تھا ہزارہ کے پختون قبائلی اسے واپس لینے کے لیے بے چین تھے۔ شہزادہ شیر سنگھ کو جو سپاہیوں میں مشہور ہوتا جا رہا تھا قبائلیوں کی سرکوبی کا حکم دیا گیا۔ فتح سنگھ اہلیانوالہ، تو پچی الٰہی بخش اور دیوان محکم چند کا پوتا نوجوان رام

دیال شہزادے کے ہمراہ تھے اس کی نانی سدا کور بھی اس مہم میں پیش پیش تھی۔ ہزارہ میں بغاوت کا خاتمہ دور دراز علاقوں میں پھیلے ہوئے قبائلیوں کو ختم کرنے سے ہی ممکن تھا۔ انہی مہمات میں سے ایک میں رام دیال جو کہ قبائلیوں کے ایک گروہ کا پیچھا کر رہا تھا گرد و غبار کے طوفان میں اپنے لشکر سے بچھڑ کر قبائلیوں کے ہاتھ چڑھ گیا۔ قبائلیوں نے رام دیال کو پکڑ کر موت کے گھاٹ اتار دیا۔

رام دیال کی موت مہاراجا کے لیے بہت بڑا صدمہ تھی اسے رام دیال میں اس کے دادا دیوان محکم چند کی عظیم قیادانہ صلاحیتوں کا پرتو نظر آتا تھا۔ رام دیال کی موت پر اس کے باپ موتی رام کا شدتِ غم سے برا حال تھا کچھ ہی عرصہ بعد وہ لشکر چھوڑ کر غور و فکر اور عبادت کے لیے بنارس روانہ ہو گیا۔ موتی رام کی عدم موجودگی میں ہری سنگھ نلوا کو کشمیر کا گورنر بنا دیا گیا۔

ہزارہ کے انتظامی معاملات فتح سنگھ اہلیانوالہ اور کرپا سنگھ کے حوالے کر دیے گئے۔ ان دونوں سرداروں نے قبائلیوں پر نظر رکھنے اور باغیانہ خیالات پر قدغن لگانے کے لیے اپنے زیرِ انتظام علاقوں میں جابجا چھوٹے چھوٹے قلعے تعمیر کیے اور انھیں پولیس کے ناکوں کے طور پر استعمال کیا تاہم ان تمام اقدامات کے باوجود کشمیر دربار لاہور کے لیے مستقل دردِ سر بنا رہا۔

1821 کے موسمِ گرما میں گھوڑوں کا سوداگر ایک انگریز ولیم مورکرافٹ ایسٹ انڈیا کمپنی کے بڑے افسروں کی سفارشی چٹھیوں کے ہمراہ لاہور آیا اور مہاراجا سے ملاقات کا انتظار کرنے لگا۔ مہاراجا نے اس کا اچھے طریقے سے استقبال کیا اور اس کی درخواست کے مطابق اسے کشمیر اور لداخ کی طرف سفر کرنے کی اجازت مرحمت فرمائی۔ لداخ میں مورکرافٹ نے مقامی سرداروں کو مغل شہنشاہ کی حمایت پر اکسایا۔ اس نے انھیں یاد دلایا کہ وہ ہمیشہ تختِ دہلی (جو انگریزوں کے تسلط میں تھا) کے وفادار رہے ہیں۔ مورکرافٹ نے نہ صرف مقامی سرداروں کو تختِ لاہور کے خلاف بھڑکایا بلکہ اس منہ پھٹ نے رنجیت سنگھ کو بھی صاف صاف بتا دیا کہ اس کی رعایا اس کے خلاف بغاوت کرنے جا رہی ہے اور وہ پنجاب پر اپنی گرفت مضبوط کرنے کی کوشش نہ کرے۔5 مہاراجا نے اس کا خط آگے حکومتِ برطانیہ کو بھیج دیا جس نے نہ صرف مورکرافٹ کی اس حرکت کو شرمناک اور اس کا ذاتی فعل قرار دیا بلکہ مہاراجا پر واضح کیا کہ اس (مورکرافٹ) کو کوئی سفارتی ذمہ داری نہیں سونپی گئی6 تاہم مہاراجا اس وضاحت پر مطمئن نہیں ہوا۔ دوسری طرف مورکرافٹ نے وسطی ایشیا میں اپنا کام جاری رکھا یہاں تک کہ غالباً کسی افغانی نے اس کا قتل کر دیا7۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ بعد کے دنوں میں مہاراجا کا انگریز، اینگلو انڈین اور ایسی قوم سے تعلق رکھنے والے سپاہیوں کو جو انگریزوں کو اپنا بدترین دشمن گردانتی ہو اپنے دربار اور فوج میں بھرتی کرنے کا جنون ولیم مورکرافٹ سے حاصل ہونے والے تجربے کا حاصل ہو۔

گرمیوں کے اسی موسم میں رنجیت سنگھ کو تیز بخار نے آلیا رنجیت سنگھ نے ورزش اور جسمانی مشقت کے ذریعے اسے بھگانے کی کوشش کی مگر ایک لمبے سفر کے بعد ٹھنڈا پانی پینے سے اس کی حالت مزید بگڑ گئی اور اسے نزلہ اور کھانسی کی شکایت بھی

ہوگئی۔اس لمبی بیماری سے تنگ آ کر اس نے افیون لینا شروع کر دی۔افیون نے اس کے اعصاب پر سکون بخش اثر چھوڑا اور اس نے اس کا استعمال جاری رکھا۔بعض اوقات وہ اس کا استعمال بلاضرورت بھی کر لیا کرتا تھا۔

مہاراجا ابھی پوری طرح بھلا چنگا نہیں ہوا تھا کہ خاندان کا ایک پرانا جھگڑا جو کافی دیر سے التوا میں چلا آ رہا تھا اچانک سنگین شکل اختیار کر گیا۔اس کے اپنی ساس سدا کور سے تعلقات کافی عرصے سے تناؤ کا شکار چلے آ رہے تھے۔ملکاف کے ساتھ مذاکرات کے دوران بھی سدا کور کا رویہ رنجیت سنگھ کے ساتھ خاصا جارحانہ رہا تھا۔اس نے شہزادہ کھڑک سنگھ کی شادی کی تقریب میں شرکت سے بھی نہ صرف معذرت کر لی تھی بلکہ اپنے پوتوں شیر سنگھ اور تارا سنگھ کو بھی شرکت سے روک دیا تھا۔

کھڑک سنگھ کو مہاراجا رنجیت سنگھ کا جانشین بنائے جانے کے بعد سے وہ کئی مرتبہ اس بات کا گلہ کر چکی تھی کہ دربار نے ولی عہد کھڑک سنگھ کو جہاں بہت سی جاگیریں عنایت کی ہیں وہیں اس کی بیٹی مہتاب کور سے جس کا کچھ عرصہ قبل انتقال ہو گیا تھا، پیدا ہونے والے شاہزادوں کو کچھ بھی نہیں دیا گیا۔مہاراجا رنجیت سنگھ کا جو سدا کور کی مسلسل بک بک سے تنگ آ چکا تھا صبر جواب دے چکا تھا اور اس نے اِس مسئلے کا مستقل حل نکالنے کا فیصلہ کیا سدا کور ستر برس کی ہو چکی تھی اور شیر سنگھ یا تارا سنگھ سے اس کا کوئی وارث نہیں تھا۔رنجیت سنگھ نے اسے تجویز دی کہ شیر سنگھ کو اپنی ریاست کے انتظامی امور سونپ دے۔سدا کور جو رنجیت سنگھ کی فطرت سے اچھی طرح واقف تھی جان گئی کہ اس نے یہ تجویز بلا مقصد نہیں دی۔کیا وہ انگریزوں کو اپنے داماد کے خلاف مدد کے لیے بلا سکتی تھی؟اس کی ستلج کے دونوں جانب جاگیریں موجود تھیں (فیروز پور میں واقع ودھنی کا علاقہ تو اسے رنجیت سنگھ نے ہی دیا تھا)۔اس نے اپنی جاگیر کے انتظامی معاملات کی دیکھ بھال کی آڑ میں دریائے ستلج عبور کرنے کا فیصلہ کیا۔جب رنجیت سنگھ کو اس کے منصوبے کا علم ہوا تو اس نے دونوں لڑکوں کو جاگیروں کی تقسیم کے حوالے سے گفتگو کرنے اور لاہور آنے کی دعوت دی۔سدا کور جو یہ سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ ایک ایسا شخص جو اب تک اس کی ہر بات مانتا چلا آ رہا تھا اس کے ساتھ عزت و وقار سے ہٹ کر کوئی بات یا حرکت کرے گا لہٰذا اس نے رنجیت سنگھ کی طرف سے لاہور آنے کی دعوت قبول کی اس کے لاہور پہنچنے پر رنجیت سنگھ کا لہجہ یکسر بدل گیا اور اس نے صاف لفظوں میں سدا کور کو بتا دیا کہ اس کی جاگیریں اس کے پوتوں اور رنجیت سنگھ کے بیٹوں شیر سنگھ اور تارا سنگھ کے نام کر دی گئی ہیں اور اب اسے ریٹائرمنٹ اختیار کر لینی چاہیے۔

سدا کور نے یہ سن کر آسمان سر پر اٹھا لیا مگر اس کے شور شرابے کا رنجیت سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔اس کو احساس ہو گیا تھا کہ جب تک وہ لاہور میں موجود رہے گی کوئی اس کی مدد کو نہیں آئے گا مگر ایک بار وہ بٹالہ پہنچ جائے تو اس قابل ہو جائے گی کہ رنجیت سنگھ کی فوجوں کا مقابلہ کر سکے اور اگر ایسا نہ کر سکی تو کم از کم ستلج پار کرنے کے بعد انگریزوں سے مدد کی درخواست تو کر سکتی ہے۔

لہٰذا وہ خاموشی سے دربار سے کھسک گئی مگر جلد ہی اس کی عدم موجودگی کا نوٹس لے لیا گیا اور گھڑ سواروں کا ایک دستہ اسے قیدی بنا کر لاہور واپس لے آیا۔مہاراجا نے مصر دیال سنگھ اور شام سنگھ اٹاری والا کو سدا کور کی جاگیروں کا انتظام اپنے ہاتھ میں لینے کی ہدایت کی۔کنہیا مثل کے زیرِ انتظام قلعے بھی دربار کی تحویل میں لے لیے گئے اور ان قلعوں میں موجود ملیشیا کو دربار کی

فوجوں میں ضم کر دیا گیا۔ بٹالہ جو کنہیا مثل کا آبائی شہر تھا کو جاگیر کا درجہ دے کر اس کا انتظام شہزادہ شیر سنگھ کے ہاتھ میں دیدیا گیا۔

سدا کور کو اپنے داماد کی طرف سے روا رکھے گئے ذلت آمیز سلوک پر بہت رنج ہوا۔ 1822 کا لاہور اخبار اس کی دو کنیزوں اور رنجیت سنگھ کے درمیان ہونے والے جذباتی مکالمے کو یوں بیان کرتا ہے۔ وہ دونوں رنجیت سنگھ کے خیمے کی طرف گئیں اور رنجیت سنگھ کو اپنی مالکن کی نیک خواہشات کا پیغام دیا۔ رنجیت سنگھ نے انھیں ان الفاظ میں جواب دیا: "سدا کور نہ تو میری ماں ہے نہ ہی میں اس کا بیٹا"۔ اس کی ملازماؤں نے جواباً مہاراجا سے دریافت کیا کیا وہ یہ بات بھول گیا تھا کہ سدا کور نے میدانِ جنگ میں کس طرح اس کی مدد کی تھی اور وہ آج جو کچھ بھی ہے سدا کور کی وجہ سے ہے۔ ان کی مالکن کا اس کے نام بس یہ پیغام ہے کہ وہ چاہتی ہے کہ رنجیت سنگھ اُسے اس طرح قید میں رکھنے اور نچلی ذات کی عورتوں سے اس کی نگرانی کروانے کی بجائے اسے موت کے گھاٹ اتار دے اور اگر رنجیت سنگھ چاہے تو ودھنی کی جاگیر واپس لے سکتا ہے (ودھنی ستلج کے اس پار تھا اور رنجیت سنگھ سدا کور کی مرضی کے بغیر اسے حاصل نہیں کر سکتا تھا)۔ سدا کور کی ملازمائیں اتنا کہنے کے بعد اپنے جذبات پر قابو نہ رکھ سکیں اور پھوٹ پھوٹ کر رونے لگیں۔ رنجیت سنگھ کی آنکھوں میں بھی آنسو آ گئے۔ اس نے وعدہ کیا کہ سدا کور سے ملنے آئے گا تاہم اس کی باقی شکایات کے حوالے سے اس نے کوئی بات نہیں کی۔

رنجیت سنگھ سدا کور سے ملنے نہ جا سکا اور وہ قیدِ تنہائی میں ہی مہاراجا کو کوستی ہوئی دنیا سے رخصت ہو گئی۔

ایک طرف دیوان سنگھ سدا کور کی جاگیروں کے معاملات ہاتھ میں لینے کے لیے بٹالہ پہنچا ہوا تھا تو دوسری جانب رنجیت سنگھ نے جنوب کی طرف منکیرہ کا رخ کیا۔ نواب حافظ احمد کی جاگیریں دریائے سندھ کے دونوں جانب موجود تھیں۔ ان میں لیہ، بھکر اور ڈیرہ اسمٰعیل خان جیسے قصبے شامل تھے۔ ان علاقوں میں نہ صرف دریا تجارتی سامان کی ایک جگہ سے دوسری جگہ ترسیل کا بڑا ذریعہ تھا بلکہ خشکی کے ذریعے سفر کرنے والے تجارتی قافلے ایران سے بلوچستان اور پھر ہندوستان کی طرف انہی علاقوں سے گزر کر جاتے تھے۔ منکیرہ ایک بنجر اور بے آباد علاقہ ہونے کے باوجود 10 لاکھ روپے سالانہ کی آمدن دے رہا تھا اس کی اپنی سیاسی اہمیت بھی تھی۔ یہاں کا نواب علاقے کے دیگر مسلم نوابوں کی مانند اپنی ریاست کی خودمختار حیثیت حاصل کر چکا تھا تاہم اب حالات سے مجبور ہو کر وہ افغانستان کے حکمران کو سالانہ لگان ادا کر رہا تھا انہی افغان حکمرانوں نے اس کے آباؤاجداد کو مختلف القاب سے نوازا تھا۔ اس نے پنجاب کے ساتھ جو تاریخی و جغرافیائی لحاظ سے اس کے علاقے سے زیادہ قریب تھا مکمل دوری اختیار کی ہوئی تھی۔

اکتوبر 1821 میں رنجیت سنگھ نے دریائے جہلم عبور کیا اور خوشاب میں داخل ہوا جہاں ٹوانہ قوم کا سربراہ احمد یار اپنے دستے کے ہمراہ اس کی فوج میں شامل ہو گیا۔ بھکر کا قلعہ بھی بغیر کسی مزاحمت کے فتح ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے بھکر میں قیام کے دوران اپنی فوج کو دو حصوں میں تقسیم کرنے کے بعد دو مختلف سمتوں میں روانہ کیا۔ جمعدار خوشحال سنگھ اور ڈل سنگھ کے زیر

قیادت 15 ہزار سپاہیوں پرمبنی دستے نے ڈیرہ اسمٰعیل خان پر قبضہ کرلیا جبکہ دوسرے دستے کی قیادت مصر دیوان چند کر رہا تھا جوسدا کور کی جاگیر کو دربار کے ساتھ جوڑ کر سیدھا بھکر کے محاذ پر پہنچا تھا۔اس کی قیادت میں دربار کی فوج کے دستے نے لیہ اور خان گڑھ پر با آسانی قبضہ کرلیا اور آخر میں تینوں دستوں نے ایک ساتھ مل کر منکیرہ پر حملہ کیا۔

مانکیرہ ریتلے میدان کے وسط میں ایسی جگہ موجود تھا جس کے قرب و جوار میں نہ تو کوئی دریا بہتا تھا اور نہ ہی کوئی پانی کا تالاب یا کنواں موجود تھا۔نواب اس امید پر ڈٹا ہوا تھا کہ دربار کی فوجوں کا پانی ختم ہو جائے گا اور وہ واپس لوٹ جائیں گی۔ رنجیت سنگھ کو اس صورتحال کا اندازہ ہو چلا تھا اور اس نے صرف تین روز میں ہی اتنے کنویں کھدوائے کہ اس کی فوج کی پانی کی ضروریات پوری ہوگئیں۔نواب کے قلعے کا محاصرہ صرف پندرہ روز جاری رہا اور وہ دربارِ لاہور کی طرف سے ایک جاگیر اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں محفوظ رہائش گاہ کے بدلے منکیرہ سے دستبردار ہونے پر تیار ہو گیا اس نے اپنا قلعہ بھی جہاں اسلحے کا ذخیرہ محفوظ حالت میں موجود تھا دربار کے حوالے کر دیا۔منکیرہ پر قبضہ ہوتے ہی جہلم اور سندھ کے درمیان موجود وسیع و عریض خطہ اراضی جسے سندسا گر دوآب کہتے ہیں پنجاب میں شامل ہوگئی۔

22 فروری 1822 کو رنجیت سنگھ دادا بن گیا اس کے تخت کے وارث شہزادہ کھڑک سنگھ کی بیوی کے ہاں لڑکے کی پیدائش ہوئی۔بچے کو نونہال کا نام دیا گیا۔مہاراجا نے سونے کے میناروں والے خاص خیمے میں بیٹھ کر معززین سے پوتے کی پیدائش کی مبارکباد وصول کی۔وہ ایک ایک کر کے آتے اور مہاراجا کے سامنے نذرانے پیش کرنے کے بعد رخصت ہو جاتے۔دیوان چند اور جمعدار خوشحال سنگھ نے اشرفیوں سے دونوں ہاتھوں کی مٹھیاں بھریں اور رنجیت سنگھ کے سر پر گھما کر خیرات کیں۔

14

رنجیت سنگھ اور اس کے فرنگی

نونہال کی پیدائش کے چند روز بعد ہی دو یورپی باشندے لاہور پہنچے 1۔ مہاراجا نے روایتی انکساری کے ساتھ ان فرنگیوں (غیر ملکی باشندوں) کا استقبال کیا اور انھیں قالین پر اپنے برابر میں بیٹھنے کو کہا۔ ایک ترجمان کے ذریعے مہاراجا نے ان سے خیریت دریافت کی وہ کس ملک سے آئے ہیں اور ان کے آنے کا مقصد کیا ہے اور پوچھا کہ کیا انھیں عسکری معاملات کا کچھ علم ہے۔ انھوں نے بتایا کہ وہ سپاہی ہیں اور قسطنطنیہ (موجودہ استنبول)، بغداد، ایران، قندھار، کابل، پشاور اور اٹک سے ہوتے ہوئے لاہور پہنچے ہیں۔ یہ سن کر مہاراجا نے اُن سپاہیوں سے ان ملکوں کی فوجوں کے بارے میں دریافت کیا فرانسیسی اور انگریز فوج کے درمیان موازنہ کرنے اور سکھوں کی عسکری مہارت کے بارے میں ان کی رائے مانگی۔ اس نے اُن سپاہیوں کا جواب غور سے سننے کے بعد ان سے پوچھا کہ وہ لاہور میں اس کے ہاں قیام کرنا پسند کریں گے انھوں نے جواب دیا کہ وہ کسی نوکری کی تلاش میں نہیں بس وہ گرمیوں کا موسم لاہور میں گزارنا چاہتے ہیں۔ پھر انھوں نے معنی خیز انداز میں کہا کہ یہاں سے آگے وہ جہاں قسمت لے جائے گی چلے جائیں گے۔ یہ سن کر مہاراجا سمجھ گیا کہ وہ کیا چاہتے ہیں۔

اسی روز دوپہر کو مہاراجا نے ان کی جنگی مہارت کا امتحان لینے کے لیے ان سے سکھ فوج کی ایک بٹالین کو مشقیں کرانے کو کہا۔ انھوں نے یہ امتحان دینے سے انکار کر دیا۔ ''جو کچھ آپ کی بٹالین نے سیکھ لیا ہے وہی کافی ہے ہم انھیں کچھ سکھانے کے قابل نہیں''۔ انھوں نے مزید کہا کہ جب کسی چادر کو ایک بار ایک خاص انداز میں بُن لیا جائے تو پھر اس کو دوبارہ بُنا نہیں جا سکتا۔ انھوں نے مہاراجا سے کہا کہ اگر وہ ان کی جنگی مہارت کا امتحان لینا چاہتا ہے تو انھیں نئے رنگروٹ دے جنھیں وہ سکھا سکیں۔ انھوں نے بلا معاوضہ ایک بٹالین کو تربیت دینے کی پیشکش بھی کی۔ انھوں نے بڑی ہشیاری سے مہاراجا کو باور کرایا کہ وہ نپولین بوناپارٹ کی فوج میں کرنل رہے ہیں اور ان کا روزانہ کا معاوضہ پچاس سونے کی اشرفیوں کے برابر تھا تاہم

مہاراجا کی فوج کو تربیت دینے کے حوالے سے وہ اپنے معاوضے میں خصوصی کمی کر سکتے ہیں جو کہ (انفرادی طور پر) دس اشرفیاں روزانہ ہوگا اور اس میں ان کے نوکروں اور گھوڑوں کی خوراک اور دیکھ بھال شامل نہیں ہوگی۔ مہاراجا نے انھیں کوئی جواب نہیں دیا تاہم اس نے ان نووارد مہمانوں کے بارے میں مزید جاننے کا فیصلہ کیا۔ بات چیت سے تو وہ اونچے عہدے پر فائز افسر دکھائی دیتے تھے۔ اس نے ان سے کہا کہ وہ اسے ایک درخواست بھیجیں جو فرانسیسی زبان میں لکھی گئی ہو۔ مہاراجا نے وہ درخواست ترجمے کی خاطر دہلی بھجوائی اور یہ بھی پتا کروایا کہ حقیقی معنوں میں ایک فرانسیسی ایسی ہی زبان استعمال کرتا ہے جیسا کہ اس درخواست میں استعمال کی گئی ہے۔ اُدھر لاہور میں مذاکرات بھی جاری تھے مہاراجا نے انھیں دس روپے روزانہ کے حساب سے نوکری کی پیش کش کی اس کے جواب میں انھوں نے احتجاجاً کہا کہ وہ اس رقم سے پچاس گنا زیادہ نپولین بوناپارٹ کی فوج کی نوکری سے کمارہے تھے۔ انھوں نے دربار کے مذاکرات کاروں کو سونے کی اشرفیوں سے بھری طشتری دکھائی اور واضح کردیا کہ انھیں نوکری کی کوئی ضرورت نہیں۔

دو ماہ بعد رنجیت سنگھ یہ معلوم کروانے میں کامیاب ہوگیا کہ وہ دونوں انگریز جاسوس نہیں بلکہ حقیقی معنوں میں فرانسیسی باشندے تھے اور نپولین بوناپارٹ کی فوج میں افسر رہ چکے تھے اور یہ کہ انھیں عسکری معاملات کی خاصی سمجھ بوجھ تھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی شاہانہ طبیعت کے مطابق اُنہیں منہ مانگا معاوضہ دیا۔ یان فرانسوا الرڈ (Jean Francois Allard) کو گھڑ سواروں کی تربیت جبکہ یان بیپ ٹسٹ ونٹورا (Jean Baptist Ventura) کو پیادہ فوج کی تربیت کا کام سونپا گیا۔ الرڈ اور ونٹورا رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل ہونے والے پہلے یورپی باشندے نہیں تھے۔ سب سے پہلے جس یورپی باشندے نے رنجیت سنگھ کی فوج میں نوکری کی اس کا نام پرائس (Price) تھا۔ پرائس 1809 میں کرنل اکٹرلی کی یونٹ چھوڑ کر لاہور آگیا تھا اور رنجیت سنگھ کی فوج میں شمولیت اختیار کرلی تھی۔ اس کے بعد ہر دوسرے تیسرے ماہ ایک یا دو یورپی باشندے آجاتے اور رنجیت سنگھ کے لشکر میں شامل ہوجاتے۔ ان میں سے اکثریت انگریزوں کی ناجائز اولاد تھی یعنی ایسے فوجی اہلکار جن کی مائیں تو مقامی عورتیں تھیں مگر باپ انگریز۔ کچھ تو بہت معزز نام سے جانے جاتے تھے مثلاً 19 ڈریگن کا وان کارٹ لینڈ، 24 ویں ہائی لینڈرز بٹالین کے میجر جنرل سر رابرٹ ڈک کا بیٹا اور مشہور زمانہ مہم جو جارج تھامسن کا بیٹا جیکب تھامسن۔ رنجیت سنگھ کے لشکر کے دیگر یورپی فوجی بھی ایسے ہی معزز باپوں کی اولاد تھے مگر وہ گمنام زندگی گزار رہے تھے۔ تاہم مہاراجا نے اس بات کا خیال رکھا ہوا تھا کہ کم سے کم تعداد میں انگریز اور اینگلو انڈین فوجیوں کو اپنے ہاں نوکری دے کیونکہ اس کے خیال میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے ساتھ جنگ میں ایسے فوجیوں کی وفاداری پر بھروسا نہیں کیا جاسکتا۔ اسے یہ شک بھی تھا کہ ان میں سے چند فوجیوں کو خاص مقصد کے تحت اس کی فوج میں نوکری دلوائی گئی ہے تاکہ دربار فوج کے منصوبوں، جنگی تیاری اور نقل و حرکت کے بارے میں انگریزوں کو اطلاعات پہنچائی جائیں۔ ایسے غیر ملکی جن پر وہ اعتبار کرسکتا تھا صرف فرانسیسی تھے

یا یورپی قوم کے وہ باشندے جو ماضی میں کبھی انگریزوں کے خلاف جنگ لڑ چکے تھے۔

الرڈ اور ونٹورا کی رنجیت سنگھ کے لشکر میں شمولیت اس لحاظ سے بھی اہم تھی کہ ان کی آمد کے بعد یہ دربار کی پالیسی بن گئی تھی (دراصل یہ مہاراجا کا اپنا فیصلہ تھا اور وزراء کی اکثریت اس کے خلاف تھی) کہ پڑھے لکھے، قابل غیر ملکیوں کو بڑی تعداد میں بھرتی کیا جائے۔ چند ہی برسوں میں دربار کی فوج میں نوکری پانے والے اور مختلف قومیتوں سے تعلق رکھنے والے فوجیوں کی تعداد پچاس تک جا پہنچی جن میں فرانسیسی، انگریز، اطالوی، ہسپانوی، یونانی، امریکی اور دیگر شامل تھے۔

رنجیت سنگھ غیر ملکیوں کا معاوضہ طے کرنے کے معاملے میں خاصا فراخدل واقع ہوا تھا۔ اپنے ہندوستانی ہم منصب فوجیوں کے مقابلے میں یورپی باشندوں کو نہ صرف زیادہ معاوضہ ملتا بلکہ انھیں غیر معمولی اہمیت دی جاتی تاہم رنجیت سنگھ نے ان غیر ملکی باشندوں پر کبھی سچے دل سے اعتبار نہیں کیا۔

جن شرائط پر فرنگیوں کو دربار کی فوج میں رکھا جاتا ان میں ماس کھانے، تمبا کو پینے اور ڈاڑھی منڈوانے پر پابندی (ان سب کاموں کی سکھ دھرم میں بھی ممانعت ہے) اور اس بات کا وعدہ کہ وہ اس ملک میں شادی کے ذریعے یہاں کی تہذیب اور رسوم و رواج کو اپنائیں گے، مہاراجا کی اجازت کے بغیر نوکری کو خیر باد نہیں کہیں گے اور کسی بھی ملک (چاہے یہ ملک ان کا اپنا کیوں نہ ہو) کی فوج کے ساتھ جس کے خلاف مہاراجا نے اعلانِ جنگ کیا ہو لڑنے کے لیے ہمہ وقت تیار رہیں گے۔

یوں رنجیت سنگھ یورپ کے ان "ٹوٹے ہوئے تاروں" کو کسی حد تک یہ باور کروانے میں کامیاب ہو گیا کہ اب پنجاب کو ہی اپنا گھر سمجھیں۔

اگرچہ ان فرنگیوں نے بھی سکھ تہذیب اختیار کرنے اور زیادہ سے زیادہ شادیوں کے ذریعے یہاں کی رسوم و رواج کو اپنانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی ان سب باتوں کے باوجود اُن کی اپنے اصل وطن سے وفاداری اور اپنی مٹی سے پیار جوں کا توں قائم رہا اور جونہی وہ اچھا خاصا مال بنا لیتے انھیں پنجاب کی دھرتی، اپنے بال بچے، داشتائیں چھوڑنے میں ذرا بھی دیر نہ لگتی۔ وہ ان سب رشتوں کو بے سہارا چھوڑ کر واپس اپنے دیس جا کر باعزت طریقے سے "مسیحی زندگی" گزارنا شروع کر دیتے۔

رنجیت سنگھ کے نزدیک اس کی فوج کے یورپی افسر بڑی بڑی تنخواہیں وصول کرنے والے "ڈرل سارجنٹ" تھے جب کہ اس کی اکثر فتوحات 1822 سے پہلے کی تھیں جب اس کی فوج کے سپہ سالار یورپی اہلکار نہیں بلکہ محکم چند، ہری سنگھ نلوا اور مصر دیوان چند ہوا کرتے تھے۔ حتیٰ کہ 1822 کے بعد بھی دربار کی فوج کی کمان یورپی افسروں کی بجائے پنجابی جنگجوؤں یا مہاراجا کے اپنے بیٹوں کھڑک سنگھ اور شیر سنگھ کے ہاتھ میں تھی۔ رنجیت سنگھ نے ان یورپی افسروں کی مشترکہ فوجی بغاوت کے ڈر سے یہ انتظام بھی کیا ہوا تھا کہ کبھی ایک سے زیادہ یورپی افسر کو اس کے فوجی دستے کے ہمراہ لاہور میں ٹکنے نہیں دیا۔ رنجیت

سنگھ اور اس کے یورپی افسروں کے مابین فاصلے کا اندازہ دربار میں مہاراجا اور اِن مختلف النسل یورپی افسروں کے درمیان برقرار پروٹوکول سے بھی کیا جا سکتا ہے۔ اگرچہ اِن افسروں میں بہت سے ترقی کرتے ہوئے جرنیل کے عہدے تک بھی گئے اور مختلف اضلاع کے گورنر بھی مقرر ہوئے لیکن دربار میں ہونے والی کسی بھی تقریب یا جشن میں انھیں مہاراجا کے قریب بیٹھنے کا شرف حاصل نہیں ہوا بلکہ بعض اوقات تو رنجیت سنگھ بھرے دربار میں ان یورپی افسروں سے خفگی کا اظہار کرتا اور انھیں کھری کھری سنا دیتا۔ 13 جنوری 1825 کا اخبارِ لاہور ایک واقعے کا ذکر کرتا ہے جب رنجیت سنگھ نے اپنے فرانسیسی افسروں سے درخواست کی کہ وہ یوسف زئیوں کے خلاف عسکری مہم میں ہونے والے مالی نقصان کو پورا کرنے کی خاطر سرکاری خزانے میں دو دو ماہ کی تنخواہیں جمع کرائیں۔ فرانسیسی باشندوں نے مہاراجا کے پیغام بر کو صاف جواب دیدیا کہ وہ ایک پائی بھی سرکاری خزانے میں جمع کروانے کے روادار نہیں۔ رنجیت سنگھ نے ان افسروں کو بلوا بھیجا اور جب وہ دربار میں حاضر ہوئے:

''مہاراجا جو غصے سے بھرا بیٹھا تھا انھیں دیکھتے ہی کھڑا ہو گیا اور اپنی تلوار نیام سے نکال کر ان کو قتل کرنے کے ارادے سے ان کی طرف دوڑا لیکن دربار میں موجود سردار ہمت سنگھ اور دیگر حاضرین نے رنجیت سنگھ سے اس کے ہتھیار چھین کر اسے زبردستی دوبارہ تخت پر بٹھایا تاہم رنجیت سنگھ کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا اور وہ انھیں مسلسل گالیاں بکتا رہا اور کئی مرتبہ اپنا خنجر نکال کر ان کی طرف لپکا۔ رنجیت سنگھ اس وقت انھیں گالیاں بکتا رہا جب تک انھوں نے ہاتھ باندھ کر معافی نہیں مانگ لی۔''

رنجیت سنگھ اس طرح اچانک برہمی کا اظہار شاذونادر ہی کرتا۔ تاہم اس کے اور اس کے یورپی افسروں کے درمیان ہمیشہ اعتماد کا فقدان رہا۔ ایک مرتبہ ایک جرمن افسر ''میوی اس'' کو نوکری سے فارغ کرتے ہوئے رنجیت سنگھ نے کہا: ''جرمن، فرانسیسی یا انگریز۔ یہ سب حرامی ایک جیسے ہوتے ہیں''۔

جن دو یورپی مہم جوؤں کو رنجیت سنگھ نے اپنے ہاں فوج میں نوکری دی ان کی زندگی اتنی رنگین ہے کہ اس بارے میں کچھ کہنا بے محل نہ ہوگا۔ الرڈ رنجیت سنگھ کا پسندیدہ فرانسیسی فوجی افسر تھا۔ غیر ملکیوں میں وہ شاید واحد افسر تھا جو اپنے آقا سے سچی عقیدت رکھتا تھا۔ ایک فرانسیسی سیاح اور ماہرِ نباتیات کے الفاظ میں:

''موسیو الرڈ تو رنجیت سنگھ کی ناک کا بال ہیں''۔ ایک اور یورپی شخص میسن جس کی الرڈ سے 1829 میں ملاقات ہوئی لکھتا ہے:

''جنرل الرڈ نے رنجیت سنگھ کی نظروں میں اپنی خوبیوں کی وجہ سے بڑا مقام حاصل کیا ہوا ہے۔ وہ اس ریاست میں نہ صرف زندگی کی تمام آسائشوں سے لطف اندوز ہو رہا ہے بلکہ خوب دولت بھی کما رہا ہے''۔

الرڈ نے اپنی فوجی زندگی میں بہت سے تمغے جیتے تھے۔ وہ ''لیجن آف آنر'' اور ''درانی سلطنت کا اعزاز'' بھی حاصل کر چکا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ''پنجاب کی خوشحالی کا اعزاز'' دے کر اس کے تمغوں میں ایک اور ستارے کا اضافہ کر دیا۔

مہاراجا اپنے یورپی افسروں کو چھٹی دینے میں ہمیشہ پس و پیش سے کام لیتا کیونکہ ان افسران کی واپسی کا امکان ہمیشہ

بہت کم ہوتا۔ خاص طور پر الرڈ کو چھٹی دینے سے اسے ہمیشہ احتراز ہوتا۔ تاہم ایک برس ایسا ہوا کہ جس بنک میں الرڈ نے اپنی کل پونجی جمع کرائی تھی وہ دیوالیہ ہو گیا اسی سال اس کی بیٹی کا بھی انتقال ہو گیا، مہاراجا نے اسے چھٹی پر جانے کی منظوری دے دی الرڈ نے اپنی کشمیری بیوی کو ساتھ لیا اور اپنے دیگر بچوں کے ہمراہ فرانس کو روانہ ہو گیا۔

چھٹیوں کے دوران الرڈ فرانس کے بادشاہ لوئی فلپ کے دربار میں حاضر ہوا اور اپنے آقا کی نیک خواہشات کا پیغام اس تک پہنچایا۔ شاہ لوئی نے جواباً ایسی ہی خواہشات کا اظہار کرتے ہوئے اسے ایک خط دیا جس کی رو سے الرڈ کو پنجاب میں فرانس کے بادشاہ کا نمائندہ مقرر کیا گیا تھا۔ اس حوالے سے ایک خط ہندوستان کے انگریز گورنر جنرل کو بھی لکھا گیا۔ برطانوی حکومت نے رنجیت سنگھ کی طرف سے کسی ملک کے ساتھ (انگریزوں سے مشورہ کیے بغیر) سفارت کاری کے آغاز پر شدید اعتراض کیا۔ رنجیت سنگھ نے اس بحران کو یہ کہہ کر ٹالنے کی کوشش کی کہ فرانس کے بادشاہ کا خط محض ایک دوستی کی خواہش کا اظہار ہے اس کے علاوہ کچھ نہیں۔ لوئی فلپ نے اپنے خط میں لکھا تھا: ''اگرچہ طویل فاصلے اور سمندر پنجاب اور فرانس کے درمیان حائل ہیں محبت کا وہ رشتہ جس میں دونوں ریاستیں جڑی ہوئی ہیں ان رکاوٹوں سے بے نیاز ہے۔''

فرانس سے واپسی پر الرڈ اپنے ساتھ بڑی مقدار میں فرانسیسی اسلحہ لیکر آیا جن میں پستولیں، کاربینیں اور دیگر آلات شامل تھے۔ رنجیت سنگھ الرڈ کے اس اقدام سے بہت خوش ہوا اور اُس اسلحے کی قیمت کے علاوہ اسے چھٹیوں کی تنخواہ تقریباً 30 ہزار روپے بھی دیئے۔ رنجیت سنگھ کی فراخ دلی پر فرانسیسی جرنیل نے فارسی زبان میں اپنے مالک کی تعریف میں یہ اشعار ادا کیے:

''اے خدا میرے مالک کو لمبی عمر عطا فرما
آسمان (تقدیر) کو اس کی اطاعت میں دیدے
میں اس کے شاہی دربار میں جانے کی سعادت حاصل کرسکوں
اور جس روز میں اس کی حکم عدولی کروں وہ میری زندگی کا آخری دن ہو
اور جب میں مروں میری قبر لاہور میں بنے
اور میری باقیات کی انارکلی میں تدفین ہو!''

الرڈ نے اگلے پانچ برس رنجیت سنگھ کی سیوا میں گزارے پھر ایک روز اچانک وہ پشاور میں جنوری 1839 میں دل کے دورے کا شکار ہو گیا۔ اس کی لاش کو خوشبوؤں سے معطر کر کے لاہور لایا گیا۔ جوں جوں اس کا جنازہ لاہور کی گلی کوچوں سے گزارا گیا لوگ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے اور پنجاب کے وفادار فرانسیسی جرنیل کو خراج عقیدت پیش کیا اس موقع پر توپوں کی سلامی بھی دی گئی۔ شاہدرہ سے انارکلی تک جہاں الرڈ کی رہائش گاہ موجود تھی 2 تین میل لمبی سڑک کے دونوں اطراف فوجی قطار بنائے کھڑے تھے۔ اس کی لاش کو سرکاری تابوت میں سجا کر ایک کمرے میں رکھ دیا گیا۔ جھنڈوں اور پھولوں سے

سجے اس کمرے میں ہزاروں لوگ مہاراجا کے محبوب جرنیل کا آخری دیدار کرنے آئے۔ بارنامی ایک اور یورپی جو اس وقت اتفاق سے لاہور میں موجود تھا اس منظر کو یوں قلمبند کرتا ہے:

"وہ (الرڈ) یورپی اور ہندوستانیوں دونوں کا منظورِ نظر تھا۔ مہاراجا تو اس سے بیحد پیار کرتا تھا۔ شاید یہی وجہ تھی کہ اُس کے درباری اُس کی خراب صحت کے پیشِ نظر اُسے الرڈ کی موت کی خبر سنانے سے ہچکچا رہے تھے۔

الرڈ کی تصویر دیکھ کر معلوم ہوتا ہے وہ مصمم ارادے، مضبوط کردار اور خوبصورت شکل وصورت والا مہربان شخص تھا۔ وہ ہمارے توپخانے کی فوج سے کچھ ملتی جلتی وردی پہنتا تھا جس پر دو اعزاز لگے ہوتے تھے ایک "لیجن آف آنر" اور دوسرا رنجیت سنگھ کا عطا کردہ تمغہ۔ ایک اور تصویر میں ہندوستانی لباس پہنے ہوئے اس کے خوبصورت کشمیری بیوی بچے دیکھے جاسکتے ہیں۔"

یان بیپ ٹسٹ ونٹورا کا شمار مہاراجا کے دربار کے سب سے خوش شکل باوقار افسروں میں ہوتا تھا۔ مرے جس کی یان بیپ ٹسٹ ونٹورا سے 1827 میں ملاقات ہوئی اس کو ایک خوبصورت جوان افسر (جس کی عمر تقریباً 33 برس تھی) اور ''لمبی ڈاڑھی والا بہت نفیس انسان'' کہہ کر پکارتا ہے۔ یان بیپ ٹسٹ ونٹورا دربار کی پیادہ فوج کے بہترین سمجھے جانے والے دستوں کی تربیت پر مامور تھا۔ اس نے اپنے تربیت یافتہ فوجیوں کے لیے جو وردی ڈیزائن کی آج بھی برطانوی فوج کہیں کہیں اسے استعمال کر رہی ہے خاص کر ان فوجیوں کے لیے جو اُس نسل سے تعلق رکھتے ہوں۔

اگرچہ رنجیت سنگھ کی یان بیپ ٹسٹ ونٹورا کے بارے میں اچھی رائے تھی اور اس نے اس یورپی افسر کو نوکری کے آخری دنوں میں بہت مشکل مہمات پر روانہ کیا تاہم یان بیپ ٹسٹ ونٹورا کا شمار کبھی بھی مہاراجا کے قریبی ساتھیوں میں نہیں ہوا۔ مہاراجا کی فوج میں شمولیت اختیار کرنے کے تین برس بعد اُسے لُدھیانہ جا کر ایک امریکی لڑکی سے شادی کرنے کی اجازت ملی۔ نو بیاہتا جوڑے کی لاہور آمد پر درباریوں نے انھیں تحائف سے لاد دیا اور ایک اندازے کے مطابق انھیں 40 ہزار روپے مالیت کے تحائف اور سلامی وصول ہوئی۔

مسیحی عقائد کے مطابق شادی کرنے کے باوجود بھی یان بیپ ٹسٹ ونٹورا کے لاہور میں قیام کے دوران طرزِ حیات میں کوئی خاص فرق نہ آیا۔ اس نے شہر میں پنجابی اور کشمیری عورتوں کا حرم قائم رکھا۔ فرانس لوٹتے وقت اُس کے ہمراہ صرف اس کی بیٹی تھی جبکہ اس نے اپنی بیوی پیچھے لدھیانہ میں ہی چھوڑ دی تھی۔ ونٹورا مہاراجا کے انتقال سے کچھ پہلے پنجاب لوٹا۔ شہزادہ شیر سنگھ کا قریبی دوست ہونے کی وجہ سے اس نے مہاراجا کے انتقال کے بعد کے چند سالوں میں امورِ سلطنت چلانے میں کلیدی کردار ادا کیا۔ شیر سنگھ کے قتل کے فوراً بعد وہ پنجاب چھوڑ کر چلا گیا لیکن ایک مرتبہ پھر واپس آیا اور پنجاب میں اپنی ضبط شدہ جاگیروں کے عوض ہرجانے کا دعویٰ کیا۔ اس کا انتقال پیرس میں ہوا مرنے سے پہلے اسے "کاؤنٹ آف منڈی" کا خطاب دیا گیا۔

ان فرنگیوں میں دو ایسے یورپی افسر بھی تھے جو ایک ساتھ پنجاب آئے اور رنجیت سنگھ کے دربار میں نمایاں مقام حاصل

کرنے میں کامیاب ہو گئے۔ ان میں ایک فرانسیسی النسل ایم ہنری کورٹ (M. Henri Court) تھا جب کہ دوسرے کا تعلق اٹلی سے تھا اور اس کا نام پاؤلو دی ایوی ٹیبل (Paolo de Avitabile) تھا۔ اگرچہ یہ دونوں یورپی باشندے ایک ساتھ طویل سفر کر چکے تھے مگر دونوں کی طبیعت اور عادتیں ایک دوسرے سے یکسر جداگانہ تھیں۔ کورٹ کا تعلق ایک معزز گھرانے سے تھا اور وہ ملٹری پولی ٹیکنیک سے فارغ التحصیل تھا۔ وہ اچھی عادات کا مالک اور ملنسار شخص تھا اور ہمیشہ درست بات کرتا تھا جبکہ اٹلی کا باشندہ نچلے درجے سے ترقی پاتا ہوا اس مقام تک پہنچا تھا وہ ایک غیر مہذب بد دماغ سپاہی تھا۔ کورٹ اپنے دستیاب ذرائع میں سادگی کے ساتھ سفر کرنے پر یقین رکھتا تھا جبکہ ایوی ٹیبل ہمیشہ سفری لوازمات پورے ہونے پر ہی گھر سے نکلتا چاہے اس کے لیے اسے اپنی گھڑیاں، مصنوعی زیورات، نیم عریاں تصاویر یا آلاتِ موسیقی ہی کیوں نہ بیچنے پڑتے۔

یہ دونوں یورپی باشندے 1827 میں دربار سے منسلک ہوئے۔ چند سال بعد ایوی ٹیبل رنجیت سنگھ کے دربار سے 5000 روپے ماہانہ تنخواہ وصول کر رہا تھا جبکہ کورٹ کی ماہانہ اجرت دو ہزار پانچ سو روپے تھی تاہم رنجیت سنگھ کی طرف سے دیئے گئے قیمتی تحفوں کی مدد سے اس نے اپنی اور ایوی ٹیبل کی تنخواہ کا فرق ختم کر دیا تھا۔ ان دونوں نے بھرپور زندگی گزاری۔ ایوی ٹیبل پوش علاقے میں اونچی جگہ پر بنے مکان میں رہائش پذیر تھا اس کے سونے کے کمرے میں دیواروں پر جا بجا نیم عریاں طوائفوں کی تصاویر ٹنگی تھیں جنھیں وہ اپنی دلربائیں کہہ کر پکارتا تھا۔

تین برس بعد ایوی ٹیبل کو وزیر آباد کا گورنر بنا دیا گیا۔ چونکہ وہ ایک سخت گیر انتظامی افسر تھا اس کو جلد ہی وزیر آباد سے پشاور روانہ کر دیا گیا جہاں مقامی پٹھان اب تک 100 سے زیادہ سکھ فوجیوں کو بے دردی سے قتل کر چکے تھے۔ ایوی ٹیبل نے جس طرح پٹھانوں کو سیدھا کیا اس کا پتا اس کے اپنے الفاظ سے چلتا ہے:

"میرے پشاور پہنچنے سے پہلے میرے آدمیوں نے شہر میں مختلف جگہوں پر لکڑی سے بنی ٹکٹکیاں لگوا دی تھیں۔ مقامی لوگوں نے شروع میں اس عمل کا مذاق اڑایا اور "فرنگیوں کے پاگل پن" کا خوب مذاق اڑایا۔ اسی طرح جب انھوں نے دیکھا کہ میرے آدمیوں نے ان ٹکٹکیوں کے نیچے موٹی رسی کے بنڈل رکھنے شروع کر دیئے ہیں تو وہ خوب ہنسے۔ ان کا کہنا تھا کہ بندوق اور تلوار کی مدد سے شہر پر حکومت کی جا سکتی ہے رسی اور چھڑی سے نہیں۔ تاہم جب میری تیاریاں مکمل ہو گئیں تو ایک خوشگوار صبح پشاور شہر کے لوگ اٹھ کر کیا دیکھتے ہیں کہ پچاس کے قریب افراد کی لاشیں ان ٹکٹکیوں پر جھول رہی تھیں۔ پھانسی پر لٹکا دیئے جانے والے ان افراد کا شمار شہر کے بدنام ترین جرائم پیشہ لوگوں میں ہوتا تھا۔ یہ نظارہ دیکھ کر پشاور کے باسیوں کی سوچ تبدیل ہو گئی تاہم میں نے اگلے کئی روز تک یہ مشق جاری رکھی اور پھر ایسا وقت بھی آ گیا کہ شہر میں جرائم پیشہ عناصر اور قاتل ڈھونڈے سے بھی نہیں ملتے تھے۔ اس کے بعد میں جھوٹے اور افواہ پھیلانے والے لوگوں کے خلاف حرکت میں آیا۔ میرا طریقہ واردات بہت سادہ تھا۔ ایسے لوگوں کی زبان کاٹ دو اور جب ان کی حمایت میں ایک سرجن نے اعلان کیا کہ وہ ان کی زبان واپس جوڑ سکتا ہوں میں نے اس کو بلوا کر اس کی زبان بھی کٹوا دی۔ ایسا کرنے کے چھ ماہ کے اندر پشاور میں

سکون ہو گیا اور جرائم کا مکمل خاتمہ ہو گیا۔"

چھ فٹ طویل اور مضبوط قوتِ ارادی والا یہ آتشیں مزاج شخص اپنی بعض مریضانہ عادات کے باوجود ذہانت کی دولت سے مالا مال تھا اور وقت کو بھرپور طریقے سے گزارنا جانتا تھا۔ اس نے کابل مہم میں انگریزوں کے لیے راہ ہموار کی اور مہاراجا کی وفات کے کچھ عرصے بعد تک لاہور میں مقیم رہا۔ پنجاب چھوڑتے وقت اس نے اپنے حرم میں موجود تمام عورتوں کی پنشن مقرر کی اور اپنی لاڈلی بیٹی کا بیاہ اپنے باورچی سے کرنے کے بعد رخصت ہوا۔

یورپ پہنچنے پر ایوی ٹیبل کا شاہانہ استقبال کیا گیا۔ فرانس کے شاہ لوئی نے اس کو دربار میں خوش آمدید کہا اور اسے فرانس کے اعلیٰ ترین اعزاز "لیجن آف آنر" سے نوازا اور فرانسیسی فوج میں اعزازی جنرل کا عہدہ دیا۔ لندن میں بھی ایسٹ انڈیا کمپنی نے اس کے اعزاز میں عشائیہ دیا اور اعزازی تلوار سے نوازا۔ وہ شخص جس نے پٹھانوں کو دھول چٹائی اپنی بے وفا دیہاتی بیوی کے ہاتھوں ذلیل ہو کر مرا۔ اٹلی کے جس گاؤں میں شادی کے بعد اس کی موت واقع ہوئی وہاں لمبے عرصے تک اس کا چرچا رہا۔

ایوی ٹیبل کے برعکس کورٹ کسی اور ہی مٹی کا بنا ہوا تھا۔ اگرچہ وہ بھی ایک ممتاز سپاہی تھا (فرانس کی فوج کا اعزازی جرنیل بھی)، اس کے مزاج میں دانشوری کا عنصر زیادہ تھا۔ وہ رائل جیوگرافک سوسائٹی کا ممبر ہونے کے ساتھ ساتھ بہت سی سائنس سوسائٹیوں کا رکن بھی تھا۔ آپ اس کو چھوٹے قد کا خوش لباس شخص کہہ سکتے ہیں جس کے چہرے پر چیچک کے نشان تھے۔ اپنے حلیے سے وہ سخت مزاج ملاح دکھائی دیتا تھا۔ تاہم شکل وصورت کی اس کمی کو اس نے اپنی صلاحیتوں سے پورا کیا۔ ان بہت سی توپوں میں سے ایک پر جو کورٹ نے متعارف کرائیں اُس کے بارے میں فارسی میں یہ درج ہے: "صاحب کو عقل و دانش میں اپنے وقت کا ارسطو اور افلاطون کہا جاتا ہے۔"

اسلحہ خانے کا انچارج ہونے کے باعث کورٹ نے رنجیت سنگھ کی فوج میں متعدد نئی توپیں اور بندوقیں متعارف کرائیں اور بہترین نشانہ باز توپچیوں کو تربیت دی۔ یورپی محققین کے مطابق سکھ فوج کے توپخانے کی انگریزی فوج کے توپخانے پر برتری کا سہرا کورٹ کے سر جاتا ہے۔ تاہم حقیقت یہ ہے کہ رنجیت سنگھ کے اسلحہ خانے کے پیچھے کورٹ کا دماغ نہیں بلکہ رنجیت سنگھ کے سکھ افسر ماجھیا کی ذہانت کام کر رہی تھی۔ جب بھی رنجیت سنگھ کوئی نیا طاقتور ہتھیار دیکھتا وہ ماجھیا کو یہ ذمہ داری سونپتا کہ ویسا یا اس سے بھی زیادہ موثر ہتھیار سکھ فوج میں متعارف کرایا جائے اور ماجھیا اس ذمہ داری کو نبھانے میں کامیاب ہو جاتا۔ کورٹ کی اصل ذمہ داری ایک منتظم کے طور پر تھی اور وہ اس میں زیادہ کامیاب نہیں تھا۔ آپ اسے دربار کے یورپی افسروں میں سب سے زیادہ ناپسندیدہ سمجھا جانے والا افسر کہہ سکتے ہیں۔ اس کے غلط طور طریقوں کی وجہ سے اسے کئی بار اپنے ماتحتوں کے غصے کا سامنا کرنا پڑا۔

اپنی علمی و تحقیقی طبیعت کے باوجود کورٹ خود کو حرم رکھنے سے باز نہ رکھ سکا۔ اس کا گھر جو کہ درحقیقت ایک مقبرہ تھا جسے

مکان کی شکل میں ڈھالا گیا تھا آج بھی لاہور میں موجود ہے۔اس میں ایک چھوٹی سی مسجد بھی ہے جس میں اس کی کشمیری بیوی عبادت کرتی تھی آج وہ اسی مسجد کی چھت تلے سو رہی ہے۔لاہور چھوڑتے وقت کورٹ اپنے ساتھ اچھی خاصی دولت (اس کی سالانہ آمدن 40 ہزار روپے تھی) اور ایک کشمیری عورت فرانس لے گیا جس کے ساتھ اس نے بعد میں شادی کر لی۔

ایک اور یورپی افسر ایسا تھا جو اگر زندہ رہتا تو دربار کی فوج میں بہت آگے تک جاتا۔سپین سے تعلق رکھنے والے اس افسر کا نام سینور اومس تھا (Senor Oms) رنجیت سنگھ ''موسیٰ صاحب'' کی صلاحیتوں کے دل سے معترف تھے اور اسے دوسرے یورپی افسروں مثلاً کورٹ یا ایوی ٹیبل، کو دیئے جانے والے ابتدائی معاوضے سے کہیں زیادہ تنخواہ پر دربار میں نوکری دی۔اس نے سینور اومس کو خوشی خوشی جہانگیر کے مقبرے کے گرد موجود عمارتوں کو رہائش گاہ میں بدلنے کی اجازت بھی دے ڈالی۔اومس 1828 کے موسم خزاں میں پھوٹنے والی ہیضے کی وبا کا شکار ہو گیا۔کمزور عقیدے کے مسلمانوں نے اس کی موت کو جہانگیر کے مقبرے کی بے حرمتی کا شاخسانہ قرار دیا جہاں اومس مقبرے کے احاطے میں بے فکری سے رہ رہا تھا۔ان کے نزدیک جہانگیر کے بھوت نے اومس سے انتقام لیا تھا۔مہاراجا نے اُسی مقبرے میں اومس کی تدفین کا حکم دیا تاکہ اومس کا بھوت مغل حکمران کے بھوت کا مقابلہ کر سکے۔

ایک امریکی شہری جوشیا ہرلن (Josiah Harlan) بھی کچھ عرصے کے لیے رنجیت سنگھ کے دربار کا حصہ بننے میں کامیاب ہو گیا۔وہ ایک ناقابلِ یقین حد تک چرب زبان تھا۔اس نے خود کو بیک وقت ڈاکٹر، محقق، دانشور اور سپاہی کے طور پر پیش کیا۔وہ حیرت انگیز طریقے سے رنجیت سنگھ جیسے مردم شناس شخص کو اپنا گرویدہ بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ہرلن نے برطانوی فوج کے ڈاکٹر کی حیثیت سے برما کی جنگی مہمات میں شرکت کی ہوئی تھی۔برطانوی فوج سے بے عزت ہو کر نکالے جانے کے بعد وہ سرحد عبور کر کے پنجاب میں داخل ہوا اور رنجیت سنگھ کے ہاں 1829 میں نوکری اختیار کی۔رنجیت سنگھ نے ہرلن کو آمد کے چند ماہ بعد ہی نور پور اور جسر وٹہ کا گورنر لگا دیا اور تین سال بعد اسے گجرات کا گورنر مقرر کیا گیا۔ڈاکٹر ولف گجرات کے امریکی گورنر سے اپنی ملاقات کی دلچسپ کہانی سناتا ہے۔گورنر سے ملاقات کے لیے انتظار گاہ میں بیٹھے ہوئے اس نے کسی کو خاص امریکی لہجے میں ایک امریکی نغمہ گنگناتے سنا۔تھوڑی ہی دیر میں گورنر صاحب تشریف لائے وہ یورپی لباس پہنے ایک دراز قامت شخصیت کا مالک تھا۔اس نے ہاتھ میں حقہ اٹھایا ہوا تھا اور وقتاً فوقتاً اس کے کش لگا رہا تھا۔ڈاکٹر وولف نے اس سے دریافت کیا کہ وہ مذکورہ امریکی نغمہ کیسے جانتا ہے تو اس نے جواباً اپنی پتلی آواز میں کہا ''میں فلاڈیلفیا سے تعلق رکھنے والا ایک آزاد امریکی شہری ہوں۔میں کوئیکر فرقہ سے تعلق رکھنے والے شخص کا بیٹا ہوں اور میرا نام جوشیا ہرلن ہے۔''

ہرلن رنجیت سنگھ کے دربار میں نوکری حاصل کرنے کی کہانی کچھ اس طرح بیان کرتا ہے۔اس کے بقول وہ افغانستان کی بادشاہت حاصل کرنے کے بالکل قریب پہنچ چکا تھا جب دربار کے لشکر نے اس ملک پر حملہ کر دیا۔ہرلن کو اس جنگ میں

شکست ہوگئی۔ ہرلن کو جنگی قیدی بنا کر لاہور لایا گیا۔ اس کی صلاحیتیں دیکھتے ہوئے رنجیت سنگھ نے اسے بلوا بھیجا اور کہا: ''میں تمہیں گجرات کا گورنر بنانے جا رہا ہوں اگر اس سارے اثنا میں تمہارا رویہ ٹھیک رہا تو تمہاری تنخواہ میں اضافہ کر دیا جائے گا دوسری صورت میں تمہاری ناک کٹوا دوں گا۔''

جس روز ہرلن نے گجرات کے گورنر کے طور پر حلف اٹھایا اس نے بائبل پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائی کہ وہ بقیہ ساری زندگی خلوصِ دل کے ساتھ رنجیت سنگھ کے احکام بجالانے میں گزار دے گا اور اگر رنجیت سنگھ نے حکم دیا تو وہ اپنے ہی ملک کی فوج سے لڑ جائے گا۔ اس عہد کے باوجود اس نے رنجیت سنگھ کے سخت دشمن دوست محمد کے ساتھ خفیہ مذاکرات جاری رکھے۔ بعد ازاں جب رنجیت سنگھ پر فالج نے حملہ کر دیا اور اس کی قوتِ گویائی جاتی رہی، ہرلن نے پیغام بھجوایا کہ اس کے پاس ایک ایسی دوا ہے جس کی مدد سے رنجیت سنگھ کا علاج کیا جا سکتا ہے۔ دربار سے رنجیت سنگھ کا ایک وفادار وہ دوا لینے کے لیے آن پہنچا۔ دوا کے بدلے ہرلن نے بے شرمی سے ایک لاکھ روپے پیشگی ادا کرنے کا مطالبہ کیا۔ اس پر رنجیت سنگھ نے نہ صرف اس سے تمام اعزازات واپس لے لیے بلکہ بغیر کسی رسمی تقریب کے ستلج کے پار بھجوا دیا۔ اپنی توہین کے احساس سے تمتماتے ہوئے ہرلن نے اعلان کیا کہ وہ دوست محمد کے ساتھ اتحاد کرنے کے بعد ایک فوجی لشکر کی سربراہی کرتا ہوا پنجاب پر حملہ آور ہوگا اور وہاں کے حکمرانوں کو سبق سکھا کر چھوڑے گا۔

ہرلن کا چھوڑا ہوا گجرات کے گورنر کا عہدہ ایک اینگلو انڈین کرنل ہومز کو دے دیا گیا۔ ہومز دربار کی فوج کے نچلے درجے (بینڈ ماسٹر) سے ترقی کرتا ہوا کرنل کے رتبے تک پہنچا تھا۔ گورنر کا حلف اٹھانے کے کچھ ہی دن بعد ہومز کے اپنے آدمیوں نے اس پر غداری کا الزام لگاتے ہوئے اسے موت کے گھاٹ اتار دیا۔

15

جنگِ نوشہرہ

ونٹورا اور الرڈ کے دربار کی ملازمت اختیار کرنے کے کچھ ہی دن بعد ان کی تربیت یافتہ پلاٹون کو دربار کی طرف سے اہم ذمہ داری سونپی گئی۔ شمال مغربی سرحدی صوبہ اس موسمِ گرما میں شورش کا شکار رہا تھا۔ ٹیکس کی وصولی کی خاطر فقیر عزیز الدین کی پشاور آمد اور صوبے کے گورنر یار محمد کی طرف سے اس کے استقبال پر چراغاں کیا جانا قبائلیوں کو بہت ناگوار گزرا تھا۔ دونوں بھائیوں یار محمد اور دوست محمد نے رنجیت سنگھ کے ساتھ اپنی وفاداری کا اظہار کیا۔ یار محمد نے جتنا ٹیکس اس کے ذمہ تھا گھوڑوں اور نقدی کی صورت میں ادا کیا۔ تاہم اس نے برق رفتار ایرانی گھوڑے ''گوہر بار'' جس کی رنجیت سنگھ نے فرمائش کی تھی کو حاصل کرنے سے معذوری کا اظہار کیا۔ عزیز الدین اس کے جواب اور دربار کے لیے اس کی خواہشات سے خاصا مطمئن ہو کر واپس لاہور لوٹا۔ ابھی فقیر عزیز الدین نے لاہور میں قدم ہی رکھے ہوں گے کہ قبائلی پٹھانوں نے یار محمد کے خلاف بغاوت کا اعلان کر دیا۔ یار محمد کا بڑا بھائی عظیم خان اس بغاوت اور سازش میں پیش پیش تھا۔ اپنے ذاتی مفاد کی خاطر اس نے قبائلیوں کے مذہبی جذبات کا ناجائز فائدہ اٹھایا اور انھیں یقین دلایا کہ اگر وہ اس کا ساتھ دیں تو وہ انھیں کافر کی غلامی سے نجات دلائے گا۔ ایک بار پھر جہاد کی آواز اس خطے میں بلند ہونے لگی اور تھوڑے ہی دنوں میں غازیوں کے اس لشکر کی تعداد 25000 تک پہنچ گئی۔ اس جنگی مہم میں حصہ لینے والوں کی اکثریت کا تعلق یوسف زئی اور خٹک قبائل سے تھا۔ انھوں نے قسم اٹھا رکھی تھی کہ اگر وہ فتح حاصل نہ کر سکے تو خوشی خوشی شہادت کو گلے لگا لیں گے۔ یار محمد نے پشاور چھوڑ کر قریبی پہاڑیوں میں پناہ لی۔ اس بات کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ وہ باغیوں کو پشاور کی باگ دوڑ سنبھالنے کے مکمل خلاف نہیں تھا وگرنہ پہاڑیوں میں چھپنے کی بجائے وہ رنجیت سنگھ کے دربار میں جا کر پناہ لینے کو ترجیح دیتا۔ دربار نے اپنی فوج کو شمال کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ مصر دیوان چند، ہری سنگھ نلوا اور اکالی پھلا سنگھ دربار کی فوج کے پنجابی جرنیل تھے اُن کے ہمراہ ونٹورا، الرڈ

اور گورکھا کمانڈر بالبھدرا بھی اس مہم میں شامل تھے۔ ہری سنگھ نلوا اور شہزادہ شیر سنگھ اگلے دستوں کی قیادت کر رہے تھے۔ دریائے اٹک کو انھوں نے کشتیوں کے پل کی مدد سے عبور کیا اور اب وہ جہانگیرہ کے قلعے کے قریب پہنچ چکے تھے۔ مہاراجا اپنی فوج کے پیچھے پیچھے آرام سے چلا آ رہا تھا یوں معلوم ہوتا تھا کہ اسے جہانگیرہ پہنچنے کی کوئی جلدی نہیں۔ وہ راستے میں جنگلی سوروں، مرغابی اور دوسرے آبی پرندوں کا شکار کرتا آ رہا تھا۔ مہاراجا جنوری میں دریائے اٹک کے مشرقی کنارے پر پہنچا۔ اسے یہ دیکھ کر بہت افسوس ہوا کہ افغانیوں نے کشتیوں کے پل کو مکمل طور پر تباہ کر دیا تھا۔ اس کا بیٹا جس نے جہانگیرہ کو دوبارہ دربار کی تحویل میں دیا تھا اب چاروں طرف سے اپنے خون کے پیاسے دشمن کے نرغے میں آ چکا تھا۔ شہزادہ شیر سنگھ کے خلاف محاصرے کی نگرانی عظیم خان کے بھائی دوست محمد (جو ایک سے زائد مرتبہ دربار کو ٹیکس ادا کر چکا تھا) اور جبار خان کر رہے تھے یہ وہی جبار خان ہے جسے چار برس قبل کشمیر سے نکال دیا گیا تھا۔

ابتدائی موسمی تبدیلی کی وجہ سے دریائے اٹک میں طغیانی آ چکی تھی دوسری طرف افغان تیر انداز اور بندوقچی رنجیت سنگھ کی فوج کو دریا پار کرنے کی اجازت دینے پر آمادہ نہیں تھے نہ ہی دربار کے انجینئر کشتیاں باندھ کر پل بنا سکتے۔ شہزادہ شیر سنگھ ایک تشویشناک صورتحال سے دوچار تھا۔

ایک روز ایک پیغام رساں یہ اطلاع لے کر آیا کہ افغان فوج نے شیر سنگھ کو ختم کرنے کا منصوبہ بنا لیا ہے۔ اب مہاراجا مزید ایک لمحہ بھی ضائع نہیں کر سکتا تھا۔

اگلے روز صبح سویرے رنجیت سنگھ نے اپنے سپاہیوں کو دریائے اٹک عبور کرنے کا حکم دیا۔ سب سے پہلے خود اس نے اپنا گھوڑا ابھری ہوئی لہروں میں اتارا اس کے پیچھے پیچھے اس کی فوج دریا میں اپنے ہاتھیوں، گھوڑوں، اونٹوں اور خچروں کے ساتھ دریا میں اتری ان میں سے بیشتر قیمتی سامان سمیت لہروں کی نذر ہو گئے۔ تاہم جب تک افغان نشانہ باز آ کر شست لیتے پنجابی فوج دریا کے مغربی کنارے کا انتظام اپنے ہاتھ میں لے چکی تھی۔ افغان فوج کے غازی پنجابی فوج کی جرأت پر حیرت زدہ رہ گئے اور پسپا ہونے پر مجبور ہو گئے۔ جہانگیرہ قلعہ کے دروازے کھول دیئے گئے اور شہزادہ شیر سنگھ نے پسرانہ شکرگزاری کے ساتھ باپ کا استقبال کیا۔ 1

جہانگیرہ سے پسپا ہونے والے غازی نوشہرہ کے قریبی میدانی علاقے میں جمع ہو گئے۔ نوشہرہ اور پشاور کے درمیان بہنے والی ندی ''لنڈئی'' کے مغربی کنارے پر پہلے ہی افغان فوج مورچہ بند تھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے جرنیلوں سے مشورہ کیا۔ ونٹورا کا مشورہ تھا کہ وقت ضائع کیے بغیر حملہ کیا جائے۔ 'اگر آج حملہ کیا جائے تو مہاراجا کی قوت افغانیوں سے دس گنا زیادہ ہو گی۔ کل صورتحال مختلف ہو سکتی ہے' ونٹورا کے خیال میں اگر لنڈئی ندی کے مغرب سے افغان فوجی نوشہرہ آ کر غازیوں کے شانہ بشانہ لڑنے میں کامیاب ہو گئے پنجابیوں کے لیے دشمن کی اتنی بڑی تعداد سے مقابلہ کرنا مشکل ہو جائے گا۔

دربار کے توپخانے کو نوشہرہ کی دوسری طرف لنڈئی کے کنارے نصب کر دیا گیا ندی کے اس پار موجود افغان فوجی اس

کے نشانے پر تھے جبکہ دربار کے پیادہ دستے اور گھڑسوار ایک ٹیلے 'پیر سا بک' پر موجود غازیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار تھے۔اس ٹیلے کو پنجابیوں نے 'ٹبہ ٹیری' کا نام دیا تھا۔

جب عظیم خان کو پنجابیوں کی جنگی چال کی خبر ہوئی تو وہ فوراً پشاور سے نکل کر لنڈئی کے کنارے اپنے بھائی کی مدد کو پہنچا۔ندی کے اس پار موجود توپوں کی موجودگی کی وجہ سے ان کے لیے ممکن نہ تھا کہ وہ غازیوں کے شانہ بشانہ' پنجابی کافروں ' کے ساتھ جنگ کر سکتے۔اس دوران رنجیت سنگھ حملہ کرنے کی تیاری کر چکا تھا۔وہ ایک ٹیلے پر چڑھا اور حملے کے لیے تیار دستوں سے سلامی لی۔گھڑسوار مختلف جھنڈے لہراتے اور 'ست سری اکال' کے نعرے لگاتے اس کے سامنے سے پریڈ کرتے ہوئے گزرے مہاراجا نے ان کی سلامی کا جواب اپنی کرپان ماتھے سے لگا کر دیا اس طرح اس جنگ کی ابتدا ہوئی۔یہ برابر کا جوڑ نہیں تھا مورکرافٹ جو اس جنگ کا عینی شاہد تھا نے گورنر جنگ کو اس کا احوال کچھ یوں بیان کیا ہے 2: 'بندوقوں، نیزوں، بھالوں، تلواروں اور خنجروں سے مسلح ایک غیر منظم فوج کے مقابلے میں ایک منظم فوج رنجیت سنگھ کی سربراہی میں توپوں، بندوقوں دیگر آتشیں اسلحے اور تلواروں کے ساتھ موجود تھی۔سکھ فوج کا توپخانہ بھرپور طریقے سے اپنے جنگی جوہر دکھا رہا تھا'

حملے کا آغاز پیدل فوج کے فائر سے ہوا مگر غازیوں کے مورچوں کے سامنے یہ اتنا موثر ثابت نہیں ہوا۔پھر سکھ گھڑسواروں کو حملہ کرنے کا حکم دیا گیا۔مورکرافٹ بتاتا ہے کہ کس طرح گھڑسواروں کی ایک قطار پہلے سرپٹ دوڑتی آگے بڑھتی اور دشمن کا نشانہ باندھ کر فائر کرنے کے بعد لوٹ آتی اس کے بعد گھڑسواروں کی دوسری قطار یہی عمل دہراتی۔غازیوں کو احساس ہو چلا تھا کہ اس طرح کی فاصلے والی جنگ ان کو نقصان پہنچائے گی وہ پیر سا بک ٹیلے سے اتر آئے اور پنجابیوں پر حملہ کر دیا انھوں نے سکھوں کی دو توپوں پر قبضہ کر لیا مگر قبل اس کے کہ وہ ان کو چلا پاتے سکھ گھڑسواروں نے ان توپوں کو دوبارہ اپنے قبضے میں لے لیا پھر دربار کے مسلمان نجیب اور گورکھوں نے جوابی حملہ کیا اور غازیوں کو پیر سا بک کے مغربی طرف لے گئے یہاں تک کہ وہ لنڈئی کے کنارے موجود دربار کے توپخانہ کی زد میں آ گئے۔غازیوں نے وہاں سے ہٹنے کی کوشش کی مگر اکالی پھلا سنگھ کے سکھ نہنگ ان پر حملہ آور ہوئے اور تقریباً ایک گھنٹے تک دونوں طرف کے شدت پسند ایک دوسرے کے ساتھ گتھم گتھا رہے۔پھلا سنگھ کا گھوڑا مارا گیا تو وہ ایک ہاتھی پر سوار ہو کر ڈٹا رہا اب غازی اس شخص کو اچھی طرح دیکھ سکتے تھے جو اتنے عرصے سے انھیں شکست پر شکست دیتا آ رہا تھا۔انھوں نے اپنی بندوقوں کا نشانہ اس کی طرف کر کے فائر کیے پھلا سنگھ کا جسم گولیوں سے چھلنی ہو گیا اور وہ ہاتھی کی پیٹھ پر ہی ڈھیر ہو گیا۔پھلا سنگھ کی موت کی خبر نے نہنگ جنگجوؤں کو مزید بھڑکا دیا اور اب وہ دشمن کو بچ کر جانے کا موقع نہیں دے رہے تھے غازیوں کی تباہی کا آغاز دوپہر میں ہوا جب سکھ گھڑسوار ان پر چاروں طرف سے حملہ آور ہوئے اور انھیں اپنے نیزوں کی انی پر اٹھا لیا۔عظیم خان اس قتلِ عام کا نظارہ ندی کے پار کھڑا دیکھ رہا تھا۔اس نے دیکھا کہ شام کے اندھیرے میں کئی غازیوں نے جو سکھوں کا محاصرہ توڑنے میں کامیاب ہو گئے تھے دریائے اٹک کی لہروں میں چھلانگ لگا دی۔دریا عبور کرنے کی کوشش میں تقریباً تین سو غازی لہروں کی نذر ہو گئے۔عظیم خان اس پسپائی پر

اتنا پشیمان تھا کہ اس میں پشاور کے لوگوں کا سامنا کرنے کی ہمت نہ ہوئی اور وہ افغانستان کی طرف چلا گیا3۔ مورکرافٹ کے مطابق تقریباً چار ہزار افغانی اس جنگ میں کام آئے۔ اس کے مقابلے میں دربار کا نقصان بہت کم ہوا مرنے والوں میں اکالی پھولا سنگھ اور گورکھا کمانڈر بالبھدر ابھی شامل تھے۔ افغانیوں کو عبرتناک شکست ہوئی اور قبائلیوں کو اس بات کا بخوبی علم ہو گیا کہ افغان فوج کے مقابلے میں پنجابی فوج کہیں زیادہ طاقتور تھی۔

تین روز بعد مہاراجا اپنے دستوں کی قیادت کرتا ہوا پشاور میں داخل ہوا۔ شہریوں نے اسے خوش آمدید کہا اور تحائف کے نذرانے پیش کیے۔ رات کو اس کے اعزاز میں شہر کے بازاروں میں چراغاں کیا گیا تاہم مہاراجا کی آمد کے بعد بھی شورش میں کمی نہ آئی اور قبائلی جو چیز میدان جنگ میں حاصل نہ کر سکے انھوں نے رات کی تاریکی میں سکھوں کو قتل کر کے حاصل کرنے کی کوشش کی۔

مورکرافٹ قبائلیوں کی طرف سے پنجابیوں کو ہراساں کرنے کی چالوں کو بیان کرتا ہے۔ وہ لکڑیوں کا بہت اونچا گٹھا بنا کر اسے دونوں طرف سے رسوں سے باندھ دیتے اور پھر اس گٹھے کو آگ لگا کر رسے کی مدد سے سکھوں کے خیموں کی طرف پھینک دیتے۔ دربار فوج کی طرف سے فائر کر کے جواب دیا جاتا اور سکھ فوجی خیمے چھوڑ کر اپنے چھپے ہوئے حملہ آوروں کے تعاقب میں جاتے دوسری طرف قبائلی پیچھے سے ان کے خیمے میں گھس کر قیمتی اشیا لے اُڑتے۔

رنجیت سنگھ اس طرح کی کارروائیوں سے عاجز آ چکا تھا چنانچہ جب چند روز بعد یار محمد اور اس کا بھائی دوست محمد قیمتی تحائف کے ہمراہ مہاراجا کی خدمت میں حاضر ہوئے اور معافی کے خواستگار ہوئے تو مہاراجا نے انھیں فوراً معاف کر دیا اور ان کے نذرانوں کو (جن میں گوہر بار بھی شامل تھا) شرفِ قبولیت بخشا۔ یار محمد کو پھر سے پشاور کا گورنر مقرر کیا گیا اس نے دربار کی خدمت میں سالانہ ایک لاکھ دس ہزار روپے کا نذرانہ پیش کرنے کا وعدہ بھی کیا یہ سب امور نمٹا کر رنجیت سنگھ مطمئن ہو کر گھر کی طرف لوٹا۔

مہاراجا مسلمانوں کے مقدس تہوار 'شبِ برات' کے موقع پر لاہور پہنچا۔ ہندو اور سکھ اپنے مسلمان بھائیوں کے ساتھ اس کو منانے میں شریک تھے۔ انھوں نے خیر مقدمی گیتوں سے مہاراجا کا استقبال کیا۔ ایک بار پھر اس کے راستے میں گلاب کے پھول بچھائے گئے رنجیت سنگھ نے جواباً مجمع پر سونے اور چاندی کی اشرفیاں نچھاور کیں۔ جلتے ہوئے چراغوں نے تمام رات شہر کو روشن رکھا اور آتش بازی اور پٹاخوں کی آوازیں صبح تک گونجتی رہیں۔

دربار کی سرحدیں پنجاب کے شمال اور شمال مغرب میں آخری حدوں تک پہنچ چکی تھیں۔ ان سے پرے اونچے پہاڑ اور مشکل راستوں والے علاقے تھے اگر پنجابی قلمرو مزید وسعت چاہتی ہے تو اسے سندھ کے صحرا کو عبور کر کے سمندر کی طرف رخ کرنا ہوگا یا پھر دریائے ستلج عبور کر کے انڈیا کی سمت بڑھنا ہوگا۔ انڈیا کی طرف بڑھنے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا کیونکہ وہاں انگریز حکومت کر رہے تھے جن کے پاس سارے ہندوستان کے وسائل موجود تھے اور ان کی فوج پنجاب کی فوج سے

تعداد، وسائل اور تربیت میں کہیں زیادہ تھی۔ اب سندھ کی طرف رخ کیا جا سکتا تھا رنجیت سنگھ کے ذہن میں بھی گزشتہ کچھ عرصے سے سندھ پر چڑھائی کرنے کا خیال آ رہا تھا مگر پیشتر اس کے وہ اس حوالے سے کوئی قدم اٹھاتا انگریزوں نے اپنے ایجنٹ سندھ کے امیر کی طرف روانہ کر دیے۔ جب انگریزوں اور سندھیوں کے درمیان ممکنہ اتحاد کی خبر دربار تک پہنچی تو ریاست کے اکابرین نے اس پر سخت نکتہ چینی کی اور تجویز پیش کی کہ انگریزوں کے ساتھ معاملات ہمیشہ کے لیے 'طے' کر لیے جائیں۔ پنجابی جو تازہ تازہ افغانیوں اور پٹھانوں کو شکست دے کر واپس لوٹے تھے جذباتی انداز میں تمام معاملات کو دیکھ رہے تھے اور کرپان لہرانا تو اب ان کی فطرتِ ثانیہ بن چکی تھی۔ دربار میں انگریزوں کے مقررہ کیے گئے رپورٹروں نے لدھیانہ میں بیٹھے انگریز ایجنٹ کو یہ خبر دی کہ پنجابی کسی بھی وقت ہندوستان پر حملہ کر سکتے ہیں۔ ایجنٹ نے یہ رپورٹ آگے گورنر جنرل کو بھیجتے وقت اس میں اپنی رائے شامل کرنا ضروری سمجھی۔ چند ہی مہینوں میں سارے ہندوستان میں پنجابی لشکر کے دریائے ستلج کے ساحلوں پر اکٹھا ہونے اور رنجیت سنگھ کی طرف سے تمام برِصغیر پر اپنی حکومت قائم کرنے کی خبریں گشت کرنے لگیں۔

برما کے ساتھ جنگ کے دوران انگریزوں کو یہ فکر ستاتی رہی کہ پنجابی دریائے ستلج کی سرحد کو کھلا پا کر کوئی شرارت کرنے کا پروگرام نہ بنا لیں۔

بیگم سامرو کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہ دربار کے ساتھ رابطے میں تھی ناگپور کے جلاوطن راجا نے بھی رنجیت سنگھ کو انگریزوں کے ساتھ لڑنے کے عوض خاصی رقم دینے کی پیش کش کی تھی اُدھر گورکھوں اور مرہٹوں کے ایلچیوں کے بارے بھی اطلاعات ہیں کہ انھیں لاہور میں دیکھا گیا ہے لدھیانہ میں موجود انگریزوں کے ایجنٹ نے رنجیت سنگھ کو ایک خط لکھا اور اس سے پنجابی فوج کی نقل و حرکت اور بڑے پیمانے پر اسلحہ جمع کرنے کی وضاحت چاہی چونکہ پنجاب میں اسلحہ یا فوج اکٹھی ہو رہی تھی نہ ہی کسی قسم کی کوئی جنگی تیاری ہو رہی تھی رنجیت سنگھ نے انگریز ایجنٹ کو محبت بھرے انداز میں ڈانٹتے ہوئے تنبیہہ کی کہ اسے اس طرح کی افواہیں پھیلانے والوں کی بات پر توجہ نہیں دینی چاہیے۔ اگر اسے کسی قسم کا کوئی شک تھا تو پہلے لدھیانہ میں موجود دربار کے ایجنٹ سے اس حوالے سے بات کرنی چاہیے تھی۔ رنجیت سنگھ کی چٹھی اس نصیحت کے ساتھ اختتام پذیر ہوئی: "آئیں ہم دوستی کے آئینے کو صاف شفاف رکھیں"4۔ برطانوی حکومت نے اپنے ایجنٹ کے احتجاج اور اس اصرار کے بعد کہ انگریز کبھی افواہوں پر کان نہیں دھرتے، رنجیت سنگھ کے جواب پر اطمینان کا اظہار کرتے ہوئے معاملے کو وہیں ختم کر دیا۔

اگر رنجیت سنگھ کی صحت اجازت دیتی تو وہ انگریزوں کی برمیوں کے خلاف مہم کا بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے سندھ کی طرف بڑھتا مگر خرابیِ صحت کی بنا پر وہ ایسا کچھ نہ کر سکا۔ یہ وہ سال تھا جب رنجیت سنگھ پے در پے فالج کے حملوں کا شکار ہوا ان حملوں نے اُس کی قوتِ ارادی کو تار تار کر دیا۔ اس ذاتی جسمانی کمزوری کے علاوہ جو مسئلہ اسے درپیش تھا وہ شمال مغربی سرحدی صوبے میں اس کی فوجی مہم پر اٹھنے والے بے شمار اخراجات تھے۔ اسے فوجیوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دینا پڑ رہی تھیں (اسی برس فرانسیسی افسروں سے مالی امداد کی درخواست کی گئی تھی)۔ وقتی طور پر حاصل ہونے والی آمدن رام آنند

صارف کی جاگیر کے 20 لاکھ روپے تھے۔ رام آنند امرتسر کا ایک امیر ساہوکار تھا جو بغیر وصیت کیے ستمبر 1823 میں مر گیا تھا۔ تاہم یہ رقم ریاستِ پنجاب کے تمام اخراجات پورا کرنے کے لیے یا ایک اور جنگی مہم پر اٹھنے والے اخراجات پورا کرنے کے لیے کافی نہیں تھی لہٰذا حکومت کی اولین ترجیح پیسے اکٹھے کرنا تھا۔

دسہرا کے موقع پر ہونے والے سالانہ فوجیوں کے اکٹھ کے بعد مہاراجا رنجیت سنگھ نے پنجاب کے جنوب مغربی علاقوں کی طرف کا سفر کیا اور وہاں کی ریاستوں کے مسلمان سرداروں سے ان کے ذمہ واجب الادا ٹیکس وصول کیا۔ دیوالی کا تہوار اس نے خوشاب میں منایا۔ نومبر کے آغاز میں اس نے اٹک کے مقام سے دریائے سندھ کو کئی بار عبور کیا اور ڈیرہ اسمٰعیل خان، بنوں، بھکر، لیہ اور ڈیرہ غازیخان کے دورے کیے۔ دسمبر میں جب وہ واپس اپنے صدر مقام لوٹا تو اس کی تجوریوں میں اتنی دولت بھر چکی تھی جو ریاست کے خزانے میں پہلے کبھی جمع نہیں ہوئی تھی اسی ماہ اوپر والے نے ایک اور سبب بنایا کانگڑہ کا راجا سنسر چند سور گواسی ہو گیا اور اس کے لڑکے انیرودھا چند نے جانشینی کے موقع پر دی جانے والی فیس ایک لاکھ روپے خزانے میں جمع کرائے۔

جولائی 1825 میں مصر دیوان چند بھی دنیا سے گزر گیا اس کے مرنے کے بعد دربار کی فوج کے پاس بہت کم قابل اور باصلاحیت پنجابی جرنیل بچ گئے تھے نتیجتاً مہاراجا نے نئی حکمت عملی بنانے اور فوجی اہداف مقرر کرنے کے لیے اپنے یورپی جرنیلوں پر زیادہ سے زیادہ بھروسا کرنا شروع کر دیا تھا جن جرنیلوں کی رائے کو وہ اہمیت دیتا ان میں سب سے پہلے ونٹورا کا نام آتا ہے۔ دربار کی طرف سے رسمی طور پر اقتدار کھڑک سنگھ کے ہاتھ میں تھا یا اس کے بھائی شیر سنگھ کے پاس۔ شیر سنگھ نہ صرف باپ کی نظروں میں اپنا مقام بنا چکا تھا بلکہ خاص و عام میں یکساں مقبول تھا۔

شیر سنگھ کی بڑھتی ہوئی شہرت کھڑک سنگھ اور اس کی ماں راج کور کے لیے پریشانی کا باعث بنتی جا رہی تھی۔ 1826 جنوری میں جب رنجیت سنگھ ایک دورے پر روانہ ہونے لگا تو اس نے شیر سنگھ کو دربار میں اپنا نائب مقرر کیا۔ کھڑک سنگھ کے لیے شیر سنگھ کی بطور مہاراجا کے نائب تقرری توہین کا باعث تھی۔ اس برس کے آخر میں جب رنجیت سنگھ بیمار پڑ گیا تو کھڑک سنگھ نے مہاراجا کا جانشین بننے کے لیے انگریزوں سے مدد مانگی اور ان سے خفیہ مذاکرات کا آغاز کیا کھڑک سنگھ اور انگریزوں کے درمیان خفیہ روابط سے ان افواہوں کو تقویت ملی کہ شیر سنگھ اور تارا سنگھ رنجیت سنگھ کے اصل بیٹے نہیں تھے بلکہ سدا کور نے دو بے سہارا بچوں کو رنجیت سنگھ کا جانشین ظاہر کرتے ہوئے اس پر مسلط ہونے کی کوشش کی تھی۔

ابھی یہ تنازع شاہی خاندان کے اندر پک رہا تھا کہ مہاراجا کا پرانا دوست جس کے ساتھ مل کر اس نے کیے جنگوں میں حصہ لیا، فتح سنگھ اہلیا نوالا ستلج عبور کر کے پنجاب سے فرار ہو گیا تاہم اس کی پریشانی بے وجہ نہیں تھی رنجیت سنگھ نے پنجاب کی تمام مثلوں اور راجواڑوں کو (دو کو چھوڑ کر) دربار میں ضم کر دیا تھا سدا کور بھی ختم کی جا چکی تھی اور اب اہلیا نوالہ کی مثل بچ گئی تھی اور لوگوں نے کہنا شروع کر دیا تھا کہ اب بس چند روز ہی کی بات ہے فتح سنگھ اہلیا نوالا کے ساتھ بھی وہی کچھ ہونے جا رہا ہے

جو دوسرے سرداروں کے ساتھ ہوا ہے اس بے بنیاد پراپیگنڈے کے پیچھے کوئی اور نہیں خود فتح سنگھ کے لاہور میں بیٹھے ایجنٹ تھے ان نام نہاد بہی خواہوں نے فتح سنگھ کو یہ کہہ کر کہ ستلج کے پار چلے جانے میں ہی دانشمندی ہے اس کے ساتھ اپنی وفاداری ظاہر کرنے کی کوشش کی انھوں نے فتح سنگھ کے دل میں پکنے والے خدشات کو مزید ہوا دی یہاں تک کہ وہ بوریا بستر باندھ کر ستلج کے پار انگریزوں سے مدد مانگنے چلا گیا۔ 6

انگریز اپنے اس مہمان کے سامنے شرمندہ تھے جبکہ رنجیت سنگھ کو اس بات کا دکھ تھا کہ اس کا ایک قریبی ساتھی اس پر اعتبار کرنے کو روادار نہیں۔ خوش قسمتی سے دونوں طرف سے کسی نے بھی اس صورتحال سے فائدہ اٹھانے کی کوشش نہیں کی انگریز اگر چاہتے تو فتح سنگھ کو اپنے پاس ٹھہرا کر بعد میں اُسے رنجیت سنگھ کے خلاف کسی وقت استعمال کر سکتے تھے اور رنجیت سنگھ کے پاس تو اس بات کا پورا جواز موجود تھا کہ وہ حملہ کر کے پوری اہلیا نوالہ ریاست کو پنجاب میں ضم کر لیتا۔ انگریز نمائندے نے فتح سنگھ اہلیا نوالہ کو واپس بھیجنے اور رنجیت سنگھ کے ساتھ صلح کرنے پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ دوسری طرف رنجیت سنگھ نے بھی اپنے ایلچی فتح سنگھ کے پاس بھیجے اور یہ پیغام بھجوایا کہ رنجیت سنگھ کا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور اس حوالے سے اس کے خدشات قطعی بے بنیاد ہیں دل شکستہ و دلگیر اہلیا نوالہ واپس پنجاب لوٹ گیا۔ فتح سنگھ کا پنجاب پہنچنے پر استقبال کرنے کے لیے رنجیت سنگھ نے اپنے پوتے نونہال سنگھ اور دھیان سنگھ (جسے حال ہی میں شہزادہ کا لقب دیا گیا تھا اور وزیروں کی کونسل کا نگران بنایا گیا تھا) کو بھیجا ان دونوں شہزادوں کو یہ واضح ہدایت تھی کہ فتح سنگھ کو اپنے ہمراہ عزت و احترام سے لاہور لے کر آئیں۔ دونوں پرانے یاروں کے درمیان ہونے والی ملاقات خاصی جذباتی اور پر اثر تھی۔ فتح سنگھ نے اپنی تلوار نیام سے نکال کر رنجیت سنگھ کے قدموں میں رکھ دی اور درخواست کی کہ وہ غداری کا مرتکب ہونے پر اس کا سر اڑا دے۔ رنجیت سنگھ نے فتح سنگھ کو بازوؤں میں بھر لیا اور دونوں دوستوں کی آنکھوں میں آنسو آ گئے فتح سنگھ کو اس کی جاگیروں کی ملکیت کی تاحیات ضمانت دی گئی۔ مہاراجا نے اسے قیمتی تحائف سے لاد دیا جن میں ایک ہاتھی بھی شامل تھا جس پر ایک نہایت قیمتی اور سجا سجایا ہدا لگا ہوا تھا

1826 کے موسمِ گرما میں رنجیت سنگھ ایک بار پھر بیمار پڑ گیا' بے رحم قدرت کے سخت فیصلے کے باعث مہاراجا اپنی سدھ بدھ کھو بیٹھے' سوہن لال مہاراجا کی بیماری کا نقشہ کچھ یوں کھینچتا ہے۔ اس طرح کی افواہیں گردش کرنے لگ گئیں کہ 'شیر' کو کاری ضرب لگ چکی ہے اور اب وہ چند دنوں کا مہمان ہے۔ لوگوں نے مہاراجا کی بیماری کے پیشِ نظر کسی طرح کی بھی ناگہانی صورتحال کا مقابلہ کرنے کے لیے خود کو تیار کرنا شروع کر دیا' وہ لوگ جو ہمیشہ چٹ پٹی خبروں کی تلاش میں رہتے ہیں عجیب بے وقوفی کی باتیں کرنے لگے' سوہن لال لکھتا ہے' لیکن وہ سب لوگ جو مہاراجا کے سچے خیر خواہ تھے، اس کے وفادار ملازمین، بوڑھے خادمین سب کے سب نہایت کرب و ابتلا کی کیفیت سے دوچار تھے۔ یہ سب لوگ رنجیت سنگھ کی صحتیابی کی دعائیں مانگ رہے تھے۔ رنجیت سنگھ خود بھی یہ محسوس کر رہا تھا کہ اب اس کے دن گنے جا چکے ہیں اس نے اپنے مصاحبین کو حکم دیا کہ وہ اسے امرتسر بھجوانے کا بندوبست کریں وہاں پہنچ کر رنجیت سنگھ نے تمام دوپہر گولڈن ٹیمپل میں عبادت کرتے ہوئے

گزاری۔ فقیر امام الدین کو لدھیانہ روانہ کیا گیا تا کہ وہ کسی انگریز ڈاکٹر کو امرتسر لے کر آئے۔ گورنر جنرل نے بھی ایسٹ انڈیا کمپنی کے ڈاکٹر مرے کی خدمات حکومتِ پنجاب کو مستعار دیں۔ ڈاکٹر نے رنجیت سنگھ کو تبدیلی آب وہوا کی غرض سے اس بات پر قائل کرلیا کہ وہ قلعے کے داخلی کمروں سے نکل کر شالیمار باغ چلا جائے۔ سوہن لال نے اگلے چھ روز کی داستان کچھ یوں بیان کی ہے

''شالیمار باغ کی تر وتازہ ہوااور معطر فضا کا رنجیت سنگھ کی طبیعت پر نہایت خوشگوار اثر ہوا اور اس کی طبیعت ہشاش بشاش ہوگئی اور مہاراجا کی بیماری کے باعث لوگوں کے مرجھائے ہوئے چہرے (اس خوشگوار تبدیلی) پر کھل اٹھے۔''

دسہرا سے پہلے ہی مہاراجا اپنے پیروں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو گیا۔ ڈاکٹر مرے کو اس کی خدمات کا بھرپور معاوضہ دیا گیا اور بے شمار تحائف کے ساتھ روانہ کیا گیا رنجیت سنگھ دیوالی کی تقریبات میں حصہ لینے اور نئی زندگی عطا کرنے پر اپنے گرو کے آگے شکر گزاری کا ماتھا ٹیکنے کے لیے امرتسر روانہ ہو گیا۔

16

دوستی کی کونپل اور اُس کی آبیاری

طویل بیماری بھی مہاراجا کے اندر کا شعلہ مدھم کرنے میں ناکام رہی۔ ابھی وہ بمشکل گھوڑے کی پیٹھ پر لگام پکڑ کر بیٹھنے کے قابل ہوا تھا کہ اس کی سوچوں کا رخ ایک بار پھر سندھ کی جانب ہو گیا۔ اب تک انگریزوں نے سندھ کے مختلف امیروں کے ساتھ تجارتی تعاون کے علاوہ کوئی معاہدے نہیں کیے تھے۔ رنجیت سنگھ کے نزدیک تجارتی تعاون بڑھانے کے اِن معاہدوں کے پیچھے انگریزوں کے سیاسی مقاصد کارفرما ہو سکتے تھے یہ اس طویل پالیسی کا نقطۂ آغاز ثابت ہو سکتے تھے جس کے نتیجے میں سندھ کو بالآخر انگریز قلمرو کا حصہ بننا تھا۔ رنجیت سنگھ کی تمام امیدیں 1809 کے اس معاہدے سے وابستہ تھیں جس کے مطابق انگریزوں کو دریائے ستلج کے مغرب میں واقع ملکوں کے معاملات میں دخل اندازی کرنے کا کوئی حق نہیں تھا تاہم وہ اپنی مہم پر روانہ ہونے سے پہلے انگریزوں سے اس معاہدے پر کاربند رہنے کی یقین دہانی لینا چاہتا تھا اس کے علاوہ ملاوی ریاستوں کے حوالے سے بھی چھوٹے چھوٹے معاملات پر وضاحت لینا ضروری تھی۔

گورنر جنرل لارڈ امہرسٹ (Lord Amherst) موسم گرما میں کلکتہ چھوڑ کر گرم میدانی علاقوں سے ہوتا ہوا شملہ کی طرف رواں دواں تھا رنجیت سنگھ نے اسے پنجاب کی سرحد کے قریب پہنچنے پر نیک خواہشات کا پیغام بھجوایا اور ایک مختصر مراسلہ بھجوایا جس میں مخصوص مشرقی انداز میں لکھا تھا: ''خدا ہی جانتا ہے میرے دل میں آپ سے ملاقات کی کتنی شدید آرزو ہے۔''

رنجیت سنگھ نے بہت دکھ بھرے انداز میں اپنی اس مجبوری کا ذکر کیا کہ ڈاکٹر مرے نے اسے لمبے سفر سے منع کیا ہے اور دوسرا یہ کہ اس کے دونوں لڑکے شہزادہ کھڑک سنگھ اور شہزادہ شیر سنگھ دور دراز کے علاقوں میں جنگی مہمات میں مصروف ہیں نتیجتاً اس (رنجیت سنگھ) کے پاس اپنے جذبات گورنر جنرل تک پہنچانے کا بس یہی چارہ تھا کہ وہ اپنے قابلِ اعتماد مصاحبوں کو

دیوان موتی رام فقیر امام الدین کو رقعہ دے کر بھیجے۔ لارڈ امہرسٹ نے مہاراجا کی نیک تمناؤں کا خیر مقدم کرتے ہوئے اس کے دونوں سفیروں کو شملہ ملاقات کی دعوت دے ڈالی۔

گورنر جنرل نے موتی رام اور فقیر امام الدین کا بھرے دربار میں جہاں سینئر انگریز افسروں کے ساتھ ساتھ پاس کی ریاستوں کے راجے بھی بیٹھے تھے استقبال کیا۔ لدھیانہ میں سرکارِ برطانیہ کے نمائندے کیپٹن ویڈ نے رابطہ افسر کے فرائض انجام دیئے۔ مہاراجا کے سفیروں نے گورنر جنرل کی نذر قیمتی کشمیری شالیں کیں، اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور ایک عدد ہاتھی اس کے علاوہ تھے۔ انگلستان کے بادشاہ کے لیے بہترین کشمیری اُون (پشم) کا بنا ہوا خیمہ بھی ان تحائف کی فہرست میں شامل تھا۔

آپس کی رسمی بات چیت کے دوران مہاراجا کے نمائندوں نے دریائے ستلج کے مغرب میں واقع بعض علاقوں پر انگریزوں کے دعوے کا ذکر کیا اور اس بات کا اشارہ دیا کہ مہاراجا سندھ کی طرف بڑھنا چاہتا ہے۔ لارڈ امہرسٹ کا جواب جذبۂ خیر سگالی تک محدود رہا اس نے اس بات کا اعلان بھی کیا کہ جلد ہی کمپنی بہادر کے سینئر افسروں کا ایک وفد لاہور کا دورہ کرے گا۔

مئی 1827 کے آخری ہفتے میں مہاراجا نے کمپنی کے وفد کا جس میں کیپٹن ویڈ، گورنر جنرل کا اے ڈی سی کیپٹن پیرسن اور سرجن جیرارڈ شامل تھے کا امرتسر میں استقبال کیا۔ انھوں نے گورنر جنرل کی طرف سے مہاراجا کی خدمت میں انگریزی اعلیٰ نسل کے گھوڑے، ایک ہاتھی، ایک ہیروں سے جڑی تلوار، پستولیں اور بنارس کی کمخواب پیش کی۔ رنجیت سنگھ نے ایک بار پھر ملاوہ کے چند قصبوں پر اپنی ملکیت کا دعویٰ کیا اور سندھ پر لشکر کشی کا ارادہ ظاہر کیا۔ انگریز وفد نے ان دونوں باتوں پر کوئی تبصرہ نہیں کیا۔

انگریزوں کے ممکنہ ردِعمل کے علاوہ چند دوسرے عوامل بھی تھے جن کے باعث سے رنجیت سنگھ نے خود کو سندھ پر چڑھائی کرنے سے باز رکھا ہوا تھا: کشمیر میں آنے والا زلزلہ جو بھاری جانی و مالی نقصان کا سبب بنا پھر مون سون بارشوں کے نہ ہونے کی وجہ سے وادی میں پیدا ہونے والا قحط؛ اُدھر لاہور میں پھیلنے والا ہیضہ؛ رنجیت سنگھ کی اپنی صحت اس قابل نہ تھی کہ وہ شہر میں قیام کرتا لہٰذا اس نے راوی کنارے دلکشا میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے۔ کانگڑہ میں پیدا ہونے والا مسئلہ اور اُدھر شمال مغربی سرحد پر سید احمد، ایک قدامت پسند مسلمان (جس نے اسلام اور جہاد کے نام پر مقامی قبائلیوں کو کافر سکھوں کے خلاف اکٹھا کرنا شروع کر دیا تھا) کی سرکشی زلزلہ، قحط اور بیماری کے علاوہ ایسی وجوہات تھیں جن کے پیشِ نظر رنجیت سنگھ کو اپنی سندھ کی مہم کھٹائی میں پڑتی نظر آ رہی تھی۔

کانگڑہ کا مسئلہ ایک معمولی غلط فہمی سے پیدا ہوا اور دیکھتے ہی دیکھتے خوفناک صورت اختیار کر گیا۔ ماضی میں کچھ عرصہ سے ڈوگرہ برادران گلاب سنگھ، دھیان سنگھ اور سچت سنگھ لاہور دربار میں خاص مقام حاصل کرتے چلے آ رہے تھے ان تینوں

بھائیوں میں دھیان سنگھ کچھ زیادہ نمایاں تھا۔ اس نے پہلے جمعدار خوشحال سنگھ کی جگہ ڈیوڑھی دار کی جگہ لی اور تھوڑے ہی عرصے میں اسے ڈیوڑھی دار سے 'وزیروں کے سربراہ' کے عہدے پر ترقی دیدی گئی۔ یہی نہیں 1828 میں مہاراجا رنجیت سنگھ نے اسے 'راجا راجگان' کا خطاب عطا کیا۔ اسی طرح دھیان سنگھ کے لڑکے ہیرا سنگھ کے لیے مہاراجا اپنے بیٹوں سے بھی زیادہ شفقت اور پیار کے جذبات رکھتا تھا اور اسے اُن مواقع پر بھی مہاراجا کے قریب بیٹھے رہنے کی اجازت ہوتی جب دوسرے درباری (جن میں اس کا باپ دھیان سنگھ بھی شامل تھا) کھڑے رہتے۔ اسے مہاراجا کی طرف سے اجازت طلب کیے بغیر بولنے کی اجازت تھی اور وہ اکثر بغیر کسی خوف یا خدشے کے اپنے دل کی بات بھرے دربار میں کر دیا کرتا تھا۔ وہ مہاراجا کے ہمراہ اس کی پالکی میں سفر کرتا اور شکار کے دوران مہاراجا کے ساتھ ساتھ ہوتا۔ دوسہرا کے موقع پر مہاراجا نے اس نوعمر لڑکے کی پیشانی پر زعفران کا لیپ کرتے ہوئے اسے راجا کا لقب دیا۔ اب مہاراجا کو اپنے اس لاڈلے کے لیے مناسب لڑکی کی تلاش تھی۔ راجپوتوں کی اونچی نسل کے خاندانوں میں کانگڑہ کے سنسر چند کا خاندان دوسروں سے ممتاز تھا۔

سنسر چند کا 1823 کی سردیوں میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اپنی بیویوں اور داشتاؤں سے ہونے والے بیٹوں اور بیٹیوں کی ایک فوج چھوڑ کر مرا تھا۔ اس کے جانشین انورادھا سنگھ کی دو سگی بہنیں تھیں اور دونوں غیر شادی شدہ۔ 1825 میں رنجیت سنگھ کے جوالا مکھی کے دورے کے دوران انورادھا سنگھ اس سے ملنے آیا تو اس نے سنسر چند اور ڈوگرہ خاندانوں کے درمیان رشتے کی بات کی مہاراجا کی بات سن کر انورادھا خاموش ہو گیا تاہم بعد میں اس نے مہاراجا تک یہ پیغام پہنچوا دیا کہ وہ اپنے اعلیٰ نسل کے خاندان کا ڈوگروں کے ساتھ جن کے خاندان کو نئی نئی شہرت ملی ہے، رشتہ نہیں کر سکتا تھا۔ انورادھا کی ماں جو ایک دبنگ راجپوتانی تھی نے یہ قسم کھائی کہ وہ اپنی بیٹیوں کو مرتا ہوا دیکھ سکتی تھی مگر ہیرا سنگھ کے ساتھ بیاہ نہیں کر سکتی۔ رنجیت سنگھ نے اپنی ناراضگی کا اظہار کیا تو انورادھا دریائے ستلج عبور کر گیا اور انگریزوں سے لاہور دربار کے خلاف تحفظ مانگا اپنی دونوں بہنوں کو وہ پہلے ہی ٹیڑھی گروال کے راجا کے ساتھ بیاہ چکا تھا۔

انورادھا چند کے اس ناروا اور جلد باز رویے پر مہاراجا نہایت دکھی ہوا۔ اس نے کانگڑہ پر چڑھائی کی اور انورادھا کی دونوں بہنوں جن کے حسن کی دور دور تک دھوم مچی تھیں شاہی حرم میں شامل کر لیا۔ ایک برس بعد اس نے ہیرا سنگھ کے لیے لڑکی ڈھونڈی اور بہت دھوم دھام سے اس کی شادی کی گویا وہ اس کا حقیقی بیٹا ہو۔ فوجی مہمات سے عاری یہ عرصہ انتظامی اصلاحات اور نظامِ انصاف کو بہتر بنانے میں صرف ہوا۔ چھوٹے دیہاتوں اور قصبوں کو بڑے شہروں سے جوڑنے کے لیے سڑکیں بنائی گئیں۔ لاہور اور امرتسر کے درمیان سڑک کی مرمت کی گئی اور دونوں اطراف درخت لگائے گئے اس تمام راستے کے دوران وقفے وقفے سے ریسٹ ہاؤس بنائے گئے امرتسر اور لاہور میں باغات کی تعمیر کی گئی۔

ان دنوں پنجاب میں باقاعدہ کوئی قانون مروج نہیں تھا۔ سوائے مسلمانوں کے نظامِ شریعت کے۔ تاہم تمام پنجابی (بشمول مسلمان) پہلے سے مروجہ رسوم و رواج کے تحت زندگی گزار رہے تھے۔ اس روایتی قانون کا نفاذ عدالتی فیصلوں کے

ذریعے ہوتا تھا جبکہ پنچائتیں ان عدالتوں کے ماتحت چھوٹی عدالتوں کے طور پر کام کرتی تھیں۔ اگر ایک فریق کو پنچائت کے فیصلے پر اعتراض یا شکایت ہوتی تو وہ کاردار یا بڑے شہر کی عدالت جس کا سربراہ ناظم ہوتا سے رجوع کرتا۔ دربار نے بڑے شہروں میں ایسے عدالتی افسر مقرر کیے ہوئے تھے جن کا کام صرف پنچایت کے فیصلوں کے خلاف اپیل سننا ہوتا۔ لاہور میں اپیل کی سماعت کے لیے عدالتِ اعلیٰ موجود تھی۔ مہاراجا اور اس کا دربار ایسی سپریم کورٹ کے طور پر کام کرتے جس کو پنچائت، کاردار، ناظم یا عدالتِ اعلیٰ کے فیصلوں کو برقرار رکھنے یا کالعدم قرار دینے کا اختیار ہوتا۔

مذکورہ ٹریبونل ہر قسمی مقدمے مثلاً دیوانی، مالیاتی، ازدواجی اور فوجداری، کی سماعت کرتے۔ جرائم کی سزا مروجہ طریقِ کار کے مطابق جرمانہ عائد کر کے دی جاتی۔ کسی بھی جرم کی سزا موت نہیں تھی ماسوائے جب ناظم نے مارشل لا نافذ کیا ہو (جیسا کہ ایوی ٹیبل نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں مارشل لاء لگایا ہوا تھا) عام حالات میں قتل کی سزا بھی جرمانہ وصول کر کے یا جسم کا کوئی حصہ کاٹ کر دی جاتی۔ جیلوں میں صرف سیاسی قیدی رکھے جاتے تھے۔ تشدد یا چوری میں ملوث مجرموں سے جرمانہ وصول کیا جاتا یا پھر انھیں جسمانی سزا دی جاتی۔ عموماً اس طرح کے جرم کی سزا ناک، کان یا ہاتھ کاٹ کر دی جاتی۔ انصاف غیر شائستہ مگر سستا، فوری اور مروجہ روایات کے عین مطابق تھا۔

مہاراجا نے انصاف کی فراہمی میں دلچسپی لینا شروع کر دی تھی وہ خود اپنے مقرر کردہ عدالتی افسروں کے خلاف درخواستوں کی سماعت کرتا۔ اپیل کا طریقہ بھی شمالی ہندوستان کے نظامِ عدل میں موجود طریقِ کار کے مطابق تھا۔ کوئی بھی فریادی جو انصاف کے حصول میں ناکام رہتا مہاراجا کے محل کے دروازے پر آ سکتا تھا یا راستے میں مہاراجا کی سواری کو یہ کہہ کر 'دہائی ہے حضور دہائی ہے' روک سکتا تھا۔ وہ اپنی فریاد اس کے گوش گزار کرتا۔ رنجیت سنگھ ایسی فریاد پر فوری فیصلہ سناتا یا انھیں اپنے وزیروں میں سے کسی ایک کے حوالے کر دیتا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ رنجیت سنگھ اپنے نظامِ عدل سے مطمئن نہیں تھا شاید اسی لیے اس نے 1828 میں بہادر سنگھ ہندوستانی کو سلطنت کا دیوانی اور فوجداری قانون مرتب کرنے کی ذمہ داری سونپی۔ شہزادہ شیر سنگھ کو عدالتی تربیت حاصل کرنے پر مامور کیا گیا۔[1]

کانگڑہ سے فارغ ہو کر مہاراجا نے شمال مغربی سرحدی صوبے میں اٹھنے والی سرکشی کی لہر کی طرف دھیان دیا جسے بھارتی صوبے اتر پردیش کے شہر رائے بریلی کا رہنے والا سید احمد ہوا دے رہا تھا۔ سید احمد دہلی کے ایک مشہور بزرگ شاہ ولی اللہ کا شاگرد تھا جس نے ہندوستان میں ترغیبِ محمدیہ تحریک کی بنیاد رکھی تھی۔ یہ تحریک عرب کی وہابی جماعت کی ایک شاخ تھی۔ سید احمد نے ولی اللہ سے ملنے کے بعد ہندوستان سے کافروں کو نکالنے کا بیڑہ اٹھایا۔ اس کے قریبی ساتھیوں میں شاہ اسمٰعیل اور مولوی عبدالحئیٰ کو نمایاں مقام حاصل تھا۔ سید احمد نے دہلی سے کلکتہ کا سفر کیا اور (پنجاب میں سکھوں کے 'مظالم' کے حوالے سے) بڑے بڑے جلسوں سے خطاب کیا۔ سید احمد ایک لاکھ رضا کاروں کی فوج بنانے میں کامیاب ہو گیا (اس عظیم مقصد کی خاطر) اس پر چاروں اطراف سے پیسہ برسنے لگا۔ اس مہم میں اسے دہلی کے مغل حکمرانوں اور ہندوستان کی مسلم

ریاستوں کے راجوں اور نواب خصوصاً ٹونک کے نواب کی سرپرستی حاصل تھی۔

سید احمد 1822 میں مکہ کے لیے روانہ ہوا۔ وہاں اس نے اپنی مہم کی کامیابی کی دعا کی۔ مکہ میں اس کی وہابیوں سے کئی ملاقاتیں ہوئیں۔ ان ملاقاتوں سے اسے اندازہ ہوا کہ اب تک وہ جو خواب دیکھ رہا تھا اس کے پورے ہونے کا وقت آ گیا ہے۔ یہ سوچ کر ہی اسے نشہ ہو رہا تھا: یعنی ہندوستان کے ہر ضلع میں ہلالِ اسلام کا جھنڈا لہرانا2۔ واپس ہندوستان آ کر سید احمد نے جہاد کا اعلان کیا اور مسلمانوں سے اس کارِ عظیم میں حصہ لینے کو کہا۔ اگر چہ انگریز بھی اُتنے ہی کافر اور لادین تھے جتنا کہ سکھ مگر اس نے واضح کیا کہ اس کی جنگ سکھوں کے خلاف ہے انگریزوں کے خلاف نہیں۔ شاید اسی بنا پر ہندوستان کی حکومت نے اسے اس مہم سے باز رکھنے کی کوئی کوشش نہیں کی 3 بلکہ اس مہم کو زور پکڑنے کا پورا موقع فراہم کیا گیا اور ہزاروں مسلح جنگجوؤں کو سندھ کی سرحد پار کر کے پنجاب کے شمال مغربی سرحدی علاقے کی طرف جانے کی اجازت دی گئی۔ ہندوستان کے تمام بڑے شہروں میں جہادی مراکز کو بلا روک ٹوک کام کرنے کی اجازت دی گئی۔ شمالی ہندوستان میں تقسیم کیا جانے والا ایک پمفلٹ اس تمام صورتحال کی بہتر عکاسی کرتا ہے:

"لاہور اور دوسری جگہوں پر سکھ قوم لمبے عرصہ سے اقتدار میں ہے۔ اس نے اب تک جو مظالم ڈھائے ہیں ان کی کوئی حد نہیں۔ ہزاروں مسلمانوں کا قتل کیا جا چکا ہے اور دیگر ہزاروں کو ذلت آمیز زندگی گزارنے پر مجبور کیا جا رہا ہے۔ مسلمانوں کو مساجد میں اذان دینے سے روکا جا رہا ہے جبکہ گائے کو ذبح کرنے پر مکمل پابندی لگائی جا چکی ہے۔ اب جبکہ ان کے کیے گئے مظالم برداشت سے باہر ہو چکے ہیں حضرت سید احمد (خدا ان پر اپنی نوازشات کی بارش کرے) دینِ اسلام کے تحفظ کی خاطر چند مسلمانوں کو ہمراہ لیے کابل اور پشاور کی طرف نکلے ہیں اور الحمدللہ اس دوران اُن کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ہزاروں مسلمان غفلت کی نیند سے بیدار ہو کر ان کے شانہ بشانہ اس عظیم الشان جہاد پر روانہ ہو چکے ہیں جس کا آغاز 21 دسمبر 1826 کو ہوگا۔"

ہندوستانی مجاہدوں کے اس لشکر میں قبائلیوں کی بڑی تعداد بھی شامل ہو گئی خصوصاً یوسفزئی اور خٹک قبیلے کے لوگ جو ہمیشہ پنجاب کو نقصان پہنچانے کے موقع کی تلاش میں رہتے تھے یار محمد نے اپنی لاابالی طبیعت اور بے ایمان فطرت کے ہاتھوں مجبور ہو کر اور جیتنے والی پارٹی کے ساتھ الحاق کرنے کا سوچ کر ایک بار پھر پشاور خالی کر دیا۔

رنجیت سنگھ نے اپنے بہترین اور بااعتماد کمانڈروں بدھ سنگھ سندھاوالیہ (جسے کیپٹن ویڈ نے پنجاب کا باصلاحیت ترین جنگی سپہ سالار کا خطاب دیا تھا) ونٹورا اور الرڈ کو پشاور پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لیے روانہ کیا سید احمد اپنے لشکر کے ہمراہ پشاور سے باہر نکل آیا اور اٹک کے قریب اکوڑہ کے مقام پر 21 دسمبر 1826 کو دونوں فوجوں کا آمنا سامنا ہوا۔ رنجیت سنگھ کی فوج کے نظم وضبط کے سامنے سید احمد کے رضاکاروں کے مذہبی نعروں کی ایک نہ چلی۔ جہادیوں کو راستے سے ہٹنا پڑا اور پشاور پر ایک بار پھر رنجیت سنگھ کی فوج کا قبضہ ہو گیا۔ یار محمد ایک بار پھر اپنے گھٹنوں پر جھک گیا تھا اس نے اپنے بھائیوں کو بطور یرغمال

پیش کیا اعلیٰ نسل کے گھوڑے اور تحائف پیش کیے اور وعدہ کیا کہ وہ مہاراجا کا وفادار رہے گا۔ 4

دوسری جانب جہادی اکوڑہ خٹک کے میدان میں لگنے والے جھٹکے سے اب سنبھل چکے تھے۔ انہوں نے یار محمد کی 'غداری' کو اُس وقتی ہزیمت کی اصل وجہ بتایا۔ سید احمد واپس پہاڑوں کی جانب چلا گیا جہاں اُس نے مہاراجا کی فوج کے بکھرے ہوئے دستوں کو ہراساں کرنا شروع کر دیا۔ ان معمولی جھڑپوں کو 'عظیم الشان' فتوحات کا نام دے کر سارے ہندوستان کے مسلمانوں میں مسرت کی لہر دوڑا دی گئی۔ مٹکاف نے گورنر جنرل کے نام ایک مراسلے میں اس مہم کے دور رس اثرات کو کچھ یوں بیان کیا ہے:

'سید احمد، مولوی اسمٰعیل اور ان کے ساتھیوں نے ہماری مسلم رعایا کے اذہان پر گہرے اثرات چھوڑے ہیں۔ حال ہی میں رنجیت سنگھ کے علاقوں میں ان کی کارروائیوں نے دہلی کی مسلم بستیوں میں ہیجان برپا کر دیا ہے۔ کئی مسلمان خاندان تو ایسے ہیں جنھوں نے کمپنی بہادر کی فوجی اور شہری نوکریوں سے استعفیٰ دیدیا ہے اور سید احمد کی فوج کا حصہ بننے کے لیے پشاور روانہ ہوگئے ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ ان لوگوں کو دہلی کے بادشاہ کی آشیرباد حاصل ہے۔' 5

سید احمد کی دلیرانہ جنگی چالوں نے جلد ہی دربار کی فوج کو دفاعی حکمتِ عملی اپنانے پر مجبور کر دیا۔ دربار کے ایجنٹوں نے چند قبائلی سرداروں کی وفاداریاں خریدنے کی کوشش کی مگر جہادیوں کے اثر و رسوخ کے سامنے 'کافروں کے پیسے' کی ایک نہ چلی۔ قبائلیوں کی بڑی تعداد دور دراز کے علاقوں سے اکٹھی ہو کر پشاور کے گرد و نواح میں جمع ہوگئی۔ شہزادہ شیر سنگھ نے 1830 میں پہلا حملہ کر کے جہادیوں کو عبرتناک شکست دی۔ اس پر بھی وہ واپس اپنے علاقوں کی طرف نہ لوٹے۔ چند ماہ بعد ایک جھڑپ میں یار محمد قتل ہو گیا اور اس کے بھائی کو شہر خالی کرنا پڑا۔ سید احمد فاتح کی حیثیت سے شہر میں داخل ہوا اور خود کو خلیفہ قرار دیا۔ مقامی ٹکسالی میں اس کے نام کے سکے ڈھالے گئے جن پر لکھا تھا 'انصاف کرنے والا احمد، جس کی شمشیر کی روشنی کفار کی تباہی کا باعث بنتی ہے'۔ کامیابی کا نشہ سید احمد کے سر پر سوار ہو گیا۔ چونکہ تمام ہندوستان، کشمیر اور سندھ سے مسلمان جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہونا شروع ہو گئے تھے اس نے خود کو مسلمانوں کا نجات دہندہ سمجھنا شروع کر دیا۔ دوسری جانب باہر کے لوگوں کی اتنی بڑی تعداد میں پشاور آمد سے قبائلی پریشان ہو گئے۔ ان بیرونی لوگوں کا سب سے بڑا تقاضا خوراک اور عورتیں۔ خاص طور پر عورتیں۔ پھر دربار کی روپے کی سفارت کاری نے اپنا اثر دکھانا شروع کر دیا قبائلیوں کی بڑی تعداد سید احمد کو چھوڑ گئی۔ بہت سے قبائلی تو ہندوستانیوں کے خلاف ہو گئے اور سفاکی سے ان کا قتل عام شروع کر دیا۔ سید احمد پشاور چھوڑنے پر مجبور ہو گیا اور شہزادہ شیر سنگھ نے ایک بار پھر شہر کا انتظام اپنے ہاتھوں میں لے لیا۔

سید احمد نے خود کو پنجابیوں اور جنگجو قبائلیوں کے درمیان پھنسا ہوا پایا۔ مئی 1831 کے اوائل میں شہزادہ شیر سنگھ نے سید احمد کو جو بالا کوٹ مانسہرہ کے قریب ایک مختصر سے دستے کی قیادت کر رہا تھا جا لیا اور وہیں اس کا اور اس کے ساتھیوں کا خاتمہ کر دیا۔ الیگزنڈر گارڈنر جو بعد میں پنجاب کی فوج میں کرنل مقرر ہوا اس وقت جہادیوں کے ہمراہ تھا وہ اس جھڑپ کا آنکھوں

دیکھا حال یوں بیان کرتا ہے:

''سید احمد اور مولوی (عبدالحئی) اپنے ہندوستانی پیروکاروں کے نرغے میں تھے اور سکھ فوج کے اکالی دستے سے گتھم گتھا تھے۔ سکھوں نے اچانک حملہ کر کے اس مختصر سے دستے کو مرکزی فوج سے علیحدہ کر دیا تھا اپنے لیڈر کے بغیر اس فوج کی کارکردگی خاصی شرمناک تھی۔ جب میری نظر سید احمد اور مولوی پر پڑی تو میں نے دیکھا کہ ایک سو سے زیادہ ہتھیار ان کے جسم سے آر پار تھے۔ ان کے آس پاس لوگوں کی کٹی ہوئی لاشیں پڑی تھیں۔ جب سید نیچے گرا تو میں اس سے چند سو گز کے فاصلے پر موجود تھا تاہم مجھے آسمان سے کوئی فرشتہ اترتا یا اس کے جسم کو جنت کی طرف لے جاتا نظر نہیں آیا جیسا کہ بعد میں سید کے پیروکاروں نے مشہور کر دیا تھا''6

شیر سنگھ نے اِس امر کے باوجود کہ سید احمد نے لاکھوں لوگوں کو سکھوں کے خلاف بھڑکایا اور ان کے عقیدے کو دوسروں کے عقیدوں کے خلاف نفرت سے پراگندہ کیا، اُس کی لاش کے ساتھ کسی قسم کے انتہا پسندانہ رویے کا مظاہرہ نہیں کیا۔ شیر سنگھ نے سید احمد کی لاش کو ایک قیمتی شال میں لپیٹا اور اس بہادر دشمن کو پورے اعزاز کے ساتھ دفن کیا7 جب رنجیت سنگھ تک شیر سنگھ کے اس رویے کی خبر پہنچی تو اس نے اِس عمل کی حمایت کی۔ سید احمد ایک اچھا مگر گمراہ انسان تھا۔

سید احمد کے ایک شاگرد نصیر الدین نے جہاد کو جاری رکھا مگر اسے اس میں کوئی خاص کامیابی نہ ہو سکی۔ تاہم سید احمد کی ہلاکت کے تھوڑے ہی عرصے بعد بارکزئیوں کے سردار دوست محمد نے کابل میں اقتدار کی باگ دوڑ سنبھالی اور اس مہم کو اپنے ہاتھ میں لے لیا۔ اپنے خاندان کے دوسرے افراد کی طرح وہ دوغلے پن کے فن میں خاصا طاق تھا۔ ایک وقت میں وہ رنجیت سنگھ کو اپنا 'آقا' بالکل باپ کی طرح' کہتا اور کسی اور وقت وہ اسے کافر کہہ کر اس کی مذمت کرتا اور اس کے قتل کو جائز ٹھہراتا۔

17

سندھ: سنہرے پیرہن کی سرزمین

سندھ میں انگریزوں کی دلچسپی کی وجہ ان کے تجارتی اور سیاسی مفادات تھے۔ دریائے سندھ کا گزر اسی سرزمین سے ہوتا تھا اور اپنی اشیائے تجارت کو شمالی ہندوستان کی مارکیٹ میں لانے کے لیے انگریزوں کو اس دریا کا دہانہ دریائے ہگلی (مغربی بنگال) کے دہانے کی نسبت قریب پڑتا تھا۔ سیاسی طور پر خطہ سندھ کی حیثیت ایسے سپرنگ بورڈ (تختہ مشق) کی تھی جہاں سے بلوچستان اور افغانستان پر حملہ آور ہوا جا سکتا تھا۔ سندھ کے امیروں کی باہمی چپقلش نے وہاں طاقت کا خلا پیدا کر دیا تھا اور انگریزوں کے خیال میں بیشتر اس کے کہ پنجابی اس طرف کا رخ کریں انھیں اس خلا کو بھر دینا چاہیے۔

1829 میں ایک نوجوان سیکنڈ لیفٹیننٹ الیگزنڈر برنز (جو بعد میں مہم جو اور سفارت کار کے طور پر مشہور ہوا) نے اس علاقے کے بارے میں معلومات اکٹھا کرنے کے لیے ادھر ایک عسکری مشن لے جانے کی کوشش کی۔ اس کے اپنے الفاظ میں اس کے کمانڈر انچیف سر تھامس بریڈ فورڈ نے اس کے اندر اس علاقے کو جاننے کا شوق پیدا کیا۔ برنز اور ایک دوسرے انگریز افسر نے سندھ میں دور دراز علاقے تک کا سفر کیا اور جیسلمیر تک گئے۔ دریائے سندھ میں ایک ساتھ کشتی پر سفر کرنا ان کے منصوبے میں شامل تھا مگر وہ ایسا کرنے سے اس لیے باز رہے کہیں سندھ کے حکمران ''امیر'' کسی شک میں نہ پڑ جائیں اور آگے چل کر ان کے ساتھ رابطے کے امکانات معدوم نہ ہو جائیں۔ چنانچہ اس بات کا فیصلہ کیا گیا کہ برنز دریا کے سفر پر نکلے اور اس کے لیے ایسا بہانہ بنایا جائے کہ سندھ کے امیر اسے انکار نہ کر سکیں۔ شاہِ برطانیہ نے مہاراجا رنجیت سنگھ کی بگھی کو کھینچنے کے لیے پانچ قد آور گھوڑوں کی ٹیم بھیجی۔ گورنر جنرل نے بادشاہ کے تحائف میں اپنی طرف سے ایک تحفے کا اضافہ کرنے کی منظوری چاہی۔ یہ تحفہ ایک خوبصورت اور بڑی بگھی کی صورت تھا اور اس بیش قیمت تحفے کو ہندوستان میں مناسب سڑکوں کے نہ ہونے کی وجہ سے دریا کے راستے ایک بہت بڑی کشتی میں ہی لانا ممکن تھا۔ برنز کو ان تحائف کا امین مقرر کیا گیا اور سندھ کے

''امیروں'' نے اسے راہداری پاس بھی عطا کیا جس کی رو سے وہ ان کے علاقوں سے (ہندوستان کی طرف) بے دھڑک سفر کر سکتا تھا۔

چند ناخوشگوار واقعات اور مشکلات سے نمٹنے کے بعد اس قافلے نے مارچ 1831 میں دریا کے راستے شمال کی جانب سفر کی ابتدا کی۔ برنز کے ساتھیوں میں ایک نیا رنگروٹ لیکی، ایک جائزہ کار اور ایک پارسی ڈاکٹر شامل تھے۔ کشتی میں ایسے آلات موجود تھے جن کی مدد سے دریائے سندھ میں سفر کرنے والی بڑی کشتیوں کے اعداد و شمار کا جائزہ لیا جا سکتا تھا۔ برنز کو یہ ہدایت بھی دی گئی تھی کہ وہ سندھ کے تمام معاملات کی مکمل چھان بین کرے۔ اسے بہت کچھ جاننے کی ذمہ داری دی گئی تھی: سندھ کی سیاست، اِس کے امیروں کی عسکری قوت اور دریائے سندھ کے پانیوں میں دیگر کشتیوں کی آمد پر ان کے خیالات۔ اُسے ان سب باتوں کی معاملات ایک ایسے بے ضرر پیغام رساں کے روپ میں کرنا تھیں جو محض ایک بادشاہ کی طرف سے دوسرے بادشاہ کے لیے تحائف لے کر جا رہا تھا اس کے راستے میں کسی قسم کی رکاوٹ مہاراجا رنجیت سنگھ کی خفگی کا باعث بن سکتی تھی۔

جلد ہی برنز نے سندھ کے امیروں کے ساتھ خوشگوار تعلق استوار کر لیے جبکہ اس کے عملے کے لوگ دریا کی گہرائی، وہاں چلنے والی ہوا کی تفصیلات اور دیگر نقشے تیار کرتے رہے۔ رنجیت سنگھ کو جب اس کی سرگرمیوں کی اطلاعات ملیں تو اسے انگریز سرکار کے نمائندے کی دریائے سندھ کے راستے پنجاب آنے کی اصل وجہ سمجھ میں آئی۔

لہنا سنگھ مجیٹھا کو برنز کا استقبال کرنے کے لیے بھیجا گیا کیونکہ وہ دربار میں واحد شخص تھا جسے سائنس کی تھوڑی شد بد تھی اور وہ ضرورت پڑنے پر برنز سے اس کے دورے اور اس دوران جمع کیے گئے ریکارڈ کے حوالے سے سوال بھی پوچھ سکتا تھا۔ برنز جس کی رائے میں مشرق میں بسنے والے کوڑھ دماغ ہوتے ہیں لہنا سنگھ کی علمِ ریاضی کے بارے میں معلومات پر بہت متاثر ہوا۔ وہ اس بات سے بھی بہت متاثر ہوا کہ لہنا سنگھ کو ستاروں کی گردش اور سائنسی آلات کے بارے میں بھی خاصا علم تھا۔ 7 جون 1831 کو برنز دربار کی حدود میں داخل ہوا تو اس کا شاہی سفر کی مانند استقبال کیا گیا، توپوں کی سلامی اور گارڈ آف آنر۔ لہنا سنگھ نے معزز مہمان کی شان میں باقاعدہ دربار لگایا اور اپنے آقا کی جانب سے استقبالیہ پیغام پڑھ کر سنایا گیا۔ پھر دیگر سرداروں کے ہمراہ اس نے 1400 روپے مالیت کا نذرانہ پیش کیا۔ باربرداری کے گھوڑوں کی بھی لگائی گئی اور لہنا سنگھ کی فرمائش پر ان میں سے ایک کا سُم علیحدہ کر کے مہاراجا کو بھجوایا گیا تاکہ اسے اندازہ ہو سکے کہ اس کی نذر کتنے بھاری بھرکم جانور کیے جانے والے ہیں۔ اس وفد کے ہمراہ ایک خبر نویس ہمہ وقت موجود تھا تاکہ مہمانوں کی روزانہ کی سرگرمیوں کی خبر مہاراجا کو بھجوا سکے۔

راستے میں پیش آنے والے ایک حادثے سے برنز کو اندازہ ہوا کہ وہ کتنی مضبوط اعصاب کی مالک بہادر قوم کے دیس

میں آیا ہے۔ اس کی سواری لے جانے والے قلیوں نے لاعلمی میں جھاڑیوں میں بیٹھے ایک شیر کو نیند سے جگا دیا جس نے غصے میں آکر ایک قلی پر حملہ کر دیا۔

"قافلے میں موجود ایک بہادر شخص نے اس عفریت کو فوری طور پر زخمی کر دیا اور بہت سے گھڑ سوار اپنی سواریوں سے اتر کر مقابلے کے لیے تیار ہو گئے۔ سکھوں نے ہاتھوں میں بھالے اٹھائے ہوئے تھے اور وہ پیدل ہی شیر کے شکار کو چل پڑے۔ وحشی درندے نے اپنے شکار کا کندھا علیحدہ کر دیا تھا اور وہ بیچارہ بہادری سے ضبط کیے ہوئے اپنا سر بار بار پٹخ رہا تھا۔ چونکہ ان دونوں کا آپس میں کوئی جوڑ نہ تھا زخمی قلی کٹا پٹا زمین پر جا گرا۔ اس کے ساتھی فوری طور پر اس کی مدد کو آئے اور ان کی ضربوں نے حملہ آور درندے کو ادھ موا کر دیا اور وہ بھی اپنے شکار کے قریب ہی زمین پر آن پڑا۔ یہ ایک بھاری بھرکم دس فٹ لمبا خونخوار درندہ تھا۔ اس کی ران ایک مکمل مرد کی ران جتنی بڑی تھی۔ سکھوں کی جوانمردی اور حوصلہ یقین اور بیان سے باہر ہے۔"1

دورانِ سفر برنز کو اس طرح کے کئی تجربات کا سامنا کرنا پڑا اور وہ اس نتیجے پر پہنچا کہ سکھ قوم ہندوستان میں بسنے والی دیگر اقوام میں بہادر ترین ہیں۔2

18 جولائی کو برنز لاہور کے قریب پہنچ گیا۔ شہر سے چار میل دور فقیر عزیز الدین اور راجا گلاب سنگھ نے برنز کا استقبال کیا اور اسے الرڈ کی رہائش گاہ پر رکنے اور رات گزارنے کی دعوت دی تاکہ وہ باقاعدہ استقبال اور اس کی رسومات کے لیے تازہ دم ہو جائے۔ یہاں بڑے طویل عرصے بعد برنز اور لیکی کو چھچ کانٹے اور شیمپین کے ہمراہ کھانا کھانے کو ملا وہ عام ہندوستانی کھانا جس کے آخر میں چائے یا کافی ملتی ہے کھا کھا کر بیزار ہو چکے تھے۔

اگلی صبح یہ قافلہ مہاراجا سے ملاقات کی خاطر نکل کھڑا ہوا۔ کیپٹن ویڈ سپاہیوں کے ہمراہ ان کے ساتھ جانے کے لیے لدھیانہ سے آچکا تھا۔ اس قافلے کی ترتیب کچھ اس طرح تھی سب سے آگے ایک بگھی اس کے پیچھے گھوڑے اور آخر میں ہاتھی جن پر مہمان سوار تھے۔ گلیوں میں دربار کے پیادہ دستے لوگوں کو راستے سے دور رکھنے کے لیے تعینات کیے گئے تھے۔ جونہی یہ قافلہ شہر کی گلیوں میں داخل ہوا توپوں سے گولے داغے جانے کی آواز سنائی دی جانے لگی۔ محل کے دروازے پر راجا دھیان سنگھ نے ان کا استقبال کیا اور اندر دربار کی طرف لے گیا۔

'ابھی میں دربار کی دہلیز پر رک کر اپنے جوتے اتار ہی رہا تھا کہ ایک پستہ قامت عمر رسیدہ منحنی سے شخص نے مجھے بازوؤں میں جکڑ لیا۔ عظیم راجا رنجیت سنگھ ہمارا استقبال کر رہا تھا3۔ لیکی کا بھی اسی گرمجوشی سے استقبال کیا گیا اور معزز مہمانوں کو عزت و احترام کے ساتھ ان کی نشستوں پر لے جایا گیا۔ اس کے بعد روایتی طور پر دونوں جانب سے ایک دوسرے کے مزاج پوچھے گئے۔ پھر بگھی اور گھوڑوں کو مہاراجا کی بارگاہ میں لایا گیا۔ برنز نے مہاراجا کی خدمت میں گورنر جنرل کی طرف سے شاہ انگلستان کا ایک خط پیش کیا۔ برنز لکھتا ہے: 'اس پر مہاراجا اور اس کے تمام درباری تعظیماً کھڑے ہو

گئے۔۔مہاراجانے خط کو اپنی پیشانی سے چھوا۔ پھر مہاراجا نے وہ خط فقیر عزیز الدین کے حوالے کیا۔ فقیر عزیز الدین نے فارسی میں لکھے گئے خط کو پڑھنا شروع کیا جس میں شاہِ انگلستان کی جانب سے مہاراجا کی خدمت میں اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کا تحفہ دینے کی بات کی گئی تھی اور دونوں قوموں میں دوستی کی بات کی گئی تھی۔ اس پر رنجیت سنگھ نے فقیر عزیز الدین کو ٹوکا اور کہا اتنے خوبصورت پیغام کی خوشی میں توپوں سے سلامی دی جانی چاہئے۔ ساٹھ توپوں میں سے ہر ایک سے 21 مرتبہ گولے داغے گئے اور جب بھی کسی توپ سے گولہ داغا جاتا اس کی گرج سے محل کی دیواریں اور شہر میں موجود رعایا کے مکانات لرز اُٹھتے۔ پھر مہاراجا اپنے تخت سے نیچے اترا تاکہ ان تحائف کا معائنہ کر سکے۔

''گھوڑوں کی جسامت، قد و قامت اور رنگ دیکھ کر مہاراجا دنگ رہ گیا: اس کے بقول یہ تو چھوٹے سائز کے ہاتھی معلوم پڑتے ہیں۔ اور جب یہ گھوڑے ایک ایک کر کے اس کے سامنے سے گزارے گئے تو مہاراجا نے درباریوں میں سے چند کو آواز دے کر بلایا اور پھر وہ مل کر اسپ بے مثال کی تعریف کرتے رہے۔''4

اس کے بعد رنجیت سنگھ نے مہمانوں کو اپنے اصطبل میں موجود اعلیٰ نسل کے گھوڑوں کا معائنہ کروایا۔ اس کے بعد تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مہاراجا مہمانوں سے دریائے سندھ کے حوالے سے سوالات پوچھتا رہا۔ کیا دریائے سندھ میں سفر کیا جا سکتا ہے؟ کنارے پر بسنے والے لوگوں کا رویہ کیسا ہے؟ وغیرہ وغیرہ

اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رنجیت سنگھ کو ان کے دریائی سفر کی اصل غرض و غایت معلوم تھی۔

انگریز مہمانوں کے استقبال کی تقریب نے رنجیت سنگھ کو تھکا دیا اور وہ کچھ دیر آرام کی خاطر محل کے اندر چلا گیا۔ برنز پر رنجیت سنگھ کا جو پہلا تاثر قائم ہوا اسے وہ یوں بیان کرتا ہے:

''فطرت نے رنجیت سنگھ کو جسمانی وجاہت عطا کرنے میں بخل سے کام لیا ہے اس کے دل و دماغ میں ہر وقت شدید کشمکش جاری رہتی ہوگی۔ اس کی صرف ایک آنکھ ہے چہرہ چیچک کے نشانوں سے اٹا ہوا ہے۔ اس کا قد پانچ فٹ تین انچ سے زیادہ نہیں۔ اگرچہ مہاراجا کسی قسم کی شان و شوکت والی زندگی سے قطعی طور پر بے نیاز ہے مگر دربار میں اسے جو مرتبہ حاصل ہے وہ دیکھنے کے لائق ہے، دربار کا ماحول کسی بھی ہندوستانی ریاست کے شاہزادے کے دربار کے مقابلے میں بازاری ہے پھر بھی کوئی شخص مہاراجا کو تعظیم بجالائے بغیر بات نہیں کرتا''5

اگلے روز برنز نے مہاراجا کے ساتھ مل کر دربار کی فوج کا معائنہ کیا دونوں نے اسی دوران کھلی فضا میں ناشتہ کیا۔ 25 جولائی کی شام مہاراجا نے برنز کے ساتھ اکیلے میں ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ ملاقات کی ابتدا ایک رسمی تقریب کے طور پر ہوئی۔ درباریوں کے تعارف اور بھرپور جسم کی مالک پنجابی رقاصاؤں کے رقص کے ساتھ (ان رقاصاؤں کے بارے میں رنجیت سنگھ کہتا تھا کہ یہ میری فوج کی ایسی ٹکڑی ہے جس پر میں آج تک قابو نہیں پا سکا)۔ پھر درباری اور رقاصاؤں کی چھٹی کرادی گئی اور رنجیت سنگھ اور برنز کے درمیان دوبدو ملاقات ہوئی۔ رنجیت سنگھ نے انگریزوں اور پنجابیوں کی

دوستی کے حوالے دیئے۔ اس نے مٹکاف اور اکٹرنلی کے ساتھ مختلف مواقع پر ہونے والے مذاکرات اور اپنے ذاتی تجربات کا بھی ذکر کیا۔ میں نے تو دوست ہونے کی حیثیت سے ہمیشہ اپنا فرض نبھایا۔ انگریز بتائیں ان کے سندھ میں کیا ارادے ہیں؟ رنجیت سنگھ کے مطابق وہ بھی اس علاقے میں دلچسپی رکھتا تھا۔ اس نے ایک میزبان ہونے کے ناتے نہایت شائستگی سے اپنا مدعا بیان کیا کہ وہ سندھ کو حاصل کرنے کے لیے کتنا بے چین تھا۔ اس کے نزدیک اس کی طاقت اس کے اتحادیوں میں نہیں بلکہ خالصہ فوج کی قوت میں چھپی ہوئی تھی۔ برنز کے الفاظ میں:

''اس نے بتایا کہ اس کی تمام کامیابیاں اس کی قوم کی بہادری کی مرہونِ منت ہیں، ایسی قوم جو ہر قسمی تعصب اور نفرت کے جذبے سے آزاد تھی، کسی مہم پر جاتے وقت کم از کم آٹھ روز کا راشن اپنی پیٹھ پر اٹھاتی، اگر پانی کی کمی ہو جاتی تو کنواں کھود لیتی اور اگر ضرورت پڑتی تو قلعے تعمیر کر کے دشمن کا مقابلہ کرتی'6

اتنا کہنے کے بعد رنجیت سنگھ نے درباریوں کو واپس بلوالیا رقاصاؤں نے رقص کرنا شروع کر دیا اور بوتلوں کے منہ کھل گئے۔ واپسی کے سفر سے قبل برنز کو مہاراجا کے قیمتی پتھر دکھائے گئے جن میں کوہِ نور ہیرا بھی موجود تھا۔ رنجیت سنگھ نے انگریز سرکار کے نمائندے کی انگلیوں میں دو انگوٹھیاں پہنائیں ان میں سے ایک انگوٹھی میں ہیرے جبکہ دوسری میں زمرد کے نگینے لگے ہوئے تھے مہاراجا نے ان دو انگوٹھیوں کے علاوہ بھی اسے موتیوں اور دیگر قیمتی پتھروں سے جڑے تحائف پیش کیے۔ برنز کو ایک اعلیٰ نسل کا گھوڑا اور خلعتِ فاخرہ بھی پیش کیے گئے۔ رنجیت سنگھ نے برطانیہ کے بادشاہ کے نام اپنے خط کو ایک ریشمی بٹوے میں بند کیا جس کے دھاگے پر دو قیمتی پتھر جڑے ہوئے تھے۔ اس خط میں جہاں دیگر بہت سی باتیں لکھی تھیں وہیں ان جوتوں کا بھی ذکر کیا گیا جو لہنا سنگھ نے برطانیہ کے تاجدار کو بھجوائے تھے۔

''ان جوتوں کو دیکھ کر نئے ماہ کا چاند بھی رشک سے پھیکا پڑ گیا اور جلد ہی نظروں سے اوجھل ہو گیا۔''

لاہور میں قیام کے دوران برنز نے رنجیت سنگھ کی عادات اور طور طریقوں کا بغور مشاہدہ کیا۔ 'رنجیت سنگھ ہر لحاظ سے ایک غیر معمولی کردار ہے۔ میری دربار کی فوج کے فرانسیسی افسروں سے بھی بات ہوئی ہے ان سب کا یہ کہنا تھا کہ قسطنطنیہ (موجودہ استنبول) سے ہندوستان تک رنجیت سنگھ کے پائے کا کوئی حکمران نہیں اور یہ کہ وہ سب (فرانسیسی سپاہی) طاقت کے مزے لے چکے تھے۔ رنجیت سنگھ کی شخصیت کا سب سے قابلِ تعریف پہلو اس کی انسان دوستی ہے۔ جب سے رنجیت سنگھ نے اقتدار سنبھالا ہے اُس کے دورِ حکومت میں آج تک کسی مجرم کو پھانسی کی سزا نہیں دی۔ ہشیاری اور مفاہمت کی پالیسی کو ساتھ ساتھ چلانا سفارتکاری کے میدان میں اس کے سب سے زیادہ موثر ہتھیار ہیں۔''7

برنز امرتسر بھی گیا اور گولڈن ٹیمپل میں حاضری بھی دی۔ وہاں سے وہ کپورتھلہ گیا اور فتح سنگھ اہلیا نوالہ کا مہمان بنا، کپورتھلہ سے فلہور اور وہاں سے دریا عبور کر کے برطانوی علاقے میں داخل ہو گیا۔ پنجاب میں سفر کے دوران جو چیز اس نے سب سے زیادہ محسوس کی وہ یہ کہ سکھوں کی تعداد اس ریاست میں بہت کم تھی۔ 'ایک ایسے ملک میں جس پر سکھوں کی حکومت

ہوان کی اتنی کم تعداد بہت تعجب کی بات ہے۔ اس قبیلے (قوم) کا اصل وطن راوی اور ستلج کے درمیان موجود دوآبہ ہے، مگر لاہور سے تیس میل پرے آپ کو بہت کم سکھ دکھائی دیں گے۔ جہلم کے مغرب میں تو ایک سکھ بھی نہیں ملے گا اور لاہور کے مشرق میں جہاں ان کی کثرت بتائی جاتی ہے آبادی میں ان کا تناسب ایک تہائی سے زیادہ نہیں۔' دراصل برنز یہ بات سمجھ نہیں پایا کہ رنجیت سنگھ سکھوں کا نہیں پنجابیوں کا حکمران ہے اور اس کی سلطنت میں تمام پنجابی شامل ہیں جن میں ہندو بھی ہیں، مسلمان اور سکھ بھی۔

برنز نے ہندوستان کے نئے گورنر جنرل، لارڈ ولیم بنٹنک، کو یہ رپورٹ بھیجی کہ دریائے سندھ کا راستہ امکانات سے بھرا ہوا ہے اور یہ کہ سندھ کے امیر رنجیت سنگھ کے خوف کا شکار ہیں اور اگر انھیں اس بات کی ضمانت دی جائے کہ پنجاب کی سمت سے ہونے والے کسی بھی حملے سے انھیں تحفظ فراہم کیا جائے گا تو وہ بخوشی انگریزوں کو سندھ سے گزرنے کے حقوق دینے پر رضامند ہو جائیں گے۔

1831 کے اوائل میں رنجیت سنگھ نے ایک وفد جس میں فقیر عزیز الدین، موتی رام اور ہری سنگھ نلوا شامل تھے ہندوستان کے نئے گورنر جنرل لارڈ ولیم بنٹنک کے استقبال کے لیے شملہ بھیجا۔ گورنر جنرل کا شمالی ہندوستان کا یہ پہلا دورہ تھا۔ وفد کے ارکان خصوصاً فقیر عزیز الدین نے اپنے انگریز میزبانوں پر بہت اچھا تاثر قائم کیا8۔ ایک طرف فقیر عزیز الدین چکنے چپڑے الفاظ کا استعمال کر رہا تھا: ''محبت کی بلبلیں دوستی کی چراگاہوں میں چہچہاتی ہیں اور لگاوٹ کے دریا ایثار و قربانی کے سمندروں سے جا ملتے ہیں۔'' تو دوسری طرف لارڈ بنٹنک مطلب کی بات اور انگریزوں کے مفاد کو سامنے رکھ کر بات کرنا چاہ رہا تھا۔ برنز کی رپورٹ نے اس کی بھوک میں اضافہ کر دیا تھی۔ مسئلہ یہ تھا کہ رنجیت سنگھ کو سندھ پر قبضے کے منصوبے سے کیسے روکا جائے اور اسے اس بات پر کیسے آمادہ کیا جائے کہ برطانوی جہازوں کو اپنے علاقے کے چھ دریاؤں سے گزرنے دے اور یہ کہ ایسا کرنا اس کے اپنے مفاد میں تھا۔ بنٹنک اس معاملے کو ذاتی حیثیت میں حل کرنا چاہتا تھا۔ اس نے کیپٹن ویڈ کو ہدایت دی کہ وہ خود لاہور جائے اور مہاراجا کو تجویز دے کہ اپنا وفد بھیجنے اور جواباً انگریزوں کے وفد کا استقبال کرنے کی بجائے کیا یہ مناسب نہ ہوگا کہ گورنر جنرل خود اس کے پاس چل کر آئے: بس اس کے لیے مہاراجا کو ایک دعوت نامہ گورنر جنرل کو ارسال کرنا ہوگا (تاکہ لوگ یہ سمجھیں کہ مہاراجا نئے گورنر جنرل سے ملنے کے لیے بے تاب ہے نا کہ گورنر جنرل مہاراجا سے)۔ دربار کو یہ تجویز پسند نہ آئی کہ مہاراجا ایک گورنر جنرل کی حیثیت کے عہدیدار سے خود جا کر ملے9۔ تاہم رنجیت سنگھ نے تمام پروٹوکول ایک طرف رکھتے ہوئے لارڈ بنٹنک سے اس کی شرائط پر ملاقات کی حامی بھر لی۔ گورنر جنرل کے نام اپنے خط میں اس نے لکھا کہ وہ ہمیشہ سے ہی دوستی کی ننھی کونپل کو پانی دیتا چلا آ رہا ہے اور اس پودے کو گھنے پتوں والے میٹھے پھلدار درخت میں تبدیل ہوتے دیکھنا چاہتا ہے ایک ایسا درخت جس کی چھاؤں اور پھل سے دونوں فریق فائدہ اٹھائیں۔'' دوستی کے چمن کے پھول باہمی تعلق اور نیک خواہشات سے ہمیشہ تر و تازہ رہیں'' طے یہ پایا کہ 26 اکتوبر 1831 کو مہاراجا اور

گورنر جنرل کے درمیان روپڑ کے مقام پر ملاقات ہوگی۔ بہت سے لوگوں کے نزدیک روپڑ پنجاب کے سنہرے پیرہن (لباس) کا عکس ہے۔10

اس ملاقات کے لیے خصوصی اہتمام کیا گیا تھا دریا کے کنارے ایک بہت بڑا پارک بنایا گیا۔اس پہاڑی پر جہاں سے آس پاس کے علاقے کو آسانی سے دیکھا جا سکتا تھا ہندوؤں کے مندر کی طرز پر ایک سنہری پلیٹ فارم تعمیر کیا گیا۔قریب ہی گورنر جنرل کے گہرے سرخ رنگ کے خیمے ایستادہ کیے گئے اور خیموں کے دروازوں پر زرد ریشم اور ساٹن کے کپڑے سے بنے چھجے لگائے گئے تھے۔اس احاطے کے آس پاس کے میدانوں کو پرندوں، گھوڑوں اور دوسرے جانوروں کی شکل دی گئی تھی اور ان میدانوں میں ہل چلوا کر گندم اُگا دی گئی۔

مہاراجا 16 ہزار گھڑ سواروں کے ہمراہ 25 اکتوبر کو روپڑ کے مقام پر پہنچا اگلے روز گورنر جنرل ایک ہزار سواروں کے ہمراہ جنھوں نے مکمل فوجی وردیاں پہنی تھیں۔خود گورنر جنرل ایک ہاتھی پر سوار تھا جو سڑک کے دونوں اطراف قطار بنائے برطانوی فوج کے سپاہیوں کے درمیان سے گزرتا ہوا آگے بڑھتا جا رہا تھا۔گورنر جنرل کے وفد میں شامل لوگ جو پہلے سے وہاں موجود تھے آگے بڑھے اور اس کا استقبال کیا۔بنٹنک رنجیت سنگھ کے ساتھ بغلگیر ہوا اور اسے اپنے ساتھ اندر خیمے میں لے گیا۔سکنز اس ملاقات کا احوال کچھ یوں دیتا ہے:'ایک دوسرے کی صحت کے بابت دریافت کرنے کے بعد مختلف تحائف کی دوسو طشتریاں جن میں ریشم، دونالی والی بندوقیں اور پستولیں شامل تھیں مہاراجا کی خدمت میں پیش کی گئیں۔اس موقع پر اعلیٰ نسلی گھوڑوں اور دو ہاتھیوں کی نمائش بھی کی گئی یہ سب مہاراجا کے لیے لائے گئے تھے۔ملاقات کسی سنجیدہ معاملے کو زیرِ بحث لائے بغیر تقریباً ایک گھنٹے تک جاری رہی۔چونکہ بنٹنک کو پنجابی نہیں آتی تھی اور درباریوں میں سے کوئی بھی انگریزی نہیں بول سکتا تھا فقیر عزیز الدین اور کیپٹن ویڈ نے مترجم کے فرائض انجام دیئے'یہ دونوں (مترجم) دوستی کے ایوان میں شمع کی صورت اور اتحاد و اتفاق کے چمن میں خوشبودار پھول کی صورت اپنے فرائض انجام دے رہے تھے'11۔ملاقات کا اختتام رقاصاؤں کے فنی مظاہرے سے ہوا۔ان رقاصاؤں کو انگریز اپنے ساتھ لے کر آئے تھے۔گورنر جنرل کے وفد میں شامل انگریز رقاصاؤں نے بھی اپنے لوک رقص کا مظاہرہ کیا جو سکھ سرداروں کو بہت بھلا لگا۔سوہن لال کے الفاظ میں:'بداعتمادی کا ریگستان دیکھتے ہی دیکھتے نیک تمناؤں کے نخلستان میں تبدیل ہو گیا اور لوگوں کے دل سے فکر مندی اور پریشانی کا زنگ اتر گیا'۔

اگلی صبح بنٹنک نے جس کے ہمراہی شہزادہ کھڑک سنگھ کر رہا تھا رنجیت سنگھ کے خیمے کا جوابی دورہ کیا۔مہاراجا گورنر جنرل کا استقبال کرنے کے لیے دریا کے کنارے پر موجود تھا وہ دونوں ایک ہی ہاتھی پر سوار ہوئے۔اس شاہی سواری کے پیچھے ایک میل دور تک خالصہ فوج کے پیدل دستے اور گھڑ سوار مارچ کرتے جا رہے تھے۔گورنر جنرل کو اوپر بلند مقام پر لے جایا گیا12۔چبوترے کے اطراف میں موجود قرمزی خیموں پر مخملی پردے جن پر سونے کی تاروں کا کام ہوا تھا لٹکائے گئے تھے۔

فرش پر ایران، کشمیر اور پنجاب کے بہترین قالین بچھائے گئے تھے۔ دربار لگتے ہی معزز مہمان کو پنجابی توپخانے نے 21 توپوں کی سلامی دے کر خوش آمدید کہا۔ رنجیت سنگھ نے اپنے 300 بہترین خوش لباس، اعزاز یافتہ اور ہتھیار بند فوجی جوانوں اور سرداروں کا گورنر جنرل سے تعارف کرایا۔ بنٹنک نے کمپنی کے افسروں کا تعارف کرایا۔ جب دونوں طرف کے لوگ نشستوں پر بیٹھ گئے تو مہاراجا نے کشمیری رقاصاؤں کو بلوایا۔ ''ایک سو خوش لباس، خوش شکل رقاصائیں خیمے میں داخل ہوئیں انھوں نے دیدہ زیب زیور پہنا ہوا تھا۔''

یہ رقاصائیں سلام عرض کرنے کے بعد بیٹھ گئیں؛ ان میں سے کچھ کے ہاتھوں میں تیر تھے کچھ کے ہاتھوں میں کمان۔ جبکہ ان کی سربراہ نے ہاتھ میں چھڑی اٹھائی ہوئی تھی۔ ان سب نے سروں پر زرد پگڑیاں باندھی تھیں جو ایک طرف جھکی ہونے کے باعث ان پر بہت جچ رہی تھیں۔ کچھ دیر گیت گانے کے بعد وہ رخصت ہوئیں، اور پھر مہاراجا نے گورنر جنرل کی نذر تحائف پیش کرنا شروع کر دیے۔ ایک سو طشتریوں پر پنجاب کی تمام بہترین چیزیں (دو اعلیٰ نسل کے گھوڑوں اور ایک ہاتھی کے علاوہ)۔ رنجیت سنگھ نے گورنر جنرل بنٹنک کو بڑے بڑے موتیوں کی ایک مالا بھی پہنائی۔

رسمی ملاقاتوں کے بعد فوجی دستوں، پریڈ اور دیگر فوجی مشقوں کا معائنہ کیا گیا۔ رنجیت سنگھ کو یہ سب کرنا بہت پسند تھا۔ اس نے برطانوی فوج کے جنگی سامان کا بغور معائنہ لیا اور اس بارے میں بہت سے سوال پوچھے۔ اس نے کمپنی کے دستوں کو وہ مشقیں دہرانے کو کہا جن سے وہ زیادہ واقف نہیں تھا خاص طور پر چار اطراف میں برابر تعداد میں پوزیشن سنبھالنا جو کہ صرف کمپنی کے دستوں کا امتیاز تھا۔ اس بارے میں رنجیت سنگھ کا کہنا تھا 'یہ تو لوہے کی دیوار معلوم پڑتی ہے!' وہ اس مظاہرے سے اتنا خوش ہوا کہ اس نے برطانوی سپاہیوں کو گیارہ ہزار روپے انعام دیا۔ سکنر رنجیت سنگھ کے عسکری معاملات کے علم سے متعلق بہت متاثر نظر آتا تھا۔ ''(جنگی معاملات کے بارے میں علم کے حوالے سے) رنجیت سنگھ ہر شعبے میں کسی بھی دوسرے مقامی سپاہی سے کہیں آگے تھا۔ یوں محسوس ہوتا تھا گویا اس کے پاس فیلڈ مارشل کی ذہانت ہے اور وہ میدان میں (کمپنی کے) دستوں کا معائنہ کرتے ہوئے یوں پھر رہا تھا گویا وہی ان کا کمانڈر ہو''۔13

سکنر پنجابی دستوں کے مظاہرے سے بھی بہت متاثر ہوا اس نے دیگر برطانوی افسروں کے ہمراہ سنہرے چبوترے پر کھڑے ہو کر انھیں پریڈ کرتے ہوئے دیکھا۔ ''اتنا عظیم الشان نظارہ جب سے میں نے فوج کی نوکری چھوڑی ہے کبھی نہیں دیکھا''۔ الرڈ کے گھڑ سوار البتہ اسے کچھ خاص متاثر نہ کر سکے۔ ''فرانسیسی نیزہ بازوں میں نظم و ضبط کی کمی دیکھنے کو ملی، ان کے گھوڑے بھی ادنیٰ نسل کے تھے اور وہ ٹھیک طرح سے ہتھیار بند بھی نہیں تھے''۔

رنجیت سنگھ ہمیشہ سے توپخانے میں خاص دلچسپی لیتا آیا تھا۔ اس کی خصوصی فرمائش پر کمپنی کے توپخانے کو متحرک کیا گیا۔ رنجیت سنگھ نے توپخانے سے فائر ہوتے سنے اور دیکھا کہ کس طرح کمپنی بہادر کی توپیں نشانے پر ٹھیک ٹھیک گولے برساتی ہیں۔ سکنر لکھتا ہے 'رنجیت سنگھ کے شوق کی کوئی انتہا نہیں تھی۔ انگریز توپچیوں کے نشانے کا مزید امتحان لینے کی خاطر اس نے

گورنر جنرل لارڈ ولیم سے درخواست کی کہ نشانے والے مقام سے تقریباً ایک ہزار گز کے فاصلے پر ایک چھتری کھڑی کی جائے اور ان نشانچیوں سے کہا جائے کہ اُس پر گولیاں داغیں۔ شروع کے دو یا تین فائر اس چھتری کو نہ گرا سکے تو رنجیت سنگھ خود اس ٹیلے پر سے نیچے اترا اور بندوق پکڑ کر نشانہ باندھا تاہم نہ تو مہاراجا اور نہ ہی اس کی فوج کے بہترین نشانہ باز اس چھتری کو گرانے میں کامیاب ہو سکے۔ ان کے بعد توپخانے کا ہی کیپٹن کیمپ بیل آیا اور شست باندھ کر گولی چلائی جس نے چھتری کے پرخچے اڑا دیئے اور سکھوں کی طرف سے داد و تحسین کے نعرے بلند ہوئے' رنجیت سنگھ نے اپنے اور کمپنی بہادر کے گھڑ سواروں کے درمیان بوتل ہوا میں اچھال کر اس کا نشانہ بنانے اور پیتل کے ایک برتن کو کرپان سے دو ٹکڑے کرنے کا مقابلہ کرایا۔ سکنر کے مطابق کمپنی کے جوان پنجابی سپاہیوں کی برابر کی ٹکر ثابت ہوئے اور رنجیت سنگھ اور اس کے سپاہی پیتل کے برتن کو دو حصوں میں کاٹنے میں ناکام ہو گئے (سوہن لال کے مطابق صرف رنجیت سنگھ ہی پیتل کے برتن کو دو ٹکڑوں میں تقسیم کر سکا اور یہ کہ پنجابی جوانوں نے انگریز لشکر کے سپاہیوں کو ہر امتحان میں مکمل طور پر پیچھے چھوڑ دیا)۔

شام کے وقت رنجیت سنگھ نے لارڈ بنٹنک اور اس کی اہلیہ کے اعزاز میں کھانا دیا۔ اس موقع پر شاہی خیمے کی خاص طور پر سجاوٹ کی گئی، سونے کی تاروں کی بنی جھالر سے مزین ایک بڑا سا قالین شاہی خیمے کے فرش پر بچھایا گیا۔ اسی خیمے میں سونے کے پانی یا سونے کی تاروں سے سجا ایک تخت بچھایا گیا جس کے اطراف میں بیش قیمت تپائیاں رکھی گئی تھیں ان تپائیوں پر مہمانوں کی خاطر ہیرے، جواہرات اور موتی ٹنگے تھے۔ سکنر کے مطابق 'اس خیمے کا اندرون شاندار طریقے سے سجایا گیا تھا اور صرف اس تخت کو دیکھ لینے سے ہی ہندوستان کی شاندار روایات اور فراخدلی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا'۔ ایک طرف باہر آتش بازی کا عظیم الشان مظاہرہ جاری تھا جبکہ دوسری طرف خیمے کے اندر رقاصائیں اپنے جلوے بکھیر رہی تھیں۔ موسیقی، شراب اور رقص و سرور کی محفل۔ وہاں سبھی کچھ تو موجود تھا!

"رنجیت سنگھ کی خوشی دیدنی تھی اور وہ اپنے معزز مہمانوں لارڈ اور لیڈی بنٹنک کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہیں چھوڑ رہا تھا۔ خیمے میں موجود مہمانوں کی تواضع سنہرے پیالوں میں شراب تقسیم کر کے کی گئی خود رنجیت سنگھ شراب کے نشے میں مدہوش ہوا جا رہا تھا۔ اسی مدہوشی کی کیفیت میں اس کے سامنے سنہرے سفوف سے بھرا تھال رکھا گیا جو مہاراجا نے رقاصاؤں کے حوالے کیا اور انھیں حکم دیا کہ اسے مہمانوں کے سروں پر نچھاور کر دیں، یہ ہندوستان کے مشہور ہولی میلے کی نقل میں کیا گیا اور وہاں بیٹھے مہمان اس شرارت سے بہت محظوظ ہوئے۔ رنجیت سنگھ نے اپنے قریب بیٹھے مہمانوں کو بھی نہیں بخشا اور رقاصاؤں پر بھی وہی سفوف اچھالا۔

رنجیت سنگھ اسی بے فکری کی حالت میں تھا کہ لارڈ بنٹنک اور ویڈ نے کام کی بات کا آغاز کیا یعنی انگریزوں کی طرف سے پنجاب کے دریاؤں پر تجارتی سفر کی خواہش کا اظہار۔ جس انداز سے انھوں نے رنجیت سنگھ کے سامنے اپنا مقدمہ پیش کیا اس سے تو یوں لگ رہا تھا کہ یہ ایک بہت ہی کامیاب کاروبار ثابت ہو سکتا تھا۔

رنجیت سنگھ نے انگریزوں کی سندھ میں بڑھتی ہوئی دلچسپی پر اپنے خدشات کا اظہار کیا۔ اس نے کمپنی بہادر کے نمائندے سے نہایت ہی ذہانت اور ہشیاری سے دریافت کیا' کیا آپ اپنی سرحدوں کو سندھ تک توسیع دینے جارہے ہیں؟' ویڈ کا جواب نہایت واضح تھا: ''ہرگز نہیں ہمارا مقصد تو صرف تجارت کا فروغ ہے اور اسے تجارتی نقطہ نظر سے اسے مفید پا کر ہی سندھ کے امیروں سے اس کی اجازت لی ہے''۔ اگر ایسا ہے تو پھر بہاولپور کے نواب اور سندھیانہ کے لوگوں نے جو میرے اقتدارِ اعلیٰ کو تسلیم کیا ہوا ہے اس کا کیا ہوگا، رنجیت سنگھ نے دریافت کیا۔ بننک نے پہلے تو کوئی جواب نہیں دیا لیکن اس نے یہ بات واضح کی کہ وقت آگیا تھا کہ دربار جنوب میں موجود اپنی سرحدی حد بندی کو حتمی شکل دے۔ ایک ہفتے تک اپنے مہمانوں کی بھرپور انداز میں خدمت کرنے کے بعد جو کچھ رنجیت سنگھ کے ہاتھ لگا وہ ان کی طرف سے مستقبل بنیادوں پر دوستی کی یقین دہانی تھا۔

دوسری جانب عوام مہاراجا کو ہر وقت انگریزوں کی دوستی کا دم بھرتے دیکھ کر بیزار ہو چکے تھے اور درباریوں میں کئی ایسے تھے جو اس رویے کو تنقید کا نشانہ بنا چکے تھے۔ اکالی تو کھلم کھلا اس کی مخالفت کررہے تھے۔ سوہن لال مہاراجا اور لارڈ بننک کے درمیان ملاقات کے کچھ ہی عرصہ بعد ہونے والے ایک واقعے کا ذکر کرتا ہے: ''ایک بدقسمت گمراہ اکالی جس کی فطرت میں بدی شامل تھی اپنی نیام سے تلوار نکال کر مہاراجا کی طرف دوڑا مگر دربار میں موجود سپاہیوں اور دیگر ریاستی اہلکاروں نے اسے پکڑ لیا اور مہاراجا کے روبرو لے آئے''14

جلد ہی مہاراجا پر انگریزوں سے دوستی کے جوش و ولولے کی جگہ مایوسی کا احساس حاوی ہو گیا۔ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کی طرف کھلے دل سے جیسا کہ پنجابیوں کی عادت ہے دوستی کا ہاتھ بڑھایا تھا لیکن جب بھی وہ ان سے بغلگیر ہوا انگریز اُس کی جیب سے ہر وہ چیز نکال کر جو اسے سب سے زیادہ عزیز تھی چلتے بنے اور جاتے جاتے دوستی اور نیک خواہشات کا پیغام دینا نہ بھولے۔

روپڑ میں ہونے والی ملاقات کے چند ماہ بعد رنجیت سنگھ نے ایک یورپی مبلغ ڈاکٹر جوزف ولف جس نے یہودیت چھوڑ کر عیسائیت کا مذہب اختیار کیا تھا کو اس ملاقات کا احوال دیا۔ ڈاکٹر نے 'رندجند سنگھ کے بارے میں سنا ہوا تھا جس کا نام بخارا میں دہشت کی علامت بنا ہوا تھا'۔ اس ملاقات میں رنجیت سنگھ کے ساتھ ہونے والی گفتگو کو ڈاکٹر جوزف نے ریکارڈ کر لیا۔ رنجیت سنگھ کو بتایا گیا کہ ڈاکٹر جوزف دریائے سندھ پار کرنے کے بعد بہت گھبرایا ہوا تھا اور یہ کہ اپنے خطبوں میں وہ پنجاب کے 'بے دین' لوگوں کو یہ بتاتا ہے کہ مذہب سے منسلک لوگوں کو موت کا کوئی خوف نہیں ہوتا۔

''کیا تم یہ تعلیم دیتے ہو کہ لوگوں کو موت کا خوف نہیں ہونا چاہئے؟'' مہاراجا نے اس سے دریافت کیا۔

''جی ہاں''

''کیا تم یہ بھی کہتے ہو کہ ہمیں صرف اس پر بھروسا کرنا چاہئے جو سب کو رزق دیتا ہے؟''

''جی''

''پھر تم دریائے سندھ پر موجود لکڑی کے پُل کو اپنے ہاتھی کے قدموں تلے چرچراتے سن کر گھبرا کیوں جاتے تھے؟'' (ڈاکٹر ولف اس پل کے ڈولنے پر خوف سے چیخیں مارتا تھا)۔

''حضور والا نے مجھے لاجواب کر دیا ہے؛ اور اب میرے پاس صرف یہ جواب رہ گیا ہے کہ مجھ جیسے کمزور شخص کو خدا سے عبادت کرتے رہنے کی ضرورت محسوس ہوتی ہے تاکہ وہ طاقتور خدا مجھ کمزور کی بھی سنے''۔

''میرے خیال میں تم ایک صاف گو اور کھرے شخص ہو' رنجیت سنگھ نے کہا' لیکن میری ایک اور بات کا جواب دو؛ تم نے کہا ہے کہ تم مذہب کی تبلیغ کی خاطر حالتِ سفر میں رہتے ہو تو پھر تم ہندوستان کے انگریزوں کو تبلیغ کیوں نہیں کرتے جن کا کوئی مذہب نہیں؟''16

ڈاکٹر نے گفتگو کا رخ موڑنے کے لیے دربار میں موجود لوگوں سے دریافت کیا' کوئی شخص خدا کی قربت کا شرف کیسے پا سکتا ہے؟'

رنجیت سنگھ نے اس سوال کا جواب زہر خند لہجے میں یوں دیا:' کوئی بھی شخص خدا کی قربت کا شرف انگریز سرکار کا اتحادی بن کر پا سکتا ہے جیسا کہ حال ہی میں نے لارڈ نواب صاحب سے روپڑ میں ملاقات کرنے کے بعد پایا ہے۔'17

روپڑ کی ملاقات کے چند ماہ بعد ہی الیگزنڈر برنز کو دریائے سندھ کے آس پاس کی زمینوں کی چھان بین کے لیے بھیجا گیا۔ اس مرتبہ اسے قبائلی علاقوں اور افغانستان کے علاقوں کی چھان بین کرنا تھی۔ دربار کو اس حوالے سے کوئی شک نہ ہو اسلئے اس نے تمام سرکاری عہدے اور مراعات چھوڑ کر یوں ظاہر کیا گویا وہ خشکی کے راستے برطانیہ جا رہا ہے اور اس مقصد کے لئے رنجیت سنگھ سے پنجاب کی سرزمین سے گزرنے کی اجازت چاہی برنز نے اپنے خط میں لکھا:' 'اگر حضور مجھے اجازت مرحمت فرمادیں تو مجھے ایک ایسے عظیم شہزادے کے ساتھ تجدید دوستی کا موقع ملے گا جس کی عظمت اور بڑائی کی یادیں آج بھی میرے دل میں تر و تازہ ہیں اور میرے لیے نہایت مسرت و انبساط کا سامان ہیں''۔ اس دوسری مہم میں برنز کے ہمراہ ایک ماہر ارضیات ڈاکٹر جیمز جیرارڈ بھی تھا۔ برنز کے عملے میں ایک نوجوان کشمیری موہن لال بھی جو اس کے ترجمان کے فرائض انجام دے رہا تھا شامل تھا۔ پنجاب میں ان کا استقبال شام سنگھ اٹاریوالہ نے کیا اور چار سو سکھ گھڑ سواروں کا دستہ ان کے ہمراہ سفر پر روانہ ہوا۔18

برنز اور رنجیت سنگھ کی ملاقات لاہور سے دو میل دور ایک باغ میں ہوئی۔ برنز نے رنجیت سنگھ کی خدمت میں ایک پستول پیش کیا۔' وہ خاصا ہشاش بشاش دکھائی دے رہا تھا اور اس نے ہم سے دو گھنٹے تک بات چیت کی۔ اس کی بات چیت میں انتہائی سنجیدہ موضوعات کے ساتھ ساتھ ہلکی پھلکی نہایت معمولی باتیں بھی شامل تھیں' برنز نے لاہور میں ایک ماہ گزارا اور اس عرصہ میں اسے رنجیت سنگھ کو کئی مواقع پر قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ شکار کے دوران بھی رنجیت سنگھ کے ہمراہ تھا۔ موسم

بہار کی آمد پر منائے جانے والے بسنت کے میلے میں شرکت کے دوران بھی وہ مہاراجا کے ہمراہ تھا۔ ان دونوں مواقع کی کئی خوبصورت یادیں برنز کے ذہن میں عرصہ تک تروتازہ پھولوں کی طرح مہکتی رہیں۔

شکار دریائے راوی کے اُس پار تھا۔' شکار پارٹی کا نظارہ نہایت ہی جاذب نظر ہوتا۔ خدام کی فوج سے صاف معلوم پڑتا تھا کہ بادشاہ خود ایک سپاہی کی مانند شکار کھیلنے آیا ہے۔ اس کے سامنے گھوڑے لائے گئے مگر سفر کا زیادہ تر حصہ ہاتھیوں پر بیٹھ کر گزرا۔ ان ہاتھیوں میں سے دو پر سنہری خیمہ نما نشستیں بنی تھیں۔ ایک پر مہاراجا خود جلوہ افروز تھا (جبکہ دوسری پر گرنتھ صاحب سوار تھی جو کہ رنجیت سنگھ کے سفر کا لازمی حصہ تھی)۔ چھ یا سات ہاتھی جن پر رنجیت سنگھ کے درباری اور پسندیدہ افراد سوار ان ہاتھیوں کے پیچھے چلے آرہے تھے۔ گھڑسواروں کی ایک ٹکڑی اور پیدل سپاہیوں کا دستہ مہاراجا کے ہمراہ تھا؛ گورنر جنرل کی طرف سے دیے دیا جانے والے چھکڑے جسے گھوڑوں کی ایک قطار کھینچ رہی ہوتی کے بغیر شکاری پارٹی نامکمل تھی۔'19

سفر کے دوران مہاراجا برنز سے تابڑتوڑ سوال پوچھتا رہا۔ روہیلا لیڈر عامر خان کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے؟ انگریز اس کے ساتھ کیا سلوک کریں گے؟ انگریز اپنی فوج میں نظم وضبط کیسے برقرار رکھتے ہیں؟ برنز لکھتا ہے' تاہم یہ ساری گفتگو رنجیت سنگھ کے پسندیدہ موضوع شراب کے بغیر ادھوری تھی۔ ہاتھی پر بیٹھے ہوئے اس نے اپنے خیمے کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ وہ نظارہ پینے پلانے کے لیے نہایت ہی موزوں اور مناسب ہے کیونکہ وہاں بیٹھ کر آس پاس کے خوبصورت دیہاتوں کو صاف دیکھا جا سکتا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اپنے ہمراہ سفر کرنے والے ڈاکٹروں سے پوچھا کہ شراب کھانے سے پہلے پینی چاہئے یا کھانے کے بعد: اور میرے اس جواب پر کہ '' دونوں اوقات میں'' مہاراجا دل کھول کر ہنسا۔20

اگلے روز صبح سویرے شکار کا باقاعدہ آغاز ہوا' رنجیت سنگھ اپنے پسندیدہ شکاری گھوڑے پر سوار ہوا۔ اس کی سواری پر ایک شاندار زین لگی تھی جس کے کناروں پر کشیدہ کاری کی گئی تھی۔ جس کپڑے نے زین کو ڈھانپا ہوا تھا اس پر ہر اس پرندے اور جانور کی تصویر بنی تھی جسے شکاری اپنا دوست بتلاتا ہے۔ مہاراجا نے سبز رنگ کا کوٹ جو قیمتی کپڑے کا بنا تھا زیب تن کیا ہوا تھا؛ اس کے خنجر پر نہایت ہی قیمتی چمکدار پتھر لگے تھے۔ اس کے علاوہ کابل کے بادشاہ کی طرف سے دی گئی ایک ہلکے وزن کی ڈھال بھی تھی۔ جنگ یا شکار کے دوران یہ سب چیزیں رنجیت سنگھ کے لباس کا لازمی حصہ ہوتیں۔ شکار پارٹی کے بالکل سامنے مختلف نسل کے شکاری کتوں کی قطار موجود تھی۔ ان میں سندھی نسل کا کتا بھی موجود تھا، بخارا، ایرانی یا پنجابی نسل کے کتے بھی ان شکاری کتوں کے گروہ میں شامل تھے۔ ان کے پیچھے شاہی سواری کو اٹھائے ہاتھی چلے جا رہے تھے۔ شکار پارٹی کے ہمراہ عقابوں کو ہاتھوں میں اٹھائے سپاہی بھی گھوڑوں پر سوار شکاری پارٹی کے ہمراہ تھے۔ قریبی میدان سے بہت سے سؤروں کو مار مار کر گھاس سے باہر نکالا گیا۔ سکھوں کی تلواریں دھوپ میں چمک رہی تھیں اور آدھ گھنٹے کے اندر بہت سے سؤر زمین پر مردہ پڑے تھے جبکہ کئی ایسے تھے جو قریب ہی لگے پھندوں میں پھنسے ہوئے تھے اور باہر نکلنے کے لیے ہاتھ پاؤں مار رہے تھے۔ گھڑسواروں نے اپنی تلواروں سے بہت سے سؤروں کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا۔''

شکاری کتوں کی خوراک بننے کے لیے بہت سے زندہ سؤر خیموں میں لائے گئے۔ شکار پارٹی شکاری کتوں اور سوروں کے درمیان مقابلے کا مزہ لیتی رہی اور جب کتوں کے پیٹ بھر گئے تو باقی ماندہ سؤروں کو جنگل میں چھوڑ دیا گیا۔

شام کے وقت یہ تھکے ہارے شکاری شاہی خیمے کے سامنے ہاتھوں میں شراب کے پیالے پکڑے جمع ہو گئے۔ قافلے میں شامل انگریزوں نے مہاراجا کو سکھوں کی جرات پر مبارکباد دی۔ اس پر رنجیت سنگھ جوش میں آ گیا اور وہاں بیٹھے لوگوں کو اپنے جرنیل اکالی پھلا سنگھ کی زندگی کی آخری جنگ جو نوشہرہ کے محاذ پر لڑی گئی کی روداد سنانے لگا۔ کہ کس طرح پھلا سنگھ کو ٹانگ پر گہرا زخم آ گیا اور جب اس نے دیکھا کہ وہ مزید اپنے پیروں پر کھڑا نہیں ہو سکتا اس نے اپنے زخم پر پٹی باندھی اور گھوڑے پر سوار ہو کر دشمن کی صفوں میں گھس گیا؛ اور جب مزید زخموں نے اسے ناکارہ کر دیا اور وہ جنگ میں پہلے والے جوش خروش سے حصہ نہیں لے پا رہا تھا وہ ہاتھی پر سوار ہو گیا اور اسے دشمن فوج کے درمیان لے گیا اور کس طرح آخری سانس لیتے ہوئے وہ شیر کے انداز میں چنگھاڑا تھا۔'' وہ ایک بہادر مگر بدمعاش شخص تھا اور اگر اس روز وہ مارا نہ گیا ہوتا میں نے اسے قید کرا دینا تھا کیونکہ اس نے سرحد عبور کر کے برطانوی فوجیوں کی چھاؤنی کو آگ لگانے کا منصوبہ بنایا ہوا تھا۔''

جنگیں اس کا پسندیدہ موضوع تھیں اور جب وہ اس موضوع پر بولنا شروع ہو جائے تو پھر اسے روکنا ممکن نہیں تھا۔ ''رنجیت سنگھ کی زبانی اس کی جنگوں، مہمات اور جھڑپوں کی کہانی سننا بہت ہی خوش کن تجربہ تھا۔ اپنی کامیابیوں کی بابت بتاتے ہوئے اس کی اکلوتی آنکھ خوشی سے چمکنے لگتی۔''

شکار سے فارغ ہو کر یہ لوگ بسنت منانے کے لیے لاہور پہنچے۔ یہ ایک ایسا تہوار تھا جسے ہندو، سکھ، مسلمان مل کر مناتے۔ تمام مرد اور عورتیں سورج مکھی کے پھول سے عقیدت کے اظہار کے لیے زرد رنگ کا لباس پہنتے۔ صبح کے وقت رنجیت سنگھ اپنی سواری پر ایستادہ باہر سڑک پر نکلتا اس کے آگے زرد وردیوں میں ملبوس پیادہ دستے مارچ کرتے۔ رنجیت سنگھ زرد رنگ کے ایک خیمے میں داخل ہوتا جہاں گرنتھ صاحب رکھی ہوتی۔ خیمے کی چھت موتیوں سے ڈھکی ہوتی اور اس کے کنارے قیمتی پتھروں کے وزن سے نیچے کی طرف جھکے ہوتے۔ برنز کے الفاظ میں 'اس سے زیادہ عظیم الشان نظارے کا تصور بھی نہیں کیا جا سکتا'۔ رنجیت سنگھ گرنتھ صاحب کے پاک کلام کی تلاوت سنتا اس کے سامنے تعظیم بجا لاتا اور نذرانہ پیش کرتا۔ 'اس دن کی مناسبت سے دس غلافوں میں لپٹی اس کتابِ مقدس کا بیرونی غلاف زرد رنگ کا تھا۔ خیمے سے باہر مہاراجا جلوہ افروز ہوتا اور لوگ اس کے قدموں میں پھلوں اور پھولوں کا انبار لگا دیتے۔ اس روز ہر وہ پتا پھول یا پھل حتیٰ کہ جڑی بوٹی بھی جس میں زرد رنگ کا ہلکا سا بھی شائبہ ہوتا شاخ سے علیحدہ کر لی جاتی'21

اس روز کئی درباری اور مہمان مہاراجا کے حضور پیش ہوئے ان میں شاہ زمان، شاہ شجاع اور ملتان کے سابق نواب کے بیٹے شامل تھے۔ جب نواب بہاولپور اور امیر سندھ کے ایلچی مہاراجا کے سامنے آداب بجا لائے تو مہاراجا نے ان سے برطانوی نمائندوں کی طرف سے دریائے سندھ کے پانیوں کو استعمال کرنے کی تجویز کے بارے میں سوالات کیے۔ کام کی

بات ختم ہونے کے بعد رقاصائیں بلوائی گئیں۔ جو زرد رنگ کے ریشمی کپڑوں میں ملبوس تھیں۔ رنجیت سنگھ کے سامنے سونے اور چاندی کی اشرفیوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا اور ان رقاصاؤں کے فن کی داد دینے کے لیے وہ مٹھیاں بھر بھر اشرفیاں ان پر لٹاتا رہا۔ شام کے وقت مثمن بُرج پر دعوت کا انتظام کیا گیا تھا۔ دعوت کی جگہ کو مختلف قسم کی روشنیوں سے سجایا گیا تھا۔ موم سے بھری بوتلوں کو تیلی دکھا کر مختلف رنگ کے پانیوں کے اوپر چھوڑ دیا گیا تھا جس سے ماحول کی رنگینی میں کئی گنا اضافہ ہو گیا تھا۔ جس ہال میں دعوت کا انتظام کیا گیا تھا وہاں (سجاوٹ کی غرض سے) جابجا آئینے اور جھاڑ لگائے گئے تھے۔ مہمانوں کو جن میں کیپٹن ویڈ اور ڈاکٹر مرے شامل تھے رنجیت سنگھ کا سونے کا کمرہ دکھایا گیا۔ اس کمرے کی دیواروں پر جھالر لگائی گئی تھی جبکہ پلنگ کا زیریں حصہ اور قریب پڑی کرسی خالص سونے کے بنے تھے۔ برنز نے اُس محفل میں بطورِ خاص مشاہدہ کیا کہ رنجیت سنگھ نے شراب کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملانے کے باوجود بہت کم پی۔ ’رنجیت سنگھ وزن کے اعتبار سے پیتا ہے اور عام طور پر اس کا پیالہ آٹھ اونس سے زیادہ نہیں بڑھتا‘‘۔ تاہم اپنے درباریوں کو وہ زبردستی پلواتا رہا۔ برنز اور اس کے ساتھیوں نے بھی اس محفل کے خوب مزے لوٹے۔ ’’عزت مآب (فرنگی) صاحب مسلسل پیتے اور رقاصاؤں کی صحبت سے لطف لیتے رہے اور کیف و سرور کے سمندر میں کھو گئے‘‘ سوہن سنگھ لکھتا ہے۔ 22

اس موقع پر دریائے سندھ میں کشتیاں چلانے کا سوال بھی زیرِ بحث آیا۔ رنجیت سنگھ نے واضح کیا اگرچہ اس عمل سے تجارت کو فروغ حاصل ہوگا جس کا پنجاب کی سرکار کو بھی تھوڑا بہت فائدہ ہوگا تاہم اسے دریائے سندھ میں کشتیوں کے اس طرح آنے اور اس کے علاقوں میں سفر کرنے کا خیال پسند نہیں آیا تھا۔ اس کو خدشہ تھا کہ اس عمل سے پنجاب اور برطانیہ کی فوجوں کی آپس میں جھڑپ ہوسکتی ہے۔ 23

برنز نے مہاراجا کے ساتھ مزید بحث مناسب نہیں سمجھی۔ لاہور میں قیام کے دوران اس نے آخری مرتبہ رنجیت سنگھ کو اس وقت دیکھا جب وہ اپنی سواری پر ایک سڑک سے گزر رہا تھا وہاں ان دونوں کا آمنا سامنا ہوا۔ اپنی اپنی سواری پر بیٹھے دونوں نے ایک دوسرے سے مصافحہ کیا۔ برنز لکھتا ہے: ’’میں نے ایشیا کے کسی مقامی شخص کو اتنا متاثر کن نہیں پایا جتنا کہ رنجیت سنگھ کو: بغیر تعلیم اور بغیر مناسب رہنمائی کے وہ اپنی ریاست کے تمام معاملات زبردست جوش و ولولے سے چلاتا ہے اور اپنی طاقت کا استعمال اس طور سے کرتا ہے کہ آج تک کسی مشرقی شہزادے نے نہ کیا‘‘۔ 24

ایک طرف برنز لاہور سے شمال مغرب کی سمت افغانستان میں قدم جمانے کے لیے روانہ ہوا تو کیپٹن ویڈ لاہور آن دھمکا اور رنجیت سنگھ کو تجارتی معاہدے پر دستخط کرنے کے لیے قائل کرنے کی کوششوں میں لگ گیا۔ حیدر آباد، خیر پور اور میر پور کے امیر پہلے ہی اپریل میں دستخط کر چکے تھے؛ اب رنجیت سنگھ کے پاس کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا۔ 26 دسمبر 1832 کو اس نے بھی اس معاہدے پر اپنی مہر ثبت کی اور اس طرح پنجاب کا مہاراجا سندھ پر تسلط اور پنجابی اقلیم کی سرحدوں کو سمندر تک بڑھانے تک کی اپنی خواہش سے دستبردار ہو گیا۔ جن دنوں رنجیت سنگھ اور برطانوی حکومت کے درمیان ایلچیوں کا آنا جانا لگا

ہوا تھا ایک نوجوان فرانسیسی ماہر نباتات وکٹر یا کموں جو کشمیر کی طرف جا رہا تھا لاہور آن پہنچا۔ اس کی ڈائری سے ہمیں پنجاب اور کشمیر کے مختلف شہروں اور قصبوں کے ساتھ ساتھ وہاں کے لوگوں اور مہاراجا کے بارے میں خاطر خواہ معلومات ملتی ہیں۔ 25 وہ انگریزوں اور ان کے نظریات کے بارے میں بہت اونچے وچاروں کا مالک تھا اور کلکتہ سے روانہ ہوتے وقت وہ ایک سینئر انگریز افسر کے نام تعارفی خط لینا نہ بھولا تھا۔ اس نے مذکورہ بالا افسران کو مشرق میں بسنے والے لوگوں کے خلاف تعصب کا اظہار کرتے دیکھا۔ ان لوگوں کے خیال میں صرف گوری چمڑی والے لوگوں کو ہی یہ حق حاصل تھا کہ وہ ایشیا میں بسنے والوں پر حکومت کر سکیں 26۔ ان تمام انگریز افسروں کی طرح جن کی رنجیت سنگھ سے ملاقات ہوئی تھی وکٹر یا کموں بھی رنجیت سنگھ کو ایک 'بوڑھا عیار لومڑ' سمجھتا تھا جس نے فوجی قوت کو استعمال کیے بغیر صرف سفارت کاری کے داؤ پیچ لڑ کر اپنی آزادی کو برقرار رکھا ہوا تھا۔ ''رنجیت سنگھ کے مقابلے میں ہمارا ماہر ترین سفارتکار بھی محض طفلِ مکتب ہے'' وکٹر یا کموں لکھتا ہے 27۔

مہاراجا پہلی ملاقات میں ہی اس فرانسیسی مہمان کو پسند کرنے لگا۔ یا کموں (Jacquemont) دراز قد، مضبوط جسم کا مالک شخص تھا جس کی لمبی سرخ داڑھی ہوا میں ادھر ادھر اڑتی رہتی تھی۔ اور رنجیت سنگھ لمبی داڑھی والے خوبصورت مردوں کی صحبت کو پسند کرتا تھا وکٹر یا کموں کو یہ جان کر حیرت ہوئی کہ مہاراجا نے اسے دیکھتے ہی پہچان لیا تھا کہ وہ انگریز نہیں ہو سکتا تھا۔ جب اس نے مہاراجا سے یہ دریافت کیا کہ اس نے یہ کیسے جان لیا کہ وہ انگریز نہیں تو مہاراجا کا جواب تھا: 'آپ کسی انگریز سے یہ توقع نہیں رکھ سکتے کہ وہ اپنی نشست پر بیس مرتبہ پہلو بدلے؛ وہ بولتے ہوئے ہاتھوں سے اشارہ بھی نہیں کرتا اور نہ کبھی موزوں وقت پر ہنستا ہے 28۔ یا کموں کی ایک اور خوبی یہ تھی کہ وہ نگر نگر پھر چکا تھا۔ اس کے پاس دنیا جہاں کی معلومات تھیں۔ اور رنجیت سنگھ کی جاننے کی پیاس بجھنے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اپنی آمد کے چند روز بعد ہی 'یا کموں صاحب بہادر' دربار کی ہر دلعزیز شخصیت بن گیا اور ہر موضوع پر اس سے مشورہ لیا جانے لگا۔ یا کموں لکھتا ہے: ''رنجیت مجھے پہلے سے دیئے گئے افلاطون اور سقراط کے خطابوں کے علاوہ ارسطو کہہ کر پکارتا ہے۔'' 29

یا کموں رنجیت سنگھ کی مہربان شخصیت اور بے لوث مہمان نوازی سے بہت متاثر ہوا۔ اس فرانسیسی النسل کی پسند ناپسند سے آگاہ مہاراجا نے تمام رقاصاؤں کہ کہلا بھیجا تھا کہ 'وہ یا کموں کی جناب میں حاضر ہونے کے لیے مردانہ لباس زیب تن کریں اور جب وہ مہاراجا کے سامنے حاضر ہوں تو انھوں نے ہاتھوں میں تیر کمان اٹھائی ہوا اور ان کے لباس پر زیور کی جگہ اسلحہ و ساز و سامان سجا ہو۔' بلاشبہ یا کموں لاہور کی زلف کا اسیر ہو گیا اور اسے یہاں رہنے میں لطف آنے لگا۔ لاہور میں رہنا ایسا تھا گویا کوئی الف لیلوی کہانی۔ وہ لکھتا ہے: ''پیادہ فوج کا ایک دستہ میری خدمت پر مامور تھا۔ جونہی میں کھڑکی سے سر باہر نکالتا پہرے پر مامور سپاہی فوراً ڈرم بجا کر مجھے سلام کرتے اور جب میں سردیوں کی شاموں میں اپنے باغ کی روشوں پر سیر کی خاطر نکلتا تو میرے باغ میں لگے ہزاروں فوارے کھول دیئے جاتے۔ تاہم مہاراجا کی طرف سے مجھے دیا گیا سب سے

حسین تحفہ کشمیری رقاصاؤں کی صورت میں ملا۔ انھوں نے اپنی آنکھوں کو سیاہ و سفید روغن سے رنگا ہوا تھا مگر میرا ذوقِ سلیم شاید اتنا بگڑ چکا تھا کہ مجھے یہ بناؤ سنگھار ان کے حسن و جمال میں اضافی معلوم ہوتا۔30

رنجیت سنگھ کے پے در پے سوالوں نے بھی فرانسیسی ماہر نباتات کو خاصا متاثر کیا تھا۔ ''اس سے گفتگو کرنا ایک ڈراؤنے خواب کی مانند ہے۔ پورے ہندوستان میں مجھے یہی ایک متجسس روح ملی ہے اور اس کے شوق کا حجم اتنا بڑا ہے کہ اسے تمام ہندوستان کی بیزاری اور عدم دلچسپی کے مقابلے میں پیش کیا جا سکتا ہے۔ اس نے مجھ سے ہندوستان، یورپ، بونا پارٹ، دنیاوی زندگی، آخرت، جنت، جہنم، رُوح، خدا اور شیطان اور دیگر موضوعات کے بارے کم و بیش لاکھوں سوال کیے''۔31

اپنی ڈائری میں یاکموں نے رنجیت سنگھ کی زندگی کے تاریک پہلوؤں کا بھی ذکر کیا ہے۔ 'وہ مشرق کے تمام لوگوں کی مانند غیر عملی، تصوراتی اور نااہل شخص ہے۔ اس کے پاس کشمیر کی خوبصورت ترین لڑکیوں کا خزانہ ہے اور اتنے وسائل ہیں کہ پورے ملک میں مہمانوں کو اس کے پائے کا کھانا کوئی نہیں کھلا سکتا۔ اسے اس بات پر اکثر غصہ آتا ہے کہ شراب کے بغیر اس کا حال خشک تالاب میں موجود مچھلی جیسا کیوں نہیں ہو جاتا اور اُسے ہاتھی کی طرح بھوک کیوں نہیں لگتی وہ بھی ایسا ہاتھی جو جنگل سے سیر ہو کر اپنے مقام کی طرف پلٹا ہو''۔32

اس کے علاوہ بھی کئی دوسرے موضوعات ایسے ہیں جن پر یاکموں تفصیل سے روشنی ڈالتا ہے۔ وہ رنجیت سنگھ کی عاجزی سے بہت متاثر ہوا اور اس بات پر خاصا حیران تھا کہ رنجیت سنگھ نے بغیر خون بہائے اتنی بڑی سلطنت کیسے کھڑی کر لی۔ ایک ایسے ملک میں جہاں مذہبی عدم برداشت کی روایت چلی آ رہی تھی رنجیت سنگھ عوام کی وفاداری حاصل کرنے میں کامیاب ہو گیا تھا، ایسی عوام سے جس کی اکثریت سکھ دھرم کی شدید مخالف تھی۔ یاکموں کے مطابق رنجیت سنگھ کی کامیابی کی بڑی وجہ تمام مذاہب سے اس کی بیزاری تھی۔ 'پیشے کے لحاظ سے وہ ایک سکھ مگر حقیقت میں ایک متشکک ہے۔ ہر برس وہ امرتسر دربار پر حاضری دیتا ہے اور مسلمان اولیاء کرام کے مزاروں پر بھی جاتا ہے تاہم یہ حاضریاں اُس کے سخت گیر ہم مذہبوں کو اشتعال نہیں دلاتیں۔''33

یاکموں نے مہاراجا کے ہاں سات ماہ مہمان کے طور پر گزارے۔ یہ معلوم نہیں ہو سکا آیا یہ پنجاب میں عیش و عشرت والی زندگی کا نتیجہ تھا یا کسی متعدی مرض کا کہ وہ ایک وبائی مرض میں مبتلا ہو گیا اور پنجاب سے ہندوستان لوٹنے کے تھوڑے ہی عرصے بعد بمبئی میں اس کا انتقال ہو گیا۔

روپر کا سیاسی تجربہ ناکام ہو گیا تھا مگر رنجیت سنگھ پر اس تجربے نے جذباتی اثرات بھی چھوڑے۔ ''عظیم المرتبت گورے صاحبوں'' کی واپسی کے بعد رنجیت سنگھ کی سوچیں ایک رقاصہ پر ٹک گئیں۔ وہ رقاصہ اس طائفے کا حصہ تھی جس نے انگریز مہمانوں کے سامنے اپنے فن کا مظاہرہ کیا تھا۔ رنجیت سنگھ امرتسر گیا اور اس لڑکی کو بلوایا۔ گل بیگم مہاراجا کے حکم کی تعمیل میں دربار میں پیش ہوئی نغمے گائے اور رقص پیش کیا۔ شاہی حرم کی سرد مزاج مغرور بیگمات کے برعکس گل بیگم زندگی اور حرارت سے

بھرپور نوجوان حسینہ تھی۔ ادھیڑ عمر مہاراجا اس مسلم رقاصہ کے عشق میں بری طرح گرفتار ہوگیا اور تمام دنیاوی رسوم و رواج توڑ کر اس سے شادی کا تہیہ کرلیا (ایسا وہ ایک مرتبہ پہلے بھی کر چکا تھا جب اس نے موہراں سے شادی کی تھی)۔ مہاراجا امرتسر گولڈن ٹیمپل گیا اور جو کچھ وہ کرنے جارہا تھا اس کی پیشگی معافی مانگی اور پھر منادی کرادی کہ آج کے بعد گل بیگم کو ملکہ عالیہ سمجھا جائے۔ اس کے عقیدے کا احترام کیا جائے گا اور وہ بطور مسلمان ہی زندگی گزارے گی۔ سوہن لال شادی خانہ آبادی کی تقریب کا کچھ یوں نقشہ کھینچتا ہے:

''مہاراجا نے زعفرانی رنگ کا لباس زیبِ تن کیا ہوا تھا۔ دوسری طرف جسم پر زیور سجائے زرد رنگ کے کپڑوں میں ملبوس گل بیگم شادی کے منڈپ میں آئی؛ اس کے ہاتھوں اور پیروں پر سرخ مہندی لگی ہوئی تھی اور سر سے پیر تک وہ ہیرے جواہرات جڑے سونے کے زیورات سے لدی ہوئی تھی۔ مہاراجا نے گل بیگم کو اپنے برابر والی نشست پر بٹھایا۔ گلابوں اور موتیوں سے بنے ہار مہاراجا کی پیشانی پر سجائے گئے جبکہ گل بیگم کی ناک میں نتھنی سجائی گئی جس میں قیمتی موتی جڑا تھا گل بیگم کا نام گل بہار بیگم رکھ دیا گیا۔ 34

سماج کی طرف سے اس شادی کی مخالفت نے رنجیت سنگھ کو پریشان کرنا شروع کردیا اور اسے اکثر ڈراؤنے سپنے دکھائی دینے لگے جن میں ایک ڈراؤنی شکل وصورت والا آدمی (ظاہر ہے ایک نہنگ) اسے ستانے لگا۔ رنجیت سنگھ نے اس سپنے کی تعبیر جاننے کے لیے ماہرین کو طلب کیا۔ انھوں نے اس ڈراؤنے خواب کی تعبیر یوں بیان کی کہ بہت جلد تمام ریاست کے اکالی اس کے خلاف کھڑے ہو جائیں گے پنڈتوں نے اسے یہ مشورہ بھی دیا کہ وہ اکالیوں کے غصے کو دور کرنے کے لیے زیادہ سے زیادہ خیرات گوردواروں کو بھجوائے۔ ضعیف العتقاد رنجیت سنگھ نے فوراً اس تجویز پر عملدرآمد شروع کروادیا۔

مہارانی گلبہار بیگم نے اگلے پانچ برس رنجیت سنگھ کا دل جیتنے میں لگا دیئے۔ وہ نقاب نہیں لیتی تھی اور کسی بھی تقریب یا جشن کے موقع پر مہاراجا کے ہمراہ ہاتھی پر ہی سواری کرتی۔ یہ رنجیت سنگھ کی زندگی کی آخری محبت تھی۔ 35

گلبہار بیگم کی دلفریب صحبت بھی رنجیت سنگھ میں پیدا ہونے والے سیاسی محرومی کے احساس کا ازالہ نہ کرسکی۔ لوگوں نے اب اس ڈھنڈورے پر کان دھرنا بند کر دیئے تھے کہ انگریز رنجیت سنگھ سے محبت کرتے تھے؛ معاشرے میں یہ احساس جنم لے رہا تھا کہ انگریزوں کے اظہار محبت کے پیچھے ایک ہی جذبہ کارفرما ہے: کسی طرح رنجیت سنگھ کو سندھ یا افغانستان پر چڑھائی سے باز رکھا جائے۔ رنجیت سنگھ نے سندھ کے امیروں کو مشورہ دیا کہ وہ کسی بھی قسم کے سیاسی یا معاشی مفاد سے بالاتر ہوکر سندھ میں انگریزوں کی طرف سے متوقع دخل اندازی کی مزاحمت کریں۔ رنجیت سنگھ کو اپنے مقصد میں کچھ خاص کامیابی نہیں ہوئی۔ شاید اس لیے کہ لوگ سندھ کے بارے میں خود اس کے عزائم سے اچھی طرح آگاہ تھے۔ انھیں وہ دن اچھی طرح یاد تھا جب رنجیت سنگھ نے برملا شکارپور پر قبضہ کرنے کی بات کی تھی۔ لہٰذا سندھ کے عوام اور امیروں نے رنجیت سنگھ کے سندھ کے خیر خواہ ہونے کے دعوے کو سنجیدگی سے نہیں لیا۔ تاہم رنجیت سنگھ کی طرف سے کی جانے والی بار بار کی پیشکشوں نے سندھ کے

امیروں کو یہ موقع فراہم کیا کہ وہ پنجابیوں کو انگریزوں کے خلاف کھڑا کر دیں۔ اُدھر رنجیت سنگھ نے بھی نہایت سرگرمی سے افغانستان کی سیاست میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس نے شاہ شجاع کی حوصلہ افزائی کی کہ وہ بارکزئیوں کو (جو انگریزوں کے ساتھ ایک تجارتی معاہدہ کرنے جا رہے تھے) کابل سے نکال باہر کرنے کی کوشش کرے۔ اس نے ہرات کی حکومت کے نمائندے (سفیر) کا بھی دربار میں استقبال کیا۔ رنجیت سنگھ نے انگریزوں کو یہ پیغام بھی بھجوایا کہ بہت جلد اس کی روسیوں کے ساتھ ایک ملاقات ہونے والی ہے اور یہ کہ روسی اس سے ملنے کے لیے بیحد بے تاب ہیں۔ رنجیت سنگھ نے نیپال سے آنے والے نمائندوں کا پرتپاک طریقے سے استقبال کیا۔ اُدھر حیدرآباد کے نظام، مراٹھا سرداروں اور رنجیت سنگھ کے درمیان رابطوں کی افواہیں بھی گرم تھیں۔ 36

رنجیت سنگھ نے انگریزوں پر زور دینا شروع کر دیا کہ وہ دریائے ستلج کے پار موجود ان چند قصبوں کو دربار کی ملکیت میں واپس کر دیں جن پر اس نے دعویٰ کیا ہوا ہے۔ انگریز حکومت نے چند غیر اہم قصبوں جن میں چمکور، آنندپور، کیرت پور اور مچھی واڑہ شامل تھے کی حد تک رنجیت سنگھ کے دعوے کو درست تسلیم کیا تاہم فیروزپور پر اس کے دعوے کو یکسر مسترد کر دیا۔ فیروزپور لاہور سے صرف چالیس میل کے فاصلے پر تھا اور اس کے آس پاس بہت سے قلعے موجود تھے جہاں تھوڑی دیرستانے کے بعد دربارِ لاہور کی فوج با آسانی آگے دریائے ستلج تک سفر کر سکتی تھی۔ انگریز سرکار نے عسکری مشیروں کے مشورے پر مذکورہ اقدامات کیے تھے ان کمانڈروں کا کہنا تھا کہ لدھیانہ کو لاہور سے خاصا دور ہونے کے باعث جنگی ہیڈکوارٹر یا آپریشنل بیس نہیں بنایا جا سکتا تھا۔ فیروزپور کے مسئلے پر انگریزوں اور دربار کی فوج کے درمیان معرکہ پڑنے والا تھا اور اس کا بہانہ لچھمن کور کی موت نے فراہم کر دیا۔ اس بیوہ کا ستمبر 1835 میں انتقال ہو گیا تھا۔ وہ اس شہر کی سردارنی تھی۔ شہر میں موجود انگریز ایجنٹ نے اس کی جاگیر اور ترکہ انگریز سرکار کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا تاہم شہر کی اشرافیہ اور عوام رنجیت سنگھ کو اپنا سردار مان رہے تھے انگریز فوج نے آگے بڑھ کر شہر کا محاصرہ کرنا شروع کر دیا۔

مہاراجا کو ان کے آنے کا احساس ہو چلا تھا۔ اس نے قصور میں فوجی تعینات کرنے شروع کر دیئے۔ قصور اور فیروزپور کے درمیان صرف دریائے ستلج موجود تھا۔

چند ماہ پہلے روپر میں ہمیشہ کی دوستی کا دعویٰ کرنے والے ایک دوسرے کے سامنے آ کھڑے ہوئے تھے۔

18

برطانوی حصار کی ٹوٹ پھوٹ

انگریز سندھ کے امیروں اور افغان حکومت سے سفارتی تعلقات کا آغاز کر چکے تھے۔ اب پنجابی صرف دو سمتوں میں آگے بڑھ سکتے تھے یا تو وہ ہمالیہ پار کرنے کے بعد چین کی سرحدوں تک پہنچ جائیں یا پھر پٹھان علاقے میں داخل ہو جائیں جو ایک پٹی کی صورت میں پنجاب اور افغانستان کے درمیان موجود تھا اور جسے نو مین لینڈ کہا جاتا تھا۔ پنجابی سب سے پہلے کشمیر کے دشوار پہاڑوں سے ہو کر لداخ پہنچے۔ ڈوگرہ جنرل زور آور سنگھ جو کشتواڑ میں تعینات تھا لداخ کے حکمران خاندان میں پھوٹ پڑوانے میں کامیاب ہو چکا تھا۔ اس نے لداخ کے تخت کے وارثوں میں سے ایک کو 30 ہزار روپے سالانہ پر دربار کی نوکری پر رکھ لیا اور دفاعی حوالے سے اہم چند قلعوں پر قبضہ بھی کر لیا۔ دسمبر 1836 میں زور آور سنگھ نے مہاراجا کی خدمت میں لداخ سے لایا گیا نذرانہ پیش کیا اور مہاراجا سے مغرب میں اسکردو کی طرف بڑھنے اور چین کے ساتھ مشترکہ سرحد قائم کرنے کی اجازت چاہی۔ مہاراجا نے اس کو کچھ عرصہ رکے رہنے کا حکم دیا۔

کیپٹن ویڈ نے دربار کی لداخ کی طرف پیش قدمی کے خلاف سخت احتجاج کیا اور وہاں سے بے دخل کیے گئے حکمران خاندان کو پناہ کی پیشکش کی۔ مہاراجا نے کیپٹن کو 1809 کا معاہدہ یاد دلایا اور واضح کیا کہ لداخ پر انگریزوں کا کوئی حق نہیں تھا کیونکہ وہ علاقہ ستلج کے اس طرف موجود تھا۔ ویڈ نے مہاراجا کا پیغام نظر انداز کرتے ہوئے اپنی حکومت کو ان خطرات سے آگاہ کیا جو پنجاب اور چین کی مشترکہ سرحد کے قیام میں پنہاں تھے۔

ایک طرف زور آور سنگھ پنجابی فتوحات کا جھنڈا تبت میں لہرانے جا رہا تھا دوسری طرف رنجیت سنگھ نے مغرب کی سمت میں اپنی ریاست کی سرحدوں کو توسیع دینے کا آغاز کر دیا تھا۔ اس کی طرف سے شاہ شجاع کو افغانستان کا حکمران بنانے کی پیشکش کا کوئی فائدہ نہیں ہوا تھا کیونکہ اس کے بدلے میں اس نے شاہ کو نہ صرف ملتان، ڈیرہ غازیخان، ڈیرہ اسمٰعیل خان،

منکیرہ اور پشاور پر اپنے دعوے سے دستبردار ہونے کو کہا تھا بلکہ گھوڑوں اور پھلوں کی صورت میں بیش قیمت تحائف دربار کی نذر کرنے کی شرط بھی عائد کی تھی۔ علاوہ ازیں افغانستان میں برسرِ اقتدار آنے کے بعد شاہ نے ملک میں گائے ذبح کرنے پر مکمل پابندی عائد کرنا تھی اور سومنات کے مندر سے حاصل ہونے والی صندل کی لکڑی بھی واپس ہندوستان بھیجنا تھی جسے بت شکن افغان حکمران سلطان محمود غزنوی 800 برس قبل ہندوستان سے لوٹ کر لے گیا تھا۔ ان شرائط کے جواب میں شجاع نے یہی بہتر جانا کہ وقتی طور پر خاموش رہے اور اپنے طور پر افغانستان کے تخت پر قبضہ کرنے کی کوشش کرے۔

شجاع کو سندھ کے امیروں سے کچھ مدد حاصل ہوئی۔ اسے یقین دلایا گیا جیسے ہی وہ افغانستان کی حدود میں داخل ہوگا قبائلی عوام اس کی حمایت میں اٹھ کھڑے ہوں گے۔ لیکن جب وہ افغانستان کی طرف بڑھا تو قبائلی سرداروں نے اپنے قلعوں میں بیٹھ کر زبانی طور پر اس کی حمایت کا اعلان کرنے کے علاوہ کچھ نہ کیا۔ دوست محمد نے اپنے بھائیوں کو شاہ شجاع کی کابل کی طرف پیش قدمی روکنے کے لیے بھیجا۔ انھوں نے ایک مختصر سی جھڑپ میں شاہ شجاع کے فوجی دستے کو روند ڈالا اور شاہ شجاع کو واپس اپنی 60 بیویوں کے پاس لدھیانہ آنا پڑا۔ اب رنجیت سنگھ اس نتیجے پر پہنچا تھا کہ اگر اسے اپنی شمال مغربی سرحدوں کو واقعی محفوظ بنانا ہے اور انھیں افغانستان پر حملہ کے وقت ابتدائی پڑاؤ کے طور پر استعمال کرنا ہے تو اس سرحدی علاقے کو افغان سرداروں کی نگرانی میں دینے کی بجائے جو دربار کو اس کا معاوضہ دیتے چلے آرہے تھے براہِ راست لاہور کی عملداری میں لانا ہوگا۔ نتیجتاً جب شاہ شجاع افغانستان میں دوست محمد کے بھائیوں کا مقابلہ کر رہا تھا دربار نے ہری سنگھ کو حکم دیا کہ دربار کی طرف سے مقرر کردہ پشاور کے "وصل" سلطان محمد سے گورنر کا چارج لے کر خود بطور گورنر پشاور ذمہ داریاں سنبھالے۔ ہری سنگھ کے گورنر بنتے ہی پنجابی دستوں نے شہر کے دفاع کی ذمہ داریاں سنبھال لیں۔

ہری سنگھ نلوا پشاور کی انتظامی ذمہ داریاں رنجیت سنگھ کے پوتے نونہال سنگھ کو سونپ کر خود آس پاس کے علاقوں کے قبائلی جنگجوؤں کی سرکوبی کو نکل کھڑا ہوا۔ پشتون قبائلی صدیوں سے غریب پنجابیوں کے ساتھ نہایت بہیمانہ سلوک کرتے چلے آرہے تھے۔ اس ظلم کا تدارک کرنے کے لیے ہری سنگھ نلوا نے مکمل سنگدلی کا مظاہرہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ جب کبھی قبائلی پٹھان پنجابیوں پر گھات لگا کر حملہ کرتے یا گولیاں برساتے جو کہ ان پٹھان چھاپہ ماروں کی پسندیدہ جنگی حکمت عملی تھی ہری سنگھ اُن کے گاؤں پہنچ جاتا اور وہاں موجود ان کے مکانات مسمار کروا دیتا۔ تھوڑے ہی عرصے میں ہری سنگھ کا نام قبائلی علاقوں میں دہشت کی علامت بن گیا۔ اس نے حساس علاقوں میں ایک قطار میں قلعے تعمیر کروائے اور ایک قلعے سے دوسرے قلعے کو با آسانی دیکھا جا سکتا تھا1۔ جو دو قلعے پشاور شہر کے داخلی مقام پر موجود تھے ان میں دربار کی فوج کے بہترین جرنیلوں کو تعینات کیا گیا، شب قدر کے قلعے میں 1900 فوجیوں کو لہنا سنگھ ساندھووالیا کے زیرِ کمان دیا گیا جبکہ جمرود قلعے میں 600 فوجیوں کو ماہا سنگھ کی نگرانی میں تعینات کیا گیا۔ دوست محمد نے عجلت میں پشاور کا رخ کیا اس نے رنجیت سنگھ کو کئی گستاخانہ مراسلے بھجوائے اور دھمکی دی کہ شہر کو خالی کر دیا جائے یا پھر افغان تلوار کے لوہے کا مزہ چکھنے کے لیے تیار ہو جائے۔ رنجیت سنگھ نے دوست محمد کو

اسی کی زبان میں جواب دیتے ہوئے کہا وہ پنجابیوں اور افغانیوں کے درمیان طاقت کے مقابلے کا شدت سے منتظر ہے۔2 دوست محمد نے انگریزوں کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کی مگر کامیاب نہ ہوسکا اب اس کے بعد پرانا استعمال شدہ حربہ آن بچا تھا ''مقدس جنگ یا جہاد''۔2 جنوری 1835 کو اس نے خود کو امیر المومنین قرار دے کر مسلمانوں سے اپیل کی کہ کافروں کو تہس نہس کر دیں۔ دوست محمد سید احمد والی ''بیوقوفانہ عظمت'' کے وائرس کا شکار ہو گیا تھا اور ہر اس شخص پر جرمانہ عائد کرنے کے درپے تھا جو اسے امیر المومنین کی بجائے سردار کہہ کر پکارتا۔ ہندوؤں کو تو اس نے خاص نشانہ بنایا تھا وہ ان پر بے دریغ جرمانہ عائد کرتا۔ اس کے بیٹوں نے غازیوں پر مشتمل فوج کے ساتھ پنجاب کی طرف پیش قدمی کی تا کہ پنجابیوں کو شمال مغربی سرحدوں سے نکال باہر کیا جائے۔

مہاراجا نے فقیر عزیز الدین اور ایک امریکی باشندے جوشواہرلن (جسے افغانیوں کی فطرت کے بارے میں علم تھا اور وہ افغان افسروں کے ساتھ کام بھی کر چکا تھا) کو دوست محمد کے پاس روانہ کیا۔ افغانیوں کا امیران سے ملنے پر رضامند ہو گیا اور جب وہ اس کے سامنے پیش ہوئے تو وہ یوں گویا ہوا ''کافرو دیکھا ہم نے تمہیں کس طرح بیوقوف بنایا''۔ اس پر فقیر عزیز الدین نے احتجاجاً آواز بلند کی اور کہا ایسا کرنا سفارت کاری کے آداب کی کھلی خلاف ورزی ہے۔ جواب میں دوست محمد نے واضح کیا کہ کافر حکمرانوں اور ان کے ایجنٹوں پر کسی قسم کی سفارتکاری کے قوانین لاگو نہیں ہوتے۔ تاہم ایامِ اسیری میں بھی جوشواہرلن افغانیوں کے درمیان اختلافات کا بیج بونے میں کامیاب ہو گیا۔

اس نے لکھا: ''میں نے اُس (دوست محمد) کے بھائیوں میں اُس کی بڑھتی ہوئی طاقت کے خلاف حسد کا جذبہ پیدا کر کے انھیں اسی کے خلاف کر دیا۔ میں نے اس کے بھائی سلطان محمود خان جو حال ہی میں پشاور سے فرار ہو کر وہاں پہنچا تھا کو اس بات پر بھی آمادہ کر لیا کہ وہ آدھی رات کو اپنے دس ہزار سپاہیوں کے ہمراہ میدانِ جنگ چھوڑ جائے۔ وہ میرے ساتھ سکھ کیمپ تک آیا جبکہ اس کے سپاہی اپنے پہاڑی قلعوں کی طرف لوٹ گئے۔''3 جوشواہرلن آگے چل کر لکھتا ہے کہ سلطان محمود کے اس اقدام پر دوست محمود کا تمام جنگی جوش و جذبہ سرد پڑ گیا اور وہ نہایت مایوسی کے عالم میں واپس کابل چلا گیا اور قران کی تلاوت میں مشغول ہو گیا۔

دوست محمد کی دنیاوی آسائشوں اور کامیابیوں سے لاتعلقی نے پنجاب کی شمال مغربی سرحد پر تناؤ کو کم کر دیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے اس عرصہ کو غنیمت جان کر اپنی توجہ سندھ کی طرف مبذول کی اور اس کوشش میں لگ گیا کہ کسی طرح انگریزوں کو سندھ کے نیم رضامند امیروں کو اس بات پر مجبور کرنے سے روکے کہ وہ سرکارِ برطانیہ کے ساتھ اتحاد میں شامل ہوں۔ سندھیوں کے پاس اپنی آزادی و خود مختاری کو محفوظ رکھنے کا ایک ہی طریقہ بچ گیا تھا اور وہ یہ کہ اپنے آس پاس کی ریاستوں کے لالچی حکمرانوں کو ایک دوسرے سے لڑوا دیا جائے انھوں نے سندھ کے ایک مزاری قبیلے سے جو دریائے ستلج اور دریائے سندھ کے درمیان بس رہا تھا ملتان کے جنوب میں موجود پنجابی فوج کی چوکیوں پر اچانک حملہ کروا دیا۔ مزاریوں نے دربار کے زیرِ

انتظام کئی دیہاتوں میں خوب لوٹ مار مچائی۔

شہزادہ کھڑک سنگھ کو ان کے خلاف تادیبی کارروائی کرنے کا حکم دیا گیا۔ شہزادے نے غیر منظم مزاریوں کے خلاف مختصر سی کارروائی کے بعد 1836 کی موسمِ گرما میں مٹھن کوٹ اور روجھان پر قبضہ کرلیا۔ اس نے اپنے باپ سے شکار پور تک جانے کی اجازت چاہی۔ رنجیت سنگھ کے پاس شکار پور پر قبضہ کرنے کا مکمل جواز موجود تھا کیونکہ وہابی انتہا پسند نصیرالدین نے اس شہر کو سکھوں کے خلاف اپنی مہم کے مرکز میں تبدیل کرلیا تھا تاہم وہ ایسا کوئی اقدام نہیں اٹھانا چاہتا تھا جس کے نتیجے میں اس کے اور انگریزوں کے درمیان مخالفت کا خدشہ پیدا ہو۔ اس جھجک نے جنوب کی سمت میں اس کے عزائم کو خاصا نقصان پہنچایا۔

انگریزوں نے مہاراجا کی اضطرابی کیفیت کا بھرپور فائدہ اٹھایا۔ ہندوستان کی حکومت کے سیکرٹری میکناٹن نے پنجابیوں کا راستہ روکنے کے لیے فوری اقدامات کی حمایت کی۔ ''حکومت ہندوستان سیاسی مفادات کے پیشِ نظر اس بات کی پابند ہے کہ سکھوں کی قوت کو دریائے سندھ کے کنارے آباد ریاستوں تک پھیلنے سے روکا جائے'' میکناٹن نے لکھا۔ اگست میں ویڈ کو رنجیت سنگھ سے ملاقات کے لیے بھیجا گیا۔ اسے واضح ہدایات دی گئی تھیں کہ مہاراجا کو لاہور میں رکھنے اور اس کی فوجوں کی جنوب کی سمت پیش قدمی کو ہر ممکن طریقے سے روکنے کی کوشش کی جائے 4۔ اگر مہاراجا یہ اصرار کرے کہ وہ انھیں سبق سکھانے یا سزا دینے اس سمت میں جارہا ہے تو اسے بتادیا جائے کہ مذکورہ علاقے اور ان کے حکمران انگریز سرکار کی پناہ میں آچکے ہیں (تاہم ان کا یہ دعویٰ سچ نہیں تھا)

رنجیت سنگھ نے انگریزوں کی چال کا توڑ کرنے کے لیے شاہ شجاع کے ساتھ ایک معاہدہ کیا اگر شاہ شجاع پشاور پر اپنے دعوے سے دستبردار ہوتا ہے (پشاور پہلے ہی سے رنجیت سنگھ کے قبضے میں تھا) تو رنجیت سنگھ افغانستان اور شکار پور میں (جو کہ رنجیت سنگھ کے قبضے میں نہیں تھا) دوبارہ سلطنت قائم کرنے میں اس کی مدد کرے گا۔ اب وہ تین طرح کے دلائل سے انگریزوں کا سامنا کر رہا تھا۔ اس نے ان لوگوں کو سزا دینا تھی جو مزاریوں کو پنجابیوں کے خلاف اکسا رہے تھے؛ شجاع جس کا شکار پور پر جائز حق تھا اور وہ یہ حق اس کو سونپ چکا تھا؛ اور 1809 کا معاہدہ جس کی رو سے انگریز دریائے ستلج کے مغربی علاقوں میں عدم مداخلت کے پابند تھے۔ انگریزوں نے رنجیت سنگھ کی اس دلیل سے اتفاق کیا کہ مزاریوں نے پنجابیوں کے ساتھ زیادتی کی تاہم انھوں نے شکار پور پر اس کے دعوے کو یکسر مسترد کردیا چاہے وہ اسے انعام کی صورت میں شاہ شجاع سے ملا ہو یا شاہ نے اس کے استدلال سے متاثر ہو کر یہ شہر عطا کیا ہو۔ اور جہاں تک 1809 کے معاہدے کا سوال ہے انگریز اس دلیل کے مقابلے میں یہ دور کی کوڑی لائے کہ جن علاقوں کی رنجیت سنگھ بات کر رہا ہے وہ صرف ستلج کے مغرب میں واقع نہیں بلکہ ستلج اور دریائے سندھ دونوں کے مغرب میں واقع ہیں اور ستلج کے مغرب اور ستلج و سندھ کے مغرب میں واقع ہونے میں خاصا فرق ہے۔

دربار کے وزرا توہین کے احساس سے تلملا رہے تھے۔ انھوں نے مہاراجا سے پرزور درخواست کی کہ وہ ایک سخت موقف اپنائے اور اگر اس مسئلے پر انگریزوں سے جنگ بھی لڑنی پڑ جائے تو ایک قدم پیچھے نہ ہٹے۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ ایک ایسی قوم جو اپنے عہد کو مسلسل توڑتی چلی آ رہی تھی اور بڑے منظم انداز میں اپنی توسیع پسندانہ منصوبے پر عمل کر رہی تھی جلد یا بدیر کسی نہ کسی بات کو بہانہ بنا کر پنجاب کو اپنے ساتھ شامل کر لے گی۔ انھوں نے مہاراجا کو خالصہ فوج کی جرات و بہادری کے واسطے دیئے۔ خود رنجیت سنگھ انگریزوں کے اس جواب سے شدید غصے میں آیا ہوا تھا مگر اس نے کبھی غصے کو خود پر حاوی نہیں ہونے دیا۔ جب اس کے غصے کی شدت کچھ کم ہوئی تو اس نے اپنے مشیروں سے دریافت کیا: ''اُن دو لاکھ مرہٹا فوجیوں کو کیا ہوا جو انگریزوں کا مقابلہ کرنے نکلے تھے؟''۔ بعدازاں رنجیت سنگھ نے فقیر عزیزالدین کے ذریعے انگریزوں کو اس بات پر قائل کرنے کی کوشش کی کہ وہ سندھ کو غیر جانبدار ملک کے طور پر تسلیم کر لیں اور انھیں یہ یقین دہائی کرائی کہ ان کی طرف سے ایسا تسلیم کیے جانے کے بعد یہی درجہ افغانستان کو دیا جائیگا۔ ویڈ نے مہاراجا کو اس تجویز کا جواب دینے کی بجائے اپنا سارا زورِ بیاں تاجِ برطانیہ کی امن کے قیام اور تہذیب و تمدن کو دنیا بھر میں پھیلانے کے لیے کی جانے والی کوششوں پر صرف کیا۔ مہاراجا نے سندھ کے مسئلے کو ہندوستان کے نئے گورنر جنرل لارڈ آک لینڈ کے ساتھ ذاتی طور پر اٹھائے جانے تک التوا میں ڈالنے کی کوشش کی۔ اس کا کہنا تھا: ''میرے سردار مجھ سے کہہ رہے ہیں'' ذرا دیکھو صاحب لوگ کیا کر رہے ہیں۔ یہ ایک جگہ پر قبضہ کرتے ہیں اور خود ہی دوسری جگہ کی سرحدوں کی نشاندہی کرنا شروع کر دیتے ہیں'' تاہم ویڈ اپنے مؤقف سے ایک انچ بھی پیچھے نہیں ہٹا۔ ایک اور ملاقات میں رنجیت سنگھ نے ویڈ سے دریافت کیا کہ گورنر جنرل نے اسے جو خط لکھا تھا اس میں ''بہتری و خوشحالی'' اور ''احترام واحساس'' کے الفاظ استعمال کیے گئے ہیں ان الفاظ سے گورنر جنرل کی کیا مراد ہے۔ ویڈ نے رنجیت سنگھ کے سوال میں چھپا ہوا طنز نظر انداز کر دیا اور ان الفاظ پر تفصیلاً روشنی ڈالنا شروع کر دی۔ رنجیت سنگھ نے اسے یہ کہہ کر خاموش کرایا ''میں اچھی طرح سمجھتا ہوں''۔ ویڈ کے الفاظ میں ان کی ملاقات کچھ اس طرح ختم ہوئی: 'مہاراجا کے رویے سے بے صبری ظاہر ہو رہی تھی اور وہ بار بار فقیر عزیزالدین کا ہاتھ پکڑ کر اس پر ہتھیلی مار رہا تھا[5]' بالآخر رنجیت سنگھ اس بات پر رضامند ہو گیا کہ وہ وقتی طور پر اپنی سلطنت کو وسعت نہیں دے گا۔ سندھ پر ہونے والے مذاکرات ختم کر دیئے گئے تاہم اس نے کسی نئے معاہدے پر دستخط کرنے سے بالکل انکار کر دیا اور روجھان میں موجود چوکیاں ختم کرنے کی تجویز کو بھی مسترد کر دیا۔

رنجیت سنگھ بہت بوجھل دل کے ساتھ سندھ پر اپنے عہدے سے دستبردار ہوا تھا۔ وہ یہ نہیں چاہتا تھا کہ ایسے وقت میں جب شمال مغربی سرحدی صوبے میں گڑبڑ جاری ہے کسی اور جگہ سے اس کے خلاف آواز بلند ہو۔ ہری سنگھ کی طرف سے اٹھائے گئے مفید اقدامات نے جن میں حفاظتی قلعوں کا سلسلہ تعمیر کرنا تھا افغانیوں کو یہ باور کرانے پر مجبور کر دیا تھا کہ پنجابی افغانستان پر قبضہ کرنے جا رہے ہیں۔ دوست محمد نے قران ایک طرف رکھ کر اپنے ہم وطنوں کے مذہبی جذبات کو بھڑکایا اور قبائلیوں کو ایک اور جہاد کے لیے پکارا۔ جب اس کو معلوم ہوا کہ دربار شہزادہ نونہال سنگھ کی شادی کی تیاریوں میں مصروف ہے

اور بیمار نلوا پشاور میں بسترِ مرگ پر پڑا ہے اس نے اس موقع کو پنجابیوں پر حملہ کرنے کے لیے غنیمت جانا۔

دوست محمد کی جنگی حکمتِ عملی کے مطابق پنجابیوں کی فوجی چھاؤنیوں شب قدر، جمرود اور پشاور کو ایک دوسرے سے جدا کرنے کے بعد ایک ایک سے علیحدہ نمٹا جائے۔ اس فہرست میں پہلا نام جمرود کا تھا۔ نلوا کے قلعوں میں یہ سب سے آگے موجود تھا اور دیگر قلعوں سے اس کا رابطہ خاصا کمزور اور غیر فعال تھا۔ ایک دستے کو شب قدر میں لہنا سنگھ کا راستہ روکنے کی غرض سے بھیجا گیا جبکہ اصل افغان فوج نے جو کہ پچیس ہزار سپاہیوں اور اٹھارہ توپوں پر مشتمل تھی جمرود قلعے کا محاصرہ کرلیا۔ ماہا سنگھ کے پاس صرف 600 سپاہی اور چند ہلکی توپیں تھیں۔ کچھ ہی دیر میں افغان توپوں نے جمرود قلعے کو ملبے کے ڈھیر میں تبدیل کر دیا۔ ماہا سنگھ کے سپاہی خندقیں کھود چکے تھے اور چار روز تک انھوں نے افغانیوں کو قلعے کے قریب نہیں آنے دیا؛ پھر ماہا سنگھ نے نلوا کو پیغام بھجوایا کہ اس کے لیے افغان سپاہیوں کو مزید روکنا مشکل ہے۔ ایک سکھ عورت افغان سپاہیوں کے لباس میں دشمن کی صفوں سے ہوتی ہوئی پشاور تک یہ پیغام لے گئی۔ پیغام ملتے ہی نلوا بسترِ مرگ سے اٹھ بیٹھا اور جمرود کا قصد کیا۔

نلوا کے بستر سے اٹھ کھڑے ہونے کی خبر ہی افغانیوں کے چھکے چھڑا دینے کے لیے کافی تھی۔ انھوں نے جمرود کا محاصرہ اٹھا دیا اور شکست کی صورت میں فرار کا راستہ مدِنظر رکھتے ہوئے وادی خیبر میں پوزیشنیں سنبھال لیں۔ ادھر نلوا نے اپنی فوجوں کی صف بندی کی اور افغانیوں کی طرف سے جو کہ اس کے ایک سپاہی کے مقابلے میں تین تھے حملے کا انتظار کرنے لگا۔ سات روز تک دونوں فوجیں ایک دوسرے کے آمنے سامنے موجود رہیں پھر نلوا سمجھ گیا کہ افغانیوں میں سکھ فوج کا مقابلہ کرنے کی سکت نہیں ہے۔ اس نے اپنی فوج کو پیش قدمی کا حکم دیا۔ دونوں اطراف کی فوجوں میں 30 اپریل 1837 کو مڈبھیڑ ہوئی۔ پنجابیوں نے افغان سپاہیوں اور قبائلی پٹھانوں کو بغیر کسی دشواری کے میدانِ جنگ چھوڑنے پر مجبور کر دیا۔ انھوں نے دشمن کی گیارہ توپیں بھی اپنے قبضہ میں لے لیں۔ ان کا اصل مسئلہ افغانیوں کے تعاقب کے دوران نظم و ضبط برقرار رکھنا تھا۔ جھڑپ کے دوران دوست محمد کا بیٹا محمد اکبر خان جو ایک مورچے میں بیٹھا نلوا سنگھ کو اپنی فوج کی کمان کرتے ہوئے آگے بڑھتا دیکھ رہا تھا نے ہری سنگھ نلوا کے قریب آنے پر ایک جست لگائی اور اس پر وار کرتا ہوا فرار ہونے میں کامیاب ہوگیا۔ اس حملے کے نتیجے میں پنجابی فوج میں بھگدڑ مچ گئی جس کا فائدہ اٹھا کر اکبر خان نے نہ صرف اپنی توپوں کو واپس قبضے میں لے لیا بلکہ سکھوں کی تین توپیں بھی ساتھ لے گیا۔ اس معرکے میں اس کا ذاتی کارنامہ ایک سکھ سپاہی کو موت کے گھاٹ اتارنا تھا۔

نلوا کو شدید ضرب لگی تھی اسے جمرود قلعے میں لے جایا گیا۔ وہ جان چکا تھا کہ اس کا آخری وقت قریب آچکا ہے۔ اس نے اپنے سپاہیوں کو حکم دیا کہ اس کی موت کی خبر کو صیغہء راز میں رہنے دیا جائے جب تک افغان سپاہی درہ خیبر پار نہیں کر جاتے۔ پنجابیوں نے اس کے حکم پر بڑے جوش و ولولے سے عمل کیا۔ اگرچہ افغانی شب قدر اور پشاور پر قبضہ کرنے جیسے منصوبوں میں بری طرح ناکام ہو چکے تھے اور انھیں بہت شرمناک طریقے سے پسپا ہونا پڑا تھا پھر بھی کابل پہنچنے پر وہ خوشی سے بے قابو ہوئے جا رہے تھے۔ کیا ہوا اگر جنگ میں شکست ہوئی، وہ ''نلوے'' کو ہلاک کر چکے تھے جس کے بارے میں

مشہور تھا کہ وہ اکیلا ایک لاکھ پچیس ہزار کے لشکر پر بھاری تھا۔6

ایک انگریز ڈاکٹر وڈ نے ویڈ کو اس جھڑپ اور نلوا کی موت کے بارے بتایا ویڈ نے اس کی دی ہوئی معلومات کو آگے گورنر جنرل کو ارسال کر دیا7۔ اپنے مراسلہ میں اس نے لکھا کہ افغانیوں کی بڑی تعداد اس جنگ میں ماری گئی۔ مارے جانے والوں میں دوست محمد کا بڑا بیٹا محمد افضل بھی شامل تھا۔ ڈاکٹر وڈ کے مطابق اس جنگ میں 12,000 پنجابی فوج نے حصہ لیا جن میں 6,000 مارے گئے جبکہ مرنے والے افغان سپاہیوں کی تعداد ان سے تقریباً دگنی یعنی 11,000 کے قریب تھی۔
ہری سنگھ کو چار زخم لگے: دو خنجر کے زخم اس کے سینے میں لگے، ایک تیر اس کے جسم کے آر پار تھا جسے اس نے خود اپنے ہاتھ سے باہر نکالا اور ان زخموں کے باوجود اپنے سپاہیوں کو ہدایات دیتا رہا۔ یہاں تک کہ اس کے جسم میں بندوق کی ایک گولی لگی اور وہ آہستہ آہستہ زمین پر آ گرا۔ اسے اٹھا کر قلعے کی طرف لے جایا گیا جہاں اس نے آخری ہچکی لی مرنے سے پہلے اس نے اپنے لوگوں کو وصیت کر دی تھی کہ اس کی موت کی خبر کو مہاراجا کے امدادی دستوں کی آمد تک عام نہ کیا جائے۔
رنجیت سنگھ کو خیبر کی طرف پیش قدمی کے دوران نلوا کی موت کی خبر ملی۔ مہاراجا یہ خبر سن کر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ اس نے اپنی چھاتی پیٹ ڈالی اور نلوا کی موت پر خوب آنسو بہائے۔ اس کے جمرود تک پہنچنے سے قبل ہی پورے علاقے کو افغانیوں سے خالی کرا لیا گیا تھا۔

آیئے مہاراجا کی ڈائری کے چند پچھلے صفحات کھولتے ہیں تاکہ اُس شادی کے بارے جان سکیں جس نے مہاراجا کو نلوا کی بروقت مدد سے روکے رکھا۔

19

شہزادہ نونہال سنگھ کی شادی اور ہولی کا تہوار

''اکال رکھ جی کے نام سے۔ محترم اور مہربان جناب،

ہماری دوستی کے مضبوط رشتے کے پیشِ نظر جس کی بنیادیں ایک دوسرے کے ساتھ خلوص اور اتحاد پر استوار ہیں ان مبارک ایام میں جن کے تقدس کی ایک ہزار سے زائد نشانیاں موجود ہیں ہم اپنی خواہشات کی تکمیل کرنے جا رہے ہیں اور اپنے پیارے بیٹے شہزادہ نونہال سنگھ کی جو کہ ہماری اور ہمارے زیرِ نگیں تمام علاقوں میں بسنے والوں کی آنکھوں کا تارا ہے، پنجاب کے تخت کا وارث اور قسمت کا دھنی ہے شادی خانہ آبادی کرنے جا رہے ہیں۔ دوستی کے قلم سے ہم آپ حضور کو اس مبارک اور پر مسرت تقریب میں شرکت کی تہہ دل سے دعوت دیتے ہیں آپ کی شرکت سے ہماری خوشیوں کو چار چاند لگ جائیں گے۔''

مذکورہ بالا الفاظ میں مہاراجا رنجیت سنگھ نے برطانوی فوج کے کمانڈر ان چیف کو شہزادہ نونہال سنگھ کی شادی میں شرکت کی دعوت دی۔ گورنر جنرل نے سر ہنری کو حکومتِ ہندوستان کے نمائندے کے حیثیت سے مہاراجا کے پوتے کی شادی میں شرکت کی ہدایت کی۔ سر ہنری کے ہمراہ اس کا بھتیجا لیفٹیننٹ ہنری ایڈورڈ فین بھی بطور اے ڈی سی ٹو کمانڈر ان چیف پنجاب آیا۔ نوجوان افسر کی ڈائری سے ہمیں اُس رنگا رنگ شادی کا احوال تفصیل سے ملتا ہے۔ لیفٹیننٹ ہنری ایڈورڈ عمر رسیدہ مہاراجا، اس کی گرتی ہوئی صحت مگر اس کی بذلہ سنجی اور اس کے شان و دبدبے پر بھی کھل کر اظہارِ خیال کرتا ہے۔ یہ سب پڑھ کر ہمیں انگریزی کے شاعر ملٹن کے مندرجہ ذیل مصرعے یاد آ جاتے ہیں:

''جہاں مشرق اپنے دستِ امارت سے برساتا ہے
اپنے بادشاہوں پر قدیم دور کے موتی، ہیرے جواہرات''

کمانڈر ان چیف اور اس کے مہمانوں کا جن میں کیپٹن ویڈ بھی شامل تھا دریائے ستلج کے مغربی کنارے پر شہزادہ شیر سنگھ نے استقبال کیا۔ نوجوان فین شہزادے کی وجاہت کو دیکھ کر دنگ رہ گیا: 'ایک خوبصورت سیاہ داڑھی والا نوجوان جیسا کہ ہم عام طور پر دیکھتے ہیں۔ وہ (شہزادہ شیر سنگھ) ایک ریشمی لباس جس پر کڑھائی کا کام کیا گیا تھا پہنے ہوئے تھا۔ اس نے ہیروں سے جڑی کلاہ پہنی ہوئی تھی، زمرد اور نیلم بھی تھے۔ کچھ پتھر ایسے بھی تھے جو بے حد قیمتی تھے 1۔ یہ سب لوگ شہزادہ شیر سنگھ کے مہمان تھے۔ ایک موقع پر انھیں شہزادہ شیر سنگھ کی خوابگاہ بھی دکھائی گئی۔ 'خوابگاہ میں آئینے، فرانسیسی خوشبوؤں کی بوتلیں اور چھوٹی موٹی ضروریات کی چیزیں موجود تھیں۔ اس سب سامانِ آرائش کو دیکھ کر ظاہر ہوتا تھا کہ ان کو استعمال کرنے والا ایک صاحبِ ذوق شخص تھا۔ یورپی سامان آرائش سے اس کی دلچسپی صرف ٹائلٹ کی چیزوں تک محدود نہیں تھی۔' شیر سنگھ فرانسیسی شراب کا دلدادہ تھا اور انگریزی ساخت کے چھکڑے میں سوار ہونا پسند کرتا تھا جو سفر کے دوران ہمیشہ اس کے قافلے میں موجود ہوتا۔

5 مارچ 1837 کو شادی میں شرکت کے لیے مہمانوں کا یہ قافلہ امرتسر پہنچا۔ شہزادہ کھڑک سنگھ اور راجا دھیان سنگھ نے ان کا استقبال کیا۔ فین لکھتا ہے ''سنہرے کپڑوں میں ملبوس شہزادہ اور اس کے ساتھی سب لوگ ہیروں جواہرات کی چکا چوند کر دینے والی روشنی سے منور تھے''۔ دھیان سنگھ جو دوسروں کی نسبت ان کی توجہ کا مرکز بنا ہوا تھا 'ایک بڑے ایرانی گھوڑے پر سوار تھا جو طاقت کے نشے میں سرشار بار بار جگہیں تبدیل کر رہا تھا، گویا اپنے سوار پر نازاں تھا۔ اس کی لگام اور کاٹھی پر سونے کا کام کیا گیا تھا اس کی پیٹھ پر چاندی کے کام والا زین کا کپڑا موجود تھا جس کے کنارے باہر کو اتنے نکلے ہوئے تھے کہ گھوڑے کو دُم تک ڈھانپا ہوا تھا۔ گھوڑے کی ٹانگوں اور دم پر سرخ رنگ کیا گیا تھا۔ ٹانگوں پر گھٹنوں تک جبکہ دُم نیچے سے اوپر تک آدھی رنگی ہوئی تھی۔ ٹانگوں اور دُم کو جنگ کے دوران دشمن کو مارنے کی یاد میں رنگا گیا تھا گویا انہی کے خون نے گھوڑے کو اوپر سے نیچے تک سرخ رنگ میں نہلا دیا تھا۔

اگلی صبح مہمانوں کا یہ قافلہ رنجیت سنگھ کی خدمت میں حاضری دینے گیا۔ مہاراجا شہر سے باہر ایک مکان میں قیام پذیر تھا۔ مہاراجا نے ہاتھی پر بیٹھ کر اپنے مہمانوں کا استقبال کیا۔ اپنی ڈائری میں فین نے رنجیت سنگھ کی کوئی خاص اچھی تصویر کشی نہیں کی۔ ''شیر پنجاب ایک منحنی سا، غیر اہم 55 برس کا بوڑھا ہے (جو کہ اپنی عمر سے دس برس زیادہ دکھائی پڑتا ہے) تاہم پھر بھی جیسا کہ ہم سنتے آئے ہیں وہ اس سے کہیں زیادہ صحتمند اور مضبوط جسم کا مالک دکھائی دیا۔ وہ سادہ کپڑوں میں ملبوس تھا اور سر پر سبز رنگ کی کشمیری پگڑی پہنی ہوئی تھی۔ اس نے کوٹ اور دستانے بھی چڑھائے ہوئے تھے۔ اس کے سینے اور گردن کے گرد بڑے بڑے موتیوں کا ایک ہار لپٹا ہوا تھا جو اس کے بازوؤں اور ٹانگوں کے گرد موجود تھا۔ اسی طرح اس کے بازوؤں کے گرد بڑے بڑے ہیروں کی ایک اور لڑی بھی لٹک رہی تھی۔ سکھوں کی مخصوص پگڑی پہنے (جو کہ اس خوبصورت نسل کے حسن کو گہنا دیتی ہے) مہاراجا ایک بدہیت اور معمولی شخص دکھائی دے رہا تھا ایک ایسا انسان جس کی زندگی کا مقصد عیاری اور ہیرا

پھیری ہو، تاہم پگڑی کے بغیر مہاراجا ایسا نہیں دکھتا۔اس کی اکلوتی آنکھ سے (جو کہ دھندلی اور خون کے دھبوں سے بھری ہوئی تھی) اس کی قوتِ ارادی جھلک رہی تھی جس کی مدد سے اس نے اپنی بے قابو اور غیر مہذب رعایا کو اطاعت پر مجبور کیا ہوا تھا۔''

اگلی صبح برطانوی مہمانوں کو مہاراجا کے دربار لایا گیا جہاں تمام درباری موجود تھے۔''مہاراجا کے درباریوں کے لباس اور جواہرات انسانی تصور سے بڑھ کر تھے؛ اس نظارے کا موازنہ اطالوی اوپیرا سے کیا جا سکتا ہے۔وزیر کا بیٹا (ہیرا سنگھ خاص طور پر اس روز تمام لوگوں کا منظور نظر تھا) حقیقتاً ہیروں کا بڑا سا ڈھیر دکھائی دے رہا تھا؛ اس کی گردن، بازو، کلائیاں، ٹانگیں سب ہیرے، زمرد، نیلم، موتی اور مرجان کے بنے ہوئے گلوبند، بازوبند اور کڑوں سے سجے ہوئے تھے اور یہ بتانا مشکل تھا کہ ان زیورات کے درمیان کوئی اور چیز واقع ہے یا نہیں۔'' مہاراجا بہت خوش دکھائی دے رہا تھا۔''بوڑھا راجکمار تیز تیز بول رہا تھا اس نے ہر موضوع پر بات کی اور طرح طرح کے سوالات کیے۔ان سوالات میں اکثر ایسے تھے جن سے اس کے تیز ذہن نپی تلی سوچ کا پتا چلتا تھا۔کمپنی کی فوج کی تعداد، سرہنری اب تک کتنی جنگوں میں حصہ لے چکے ہیں، مختلف رجمنٹوں سے جڑے انگریز افسروں کی تعداد اور ہمارا (انگریزوں کا) توپخانہ چلانے کا طریقہ۔''

شام کے وقت مہمان 'نیوندرا' کی رسم میں جس میں تحائف دیے جاتے ہیں موجود تھے۔یہ رسم ایک سردار کے گھر پر ہوئی جہاں بہت ہلا گلا اور ناچ گانا کیا گیا۔فین کے مطابق اس رسم میں انھیں تقریباً 17,000 پاؤنڈ مالیت کے تحائف دیے گئے۔

دولہا اور اس کے ساتھ مہمان امرتسر سے روانہ ہوئے اور دوپہر تک ایک بڑی بارات کی صورت اختیار کر لی۔بارات میں ستر ہاتھی اور 600 گھڑ سوار موجود تھے۔مہاراجا نے بھکاریوں کے مجمع پر سونے اور چاندی کے سکوں کی بارش کر دی۔فین لکھتا ہے 'اس موقع پر جمع ہونے والے مجمع کو دیکھ کر عقل دنگ رہ گئی۔میرے خیال میں چھ سے سات ہزار لوگ اس ہجوم میں شامل تھے اور ہر ایک کی یہی کوشش تھی کہ کسی طرح مہاراجا کے ہاتھی کے قریب ہو کر اس کی سمت دیکھ سکے'۔دلہن کی رہائش گاہ پر پہنچنے کے بعد مہمان اپنی اپنی سواریوں سے اترے اور ایک بڑے سے ٹینٹ میں جا کر بیٹھ گئے۔''اب پہلی بار دولہا کا تعارف کرایا گیا۔اس نے اپنا چہرہ موتیوں اور سونے کی تاروں کے بنے سہرے سے ڈھانپا ہوا تھا۔دولہا ایک کمزور، دبلا پتلا اور چیچک کے داغوں سے بھرے چہرے والا لڑکا ہے تاہم وہ اچھے طور طریقوں والا ذہین شخص دکھائی دیتا ہے''۔

جوتشیوں کے دیئے ہوئے وقت کے مطابق شادی کی رسم ٹھیک نو بجے ادا کی گئی۔مہمان رنجیت سنگھ کے خیمے میں داخل ہوئے جہاں وہ معمول کے مطابق درباریوں میں گھرا بیٹھا تھا اس کے سامنے سونے کے کام والی ایک اونچی تپائی رکھی تھی جس پر اس نے گھٹنے ٹکائے ہوئے تھے۔اس کا لباس ہمیشہ کی طرح ایک ہی تھا (سبز کشمیری لباس) تاہم اس مرتبہ اس میں ایک انفرادیت شامل تھی جیسا کہ میں پہلے بتا چکا ہوں موتیوں سے اس لباس کو سجایا گیا تھا۔وہ دنیا کا صاف ستھرا ترین شخص نہیں تھا اور میرے خیال میں اس کے لباس کا کوئی حصہ کبھی کسی تقریب میں تبدیل نہیں ہوا۔اس کی ایک بڑی عجیب عادت تھی کہ وہ

ایک پاؤں میں جراب پہنتا تھا اس کا یہ پاؤں اعصابی کمزوری کی وجہ سے کانپتا تھا اور اس کے خیال میں موزہ پہننے سے یہ گرم رہے گا۔

'مہاراجا نے مہمانوں کو اس تیز شراب کے جام پیش کیے جو وہ خود پی رہا تھا۔ وہ نہایت برق رفتاری سے جام تقسیم کروا رہا تھا اور اس بات کا خاص خیال رکھے ہوئے تھا کہ کسی مہمان کا پیالہ خالی نہ ہونے پائے۔ اس نے اس بات کو بھی یقینی بنایا کہ ہم خوشی خوشی اپنی خوابگاہوں تک پہنچ جائیں اور اس طرح میری زندگی کے تھکا دینے والے دنوں میں سے ایک کا اختتام ہوا۔ جو شراب مہاراجا پیتا ہے اگر دوسرے لوگ پئیں تو ایک ہفتے میں مر جائیں۔ یہ ہماری وائن یا دیگر شرابوں سے کہیں زیادہ تیز نشہ آور ہے اتنی تیز کہ اس کی معمولی مقدار حلق سے اتارتے ہوئے ہماری آنکھوں میں آنسو آ گئے، پھر بھی ہم نے مختلف مواقع پر اس کو جام پیتے دیکھا۔ ہم نے اس کا پیالہ کبھی آدھا یا اس سے کم بھرا نہیں دیکھا۔ تعجب ہے اس پر اس شراب کا کبھی اثر نہیں ہوا۔"

اس کے بعد دلہن کے جہیز کے سامان کی نمائش دکھائی گئی۔ ہاتھیوں کے سوا جو کہ گیارہ کی تعداد میں موجود تھے جہیز میں ہر قسمی مویشی ایک سو ایک کی تعداد میں موجود تھے؛ گائے، بھینسیں، اونٹ، گھوڑے، بیل وغیرہ۔' پانچ سو نہایت عمدہ قسم کی کشمیری شالیں؛ ہیرے جواہرات اور قیمتی پتھر بھی جن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا مشکل ہے جہیز کے سامان کا حصہ تھے۔ دوسری چیزوں کے علاوہ اعلیٰ قسم کی چاندی کے بنے مقامی ڈنر سیٹ اور دیگر اشیا بھی جہیز کی نمائش میں رکھی گئی تھیں۔

رات کی محفل میں جس میں خواتین کو بھی مدعو کیا گیا تھا پورے شادی ہال میں چراغاں کیا گیا تھا۔ "عمارت کے اس کھلے حصے سے جہاں دربار لگا ہوا تھا اور ہم بیٹھے تھے یہ سب نظارہ یوں محسوس ہو رہا تھا گویا سٹیج پر پریوں کی داستان کھیلی جا رہی ہو اور کئی مرتبہ میرے ذہن میں یہ خیال پیدا ہوا کہ حوریں کب ظاہر ہوں گی۔ جب تک خواتین موجود رہیں کوئی شراب نہیں دی گئی مگر جیسے ہی وہ واپس ہوئیں بڈھے شیر نے ایک مرتبہ پھر جنرل ہنری کو شراب پیش کرنا شروع کر دی ساتھ میں وہ طرح طرح کے سوالات بھی پوچھے جا رہا تھا۔"

دو روز بعد رنجیت سنگھ نے انگریز مہمانوں کے خیموں کا دورہ اور سپاہ کا معائنہ کیا۔ 'خیمے میں داخل ہوتے ہی اس نے سوالات پوچھنا شروع کر دیئے ـــ ہندوستان کی فوج کی کیا تعداد ہے؟ کیا ہمارے خیال میں ایران میں روسی مفادات سے انگریزوں کو نقصان پہنچ رہا تھا؟ کیا ایسا نہیں تھا کہ اگر روس ایران میں داخل ہو جائے تو اسے وہاں سے مطلوبہ امداد مل جائے؟ وغیرہ وغیرہ۔ یہ اور اس طرح کے بہت سے سوالات نہایت انہماک سے پوچھے جاتے اور ان میں سے اکثر ایسے ہوتے جن کا جواب دینا بہت مشکل ہوتا۔ یہ سوالات اس طرح سے کیے جاتے کہ کسی کو اکتاہٹ کا احساس تک نہ ہوتا۔

تحائف دیکھتے ہوئے (ایک ہاتھی، آٹھ گھوڑے، ایک دونالی بندوق، اکیاون توپیں) رنجیت سنگھ نے ان کا بغور معائنہ کیا اور انھیں چلانے والوں سے تفصیلاً سوالات کیے۔

اگلے روز سر ہنری فین نے سکھ سپاہ کا معائنہ کیا۔' ان میں سے کئی نہایت ہی شاندار فوجی وردیاں زیب تن کیے ہوئے

تھے اور انھیں دیکھ کر یوں گماں ہوتا تھا گویا آپ رچرڈ شیر دل کی سپاہ کے جوانوں کی تصاویر دیکھ رہے ہو اور دیکھنے والے کو یوں لگے گویا وہ واپس صلیبی جنگوں کے دور میں چلا گیا ہے۔ زرد اور قوسِ قزح کے رنگوں والی وردیوں میں ملبوس یہ نوجوان صلاح الدین کی فوج کے سپاہی معلوم پڑتے تھے۔

مہمانوں کو شاہی جواہرات دکھائے گئے جن میں کوہِ نور بھی شامل تھا۔ شام میں ایک بار پھر ناچ گانے، مے نوشی اور آتش بازی کا اہتمام کیا گیا۔ مہمانوں کے پنجاب میں قیام کے دوران موسمِ بہار کے رنگوں کا زبردست تہوار ہولی آن پہنچا۔ برطانوی کمانڈر انچیف کو اپنا قیام طویل کرنے پر قائل کیا گیا جو تشی پہلے ہی ان دنوں کے دوران اس کی روانگی کو منحوس قرار دے چکے تھے۔ سرہنری فین مہاراجا کے خیمے کی طرف چلا گیا۔ فین لکھتا ہے: ''ہمیں نہایت ہی شاندار نظارہ دیکھنے کو ملا۔'' مہاراجا حسبِ معمول درباریوں کے نرغے میں گھرا ہوا تھا تاہم پہلی مرتبہ ہم نے اس کے گرد تیس یا چالیس رقاصاؤں کو تیر کمان اٹھائے جنگی انداز میں کھڑے دیکھا۔ تیر کمانوں میں لگے ہوئے تھے اور کمانیں کھچی ہوئی تھیں ہمارے داخل ہوتے ہی انھوں نے تیروں کا رخ ہماری طرف کر لیا گویا دشمن کا سامنا کر رہی ہوں اب یہ معلوم نہیں کہ اگر اصل میں دشمن کا سامنا کرنا پڑ جائے تو وہ یہ بہادرانہ انداز قائم رکھ سکیں گی یا نہیں۔ مگر بوڑھے مہاراجا کی موجودگی میں وہ ایسی باتیں کہہ رہی تھیں اور اس طرح کی حرکتیں کر رہی تھیں جن کی مہاراجا کا سب سے سرچڑھا درباری بھی جرأت نہ کر سکے۔''

ہولی کا تہوار سب سے زیادہ رنگین جشن تھا۔ ہر کرسی کے سامنے چھوٹی چھوٹی ٹوکریاں ایک دوسرے کے اوپر ڈھیر کے انداز میں رکھی گئی تھیں۔ ان میں چھوٹی چھوٹی بے لچک گیندیں رکھی ہوئی تھیں جن میں سرخ رنگ کا سفوف بھرا تھا اور ان کے ساتھ موجود پیالیوں میں گہرے زرد رنگ کا زعفران رکھا ہوا تھا۔ جونہی ہم اپنی نشستوں پر بیٹھے مہاراجا نے ایک نلکی اٹھائی جس میں وہ سفوف بھرا ہوا تھا اور اسے سرہنری کے گنجے سر پر انڈیل دیا وزیر اعظم نے ایک قدم آگے بڑھ کر سونے اور چاندی کے ورق لیے جن میں رنگدار سفوف بھرا تھا اور انھیں سرہنری کے تمام جسم پر رگڑنا شروع کر دیا۔

'ہم سب کا ہنس ہنس کر برا حال تھا جبکہ کمانڈر ان چیف ان سب رسومات کو خندہ پیشانی سے برداشت کر رہے تھے۔ ہم سب کو سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ اس ساری حرکت کا کیا مطلب ہے۔ ہماری خوشی بلکہ یوں کہنا چاہئے کہ میری خوشی اس وقت غم میں تبدیل ہوگئی جب ایک لمبی داڑھی والے سکھ نے رنگوں سے بھری گیند اٹھائی اور تاک کر میری آنکھ پر ماری ایک اور نوجوان نے زعفران سے بھری گیند سے میری خاطر تواضع کی۔ رنجیت سنگھ یہ سب دیکھ کر اتنا ہی خوش ہو رہا تھا جتنا کہ کوئی اور۔ چند درباری اس کی طرف بھی گیند سے نشانہ بازی کر رہے تھے رنجیت سنگھ نے اسی اثنا میں ایک گیند اٹھائی اور افغان سفیر کا نشانہ لیا جو اسی وقت خیمے کے اندر داخل ہوا تھا۔ وہ بیچارہ بہترین کپڑے پہن کر اور اپنی داڑھی کو نہایت سلیقے سے سنوار کر وہاں آیا تھا اسے ذرا بھی اندازہ نہیں تھا کہ اس کے ساتھ کیا ہونے جا رہا ہے۔ رنگوں بھری گیند لگتے ہی اس کے چہرے پر سفارتکاروں کی

مخصوص سنجیدگی اُمڈ آئی۔ سرخ رنگ اس کی آنکھوں کی جانب اچھالا گیا تھا جبکہ اس کی داڑھی مکمل طور پر زعفرانی رنگ میں رنگی جا چکی تھی۔ ہم سب نے اپنا ''اسلحہ'' اس پر خالی کرنا شروع کر دیا پہلے اس کی ایک آنکھ بند ہوئی پھر دوسری یہاں تک اس کی تمام سفارتی سنجیدگی دھری کی دھری رہ گئی اور وہ سر پر پاؤں رکھ کر وہاں سے رفو چکر ہو گیا اس کے پیچھے قہقہوں کی گونج دیر تک اس کا تعاقب کرتی رہی۔'' یہ جنگ ایک گھنٹے سے زیادہ دیر تک جاری رہی جس کے دوران کمانڈر ان چیف یا خاتون باڈی گارڈز نے ہوش و خرد کا دامن تھامے رکھا اور جب تک ہم شاہی خیمہ سرا سے باہر نکلتے ہماری حالت ایسی ہو چکی تھی کہ لندن کے چمنیاں صاف کرنے والے بھی ہمیں اپنے قریب آنے کی اجازت نہ دیتے کہ کہیں ہم انھیں میلا نہ کر دیں۔''

ہولی ایک ایسا تہوار تھا جس کا رنجیت سنگھ کو ہمیشہ انتظار رہتا اور وہ اس بات کو یقینی بناتا کہ یہ ایک بڑا تماشا ہو۔

مہاراجا نے اپنے تمام انگریز مہمانوں کو الوداعی تحائف دیئے۔ کمانڈر ان چیف اور ملٹری سیکرٹری کو ''ستارۂ کوکب اقبال پنجاب'' دیا گیا اس اعزاز کا اعلان مہاراجا نے اسی برس کیا تھا۔ نوجوان فین مہاراجا سے الوداعی ملاقات کے وقت فرطِ جذبات سے رونے کے قریب تھا۔'' مجھے یقین ہے کہ جنرل فین اور ہمارے وفد کا ہر رکن اتنے اچھے مہربان شخص سے رخصت لیتے وقت اداس تھا ہم اسے اپنا 'بزرگ دوست' سمجھنے لگ گئے تھے۔'' فین پنجاب کی سیر کے حوالے سے آخر میں رنجیت سنگھ کو شاندار الفاظ میں خراجِ تحسین پیش کرتا ہے۔'' رنجیت سنگھ اپنے عوام میں ایک سخی آقا کے طور پر جانا جاتا ہے۔ وہ ہندوستان میں حکومت کرنے والے بہترین شہزادوں میں سے ایک ہے۔ اس کی اچھی فطرت اور دوستانہ رویے کی ایک مثال بچوں کے ساتھ اس کا مشفقانہ رویہ ہے (دو یا تین بچے ہر وقت اس کے آس پاس دربار میں گھٹنوں کے بل چلتے دکھائی دیتے ہیں) اور یہ کہ جب سے اس نے پنجاب پر قبضہ کیا یہاں بڑے سے بڑے جرم کے مرتکب شخص کو پھانسی کی سزا نہیں دی گئی۔''

20

سندھ کی فوج

دوست محمد جمرود کے معرکے کو افغانیوں کی فتح قرار دینے اور اپنے بیٹے پر نوازشات کی بارش کرنے اور اسے 'فاتح' کا لقب دینے کے باوجود خیبر کے قلعے کے قریب گیارہ ہزار افغانیوں کی لاشوں سے اٹھنے والے تعفن کو نہ روک سکا۔ ان لاشوں سے اٹھنی والی بو آس پاس کی پہاڑیوں اور وادیوں میں بسنے والے افغان خاندانوں کی ناک میں گھس گئی۔ بالا حصار کے قلعے، شب قدر اور جمرود میں ابھی تک دربار کا جھنڈا لہرا رہا تھا اور اب ان پہاڑی چٹانوں اور غاروں میں بھٹکتا ہوا نلوا کا بھوت لوگوں کو دہشت زدہ کرتا رہا۔

دوست محمد کے لیے ضروری ہو گیا تھا کہ اپنی ساکھ بحال کرے۔ شروع میں اس نے خوشامد کے ذریعے اپنا مقصد حاصل کرنے کی کوشش کی۔ اس نے مہاراجا کو لکھا: 'میں ہمیشہ سے یہ کہتا آ رہا ہوں کہ میری کامیابیوں کے پیچھے آپ کا ہاتھ ہے۔ میں آپ کا غلام تھا'۔ اگر دربار پشاور اس کے حوالے کر دے تو وہ نذرانہ ادا کرنے کو تیار ہے اور سرحدوں پر بھی کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ اس نے وعدہ کیا کہ اگر پنجاب اس کی تجویز سے اتفاق کر لے تو وہ انگریزوں کی طرف مڑ کر بھی نہیں دیکھے گا۔ لیکن اگر اس کی درخواست مسترد کر دی گئی تو اس کے پاس جنگ اور دوسری قوتوں کو مدد کے لیے پکارنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں ہوگا۔

''تنگ آمد بجنگ آمد، جب کسی شخص کو مجبور کر دیا جاتا ہے تو اس کے پاس لڑنے کے علاوہ کوئی چارہ نہیں بچتا''۔ 1

رنجیت سنگھ نے دوست محمد کی طرف سے پشاور کا تقاضا کرنے پر حیرت کا اظہار کیا۔ اس نے افغانیوں کو بتایا کہ انگریز سکھوں کے ساتھ اس معاہدے کے پابند ہیں کہ دریائے ستلج کے مغرب میں ہونے والی کسی بھی سرگرمی سے لاتعلق رہیں گے اور اس طرف کی ریاستوں کے معاملات میں مداخلت نہیں کریں گے۔ رنجیت سنگھ نے اپنی بات میں اضافہ کرتے ہوئے

کہا: ''انگریز اپنے وعدے کو پورا کرنے، ارادوں کے خلوص اور لمبے عرصے تک دوستی نبھانے کے باعث ساری دنیا میں قدر کی نگاہ سے دیکھے جاتے ہیں۔''

رنجیت سنگھ نے دوست محمد کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ امن کے قیام کا ٹھیکا صرف افغانیوں کے پاس نہیں۔ اگر وہ اس پر جنگ مسلط کر سکتے ہیں تو وہ بھی انھیں جنگ پر مجبور کر سکتا ہے۔ اگر دوست محمد کابل کے تخت پر امن اور چین کے ساتھ بیٹھا رہنا چاہتا ہے تو اسے چاہئے کہ دربار کی خدمت میں گھوڑوں اور خشک میوہ جات کا نذرانہ بھجوائے۔

ایک طرف رنجیت سنگھ اور دوست محمد لفظوں کی جنگ لڑ رہے تھے تو دوسری طرف ہندوستان کے گورنر جنرل نے الیگزنڈر برنز کو افغانستان روانہ کیا تا کہ دوست محمد کی ہمدردیاں حاصل کی جا سکیں۔ روس کی طرف سے افغانستان اور ایران میں اثر رسوخ قائم کرنے کی کوششوں نے انگریزوں کو افغانستان کی طرف دیکھنے پر مجبور کر دیا تھا۔ دوسری طرف سکھوں کو اپنی دوستی کا یقین دلانے کے لیے آکلینڈ نے رنجیت سنگھ کے نام خط میں لکھا، 'قدرت کی مرضی شاملِ حال رہی تو انگریز اور سکھ آخری دم تک متحد رہیں گے'۔ اس نے برنز کے دورۂ افغانستان کو مکمل طور پر تجارتی تعاون بڑھانے کی ایک کوشش قرار دیا۔

اُدھر برنز کو کابل میں کچھ خاص کامیابی نہیں ملی۔ اس کے خوشامدانہ الفاظ (جب بھی وہ دوست محمد سے بات کرتا تو دونوں ہاتھ باندھ کر اسے غریب نواز کہہ کر پکارتا) روسی سفارتکار ویکٹوف کی بھاری رقم کی پیشکش کے سامنے بالکل کھوکھلے ثابت ہوئے۔ دوست محمد نے انگریزوں کو اپنے تعاون کی قیمت بتا دی تھی: پشاور پر اس کی حکومت۔ انگریزوں کو اس کا مطالبہ منوانے کے لیے رنجیت سنگھ سے جنگ کرنا پڑتی۔ اب آکلینڈ کے سامنے دوست محمد اور رنجیت سنگھ میں سے ایک کا انتخاب کرنے کے علاوہ کوئی راستہ نہیں بچا تھا۔

اور اُس نے رنجیت سنگھ کا انتخاب کیا۔ اس نے دوست محمد کو بیدخل کرنے اور افغانستان کے تخت پر شاہ شجاع کو واپس لانے کے لیے رنجیت سنگھ سے مدد لینے کا فیصلہ کیا۔ اپریل 1838 میں برطانوی حکومت نے برنز کو افغانستان سے واپس بلوا لیا اور آکلینڈ نے ''باہمی دلچسپی کے امور'' پر تبادلہ خیال کے لیے رنجیت سنگھ سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا۔ 2

اِس مرتبہ گورنر جنرل رنجیت سنگھ کو 'ہمارا سب سے طاقتور اور قیمتی دوست کہہ کر پکار رہا تھا''3۔ مہاراجا نے فقیر عزیز الدین کو لارڈ آکلینڈ کے پاس خیر سگالی کے پیغام کے ساتھ بھیجا اور دربار اور برطانوی سرکار کے مابین پائیدار دوستی کے رشتے کی تجدید کی بات کی۔ اپنے پیغام میں رنجیت سنگھ نے کہا اسے بھی گورنر جنرل سے ملاقات کر کے خوشی ہوگی۔ فقیر عزیز الدین کے دورے کے فوری بعد سرکار برطانیہ کی طرف سے جوابی وفد پنجاب بھیجا گیا۔ ڈبلیو ایچ میکناٹن اس وفد کی سربراہی کر رہا تھا۔ برطانوی سفارتکاروں کی یہ ٹیم ادینہ نگر میں مہاراجا کا انتظار کرنے لگی۔ کیپٹن ویڈ اور ڈاکٹر میک گریگر بھی اسی وفد میں شامل تھے۔ ان کے علاوہ گورنر جنرل کا ملٹری سیکرٹری ڈبلیو جی اوسبارن بھی اس وفد میں شامل تھا۔ یہ ڈبلیو جی اوسبارن ہی ہے جس کی ڈائری سے ہمیں رنجیت سنگھ اس کے دربار اور قریبی لوگوں کے بارے میں دلچسپ معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ 4

اوسبارن مہاراجا کے ساتھ پہلی ملاقات کا ذکر کچھ یوں کرتا ہے: ''شیرِ لاہور ایک سنہری کرسی پر چوکڑی مار کر بیٹھا تھا۔ بیش قیمت موتیوں کی ایک لڑی اس نے کمر کے گرد پہنی تھی اور طلسماتی کوہِ نور ہیرا اس کے بازو پر جگمگا رہا تھا۔ اس کے علاوہ اس نے کوئی بیش قیمت پتھر جسم پر نہیں سجایا تھا۔ مہاراجا سادہ سفید لباس پہنے ہوئے تھا اور اس کی اکلوتی آنکھ سے نکلنے والی روشنی کوہِ نور ہیرے کی چمک کا مقابلہ کر رہی تھی۔ مہاراجا کی نشست کے گرد اس کے درباری چوکڑی مار کر بیٹھے تھے جبکہ دھیان سنگھ اپنے آقا کی کرسی کے پیچھے کھڑا تھا۔ اگرچہ رنجیت سنگھ کا مردانہ وجاہت سے کوئی واسطہ نہیں تھا پھر بھی وہ اپنے گرد خوبصورت لوگوں کا جمگھٹا دیکھ کر فخر محسوس کرتا تھا۔ مجھے یقین ہے پورے یورپ یا مشرق کے کسی دوسرے ملک میں ایسا دربار نہیں ہوگا جہاں اتنے وجیہہ درباریوں کا اکٹھ ہو جیسا کہ رنجیت سنگھ کے مردانہ وجاہت کے پیکر سکھ سردار۔''5

اوسبارن مہاراجا کے تجسس بھرے سوالوں اور اس کی دلچسپی کے موضوعات پر بھی روشنی ڈالتا ہے۔ 'مہاراجا جس برق رفتاری سے سوالات کر رہا تھا اور جس تیزی سے وہ ایک موضوع سے دوسرے موضوع پر بات کر رہا تھا اس کا اندازہ لگانا ہی مشکل ہے۔ 'کیا آپ شراب پیتے ہیں؟'' کتنی؟'' کیا آپ نے وہ شراب چکھی جو میں نے گزشتہ روز بھجوائی تھی؟'' اُس میں سے کتنی پی؟'' آپ اپنے ساتھ کس طرح کا چھوٹا توپخانہ لائے ہیں؟'' کیا اس میں گولہ بارود بھی شامل ہے؟'' اگر ہیں تو کتنے گولے؟'' کیا آپ کو گھڑسواری کا شوق ہے؟'' آپ کس ملک کے گھوڑوں کو سواری کے لیے ترجیح دیتے ہیں'' کیا آپ فوج میں ہیں؟'' آپ کو گھڑسوار دستے پسند ہیں یا پھر توپخانے کے سپاہی؟''' کیا لارڈ آکلینڈ وائن (شراب) پیتا ہے؟'' ''وہ کتنے گلاس چڑھا جاتا ہے؟''' صبح میں پیتا ہے؟''' کمپنی بہادر کی فوجی طاقت کا راز کیا ہے؟''' کیا وہ بہتر طریقے سے منظم ہیں؟''6 وغیرہ وغیرہ۔

وفد کے اراکین کو اگلے چند دنوں میں رنجیت سنگھ کی طبیعت اور مزاج کو قریب سے دیکھنے کا موقع ملا۔ وہ صبح کے وقت لگنے والے درباروں موجود ہوتا، پریڈ کے وقت فوجی دستوں کا معائنہ کرتا۔ برطانوی وفد میں شامل ارکان مہاراجا کے قریب بیٹھ کر اُسے کشمیری رقاصاؤں کو جو فوجی وردی میں ملبوس تھیں تاڑتے اور اپنے سونے کے بنے پیالوں سے شراب پیتا ہوا دیکھتے۔ بالآخر اوسبارن یہ لکھنے پر مجبور ہو گیا'' جتنا زیادہ میں رنجیت سنگھ کو دیکھتا ہوں وہ اتنا ہی غیر معمولی دکھائی دیتا ہے۔''

''ایک مکار اور ناقابلِ بھروسا شخص ہونے کے باوجود وہ اپنی عوام کا اعتماد جیتنے اور انھیں اپنا وفادار بنانے میں کامیاب ہو گیا۔ یہ سب اس نے دوسروں کا دماغ پڑھنے کی حیرت انگیز صلاحیت کی مدد سے کیا ہے۔ وہ نہ صرف دوسروں کا دماغ پڑھ سکتا ہے اس کو یہ خوبی بھی حاصل ہے کہ اپنے دماغ میں آنے والی سوچ کو دوسروں سے چھپا سکے۔ روزانہ اُسے لاپروائی اور خاموشی کے ساتھ دربار میں پڑھی جانے والی مختلف رپورٹیں سنتے دیکھنا ایک دلچسپ نظارہ ہے۔ یہ رپورٹیں سننے کے فوری بعد وہ اپنی رائے کا اظہار کرتا ہے نہ ہی دوسروں کو یہ اندازہ لگانے دیتا ہے کہ کسی خاص موضوع پر وہ کیا فیصلہ لینے جا رہا ہے۔ مذہبی معاملات میں وہ آزاد خیال (متشکک) ہے اور یہ بتانا بہت مشکل ہے کہ بعض معاملات میں اس کی توہم پسندی واقعی حقیقی ہے

یا اپنے کمزور عقیدہ عوام کو خوش کرنے کی غرض سے یہ لبادہ اوڑھا گیا ہے۔"[7]

اپنی آمد کے دو روز بعد جب دونوں طرف سے باہمی خیر سگالی کے جذبات پر مبنی تقاریر کر لی گئیں اور دربار کی طرف سے مہمانوں کی خوب تواضع ہو چکی تو میکناٹن نے اپنے آنے کا مدعا بتایا۔ اس نے دربار میں آکلینڈ کا پیغام پڑھ کر سنایا جس میں شاہ شجاع کو افغانستان کے تخت پر بحال کرنے کے منصوبے کے خدوخال دیئے گئے تھے۔ آکلینڈ چاہتا تھا کہ دربار اس مہم کو اپنے طور پر آگے بڑھائے۔ اسے انگریزوں کا مکمل تعاون حاصل ہوگا۔ اوسبارن دربار کا ردعمل یوں بیان کرتا ہے:

"دھیان سنگھ نے اس تجویز پر واضح طور پر ناگواری کا اظہار کیا اگرچہ اسے بھرے دربار میں اس تجویز کی کھلم کھلا مخالفت کرنے کی جرات نہیں ہوئی پھر بھی بار بارنفی میں سر ہلانے اور اس کی باڈی لینگویج سے ظاہر ہو رہا تھا کہ اسے ہمارے ساتھ کسی قسم کے اتحاد پر شدید تحفظات ہیں۔"[8]

رنجیت سنگھ نے اپنے وزیراعظم کے خیالات نظر انداز کرتے ہوئے اس مہم پر اپنی رضامندی ظاہر کی۔ رنجیت سنگھ کی فوجی طاقت اتنی تھی کہ وہ اس کو کامیابی سے مکمل کر سکتا تھا۔ اس کے پاس پیدل دستوں کی 31 رجمنٹیں، گھڑسواروں کی نو، 288 چھوٹی بڑی توپیں اور 11,800 سوار موجود تھے[9]۔ جب دربار ختم ہو گیا تو اس کے وزراء نے اسے اپنے فیصلے پر نظرِ ثانی کرنے کو کہا۔ صرف دو وزیر فقیر عزیز الدین اور بھایا رام سنگھ ایسے تھے جنھوں نے رنجیت سنگھ کے فیصلے کی حمایت کی۔ رنجیت سنگھ کے فیصلے کے حق اور مخالفت میں بحث پس پردہ بھی جاری رہی۔

دس روز بعد مہاراجا اور اس کے انگریز مہمان ادینہ نگر سے لاہور کے لیے روانہ ہو گئے۔ انگریز مہمانوں کا شالیمار باغ میں استقبال کیا گیا جہاں الیگزنڈر برنز اور ڈاکٹر فورڈ بھی موجود تھے۔ یہ دونوں کابل سے تازہ تازہ لوٹے تھے۔ برنز نے مہاراجا کو اشتعال دلانے کے لیے دوست محمد کے اُن الفاظ کا ذکر کیا جن میں اس نے مہاراجا کو یاد کیا تھا: "میں اُس جنگلی جانور کو کوئی حقیقی نقصان تو نہیں پہنچا سکتا مگر میں اس کے ساتھ حتمی طور پر کوئی معاملہ کرنے سے پہلے اسے (ذہنی) اذیت پہنچاتا رہوں گا۔" برنز کی چال کامیاب ہو گئی اور رنجیت سنگھ نے دوست محمد کے خلاف مہم میں انگریزوں کا ساتھ دینے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ انگریز وفد نے اس پر فوراً معاہدے کی دستاویز تیار کی۔ دھیان سنگھ نے مہاراجا کی منت کی کہ وہ معاہدے پر دستخط کرنے میں جلدی نہ کرے۔ اس پر رنجیت سنگھ تذبذب کا شکار ہو گیا۔ اوسبارن لکھتا ہے: "بوڑھا شیر آزردہ خاطر ہو گیا اور معاہدے پر دستخط کرنے سے انکار کر دیا۔ اس نے اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ ان تمام مراعات کا ازسرِنو جائزہ لینا چاہتا ہے جو معاہدے کے تحت انگریزوں کو دینا ہوں گی اور اس کے لیے ہیڈ کوارٹرز سے رابطہ کرنا ضروری ہوگا۔"

ایک طرف مہاراجا اور انگریز وفد کے درمیان کچھ دو کچھ لو کا سلسلہ چل رہا تھا دوسری طرف فقیر عزیز الدین اور بھایا رام سنگھ نے خفیہ طور پر یہ معاملہ دھیان سنگھ کے ساتھ اٹھایا۔ ان کی دلیل یہ تھی کہ اگر دربار نے انگریزوں کا ساتھ نہ دیا تو وہ تنِ تنہا یہ مہم سر کرنے نکل کھڑے ہوں گے اور ایسا شخص افغانستان کے تخت پر بٹھائیں گے جو مکمل طور پر ان کا احسان مند ہوگا۔ یہ

دربار کے اپنے مفاد میں ہے کہ افغانستان پر انگریزوں کی کٹھ پتلی کو حکومت نہ کرنے دے۔ اس دلیل نے رنجیت سنگھ کو بھی متاثر کیا۔ اوسبارن لکھتا ہے: ''29 جون کی صبح فقیر عزیز الدین ہماری ملاقات کو آیا اور ہمیں یہ بتا کر خوش کر دیا کہ ہم واپس شملہ جانے کی تیاری کریں کیونکہ مہاراجا نے مزید کسی تاخیر کے معاہدے پر دستخط کرنے کا فیصلہ کر لیا ہے''۔ دوست محمد کے خلاف انگریز اور سکھ مشترکہ کارروائی کریں گے۔

میکناٹن کے وفد نے اگلے پندرہ روز تک رنجیت سنگھ کی مہمان نوازی کے مزے لوٹے۔ مون سون کی بارشوں نے خشک اور بنجر زمین کو سرسبز و شاداب کر دیا تھا۔ یہ مے نوشی، رقص و سرود اور رنگ رلیاں منانے کا بہترین موقع تھا۔ تاہم ڈاکٹروں نے رنجیت سنگھ کو مے نوشی سے سختی سے منع کیا ہوا تھا اور پہلی بار وہ ان کی ہدایت پر عمل کر رہا تھا۔ لیکن بقول اوسبارن شراب سے دوری کے باوجود مہاراجا کی طبیعت میں کوئی ملال تھا نہ ہی اسے اس خبر نے پریشان کیا کہ سرحدوں پر اس کی فوج کو پسپائی ہوئی ہے۔ ''کبھی کبھار کی چھوٹی موٹی پسپائی جوانوں اور افسروں کو اچھا سبق سکھا جاتی ہے''۔ جب اوسبارن نے مہاراجا سے اتنے یقین اور خود اعتمادی کی وجہ دریافت کی رنجیت سنگھ نے اسے بتایا کہ اس کے یقین اور اعتماد کی وجہ اس کا یہ نظریہ ہے کہ سکھ مشرق کی دلیر ترین قوم ہے۔

میکناٹن معاہدے پر شاہ شجاع کے دستخط لینے کے لیے لدھیانہ روانہ ہو گیا۔ شاہ شجاع نے بغیر کسی ہچکچاہٹ کے معاہدے پر دستخط کر دیئے۔ اس حقیقت کے باوجود کہ معاہدے کی دستاویز کی حیثیت کاغذ کے پرزے سے زیادہ نہیں تھی اور اس پر کیا گیا دستخط مقصد کے حصول کا راستہ تھا نہ کہ بذاتِ خود مقصد۔ وہ کابل کا تخت ہر قیمت پر واپس لینا چاہتا تھا۔

رنجیت سنگھ آکلینڈ کے ساتھ اپنی ملاقات کو روپر سے بڑا ''تماشا'' بنانا چاہتا تھا[10]۔ اس ملاقات سے پہلے ایک اچھی بات یہ ہوئی کہ مہاراجا کی سب سے چھوٹی بیوی جنداں کے (جس نے بعد ازاں بدقسمتی سے سکھ سلطنت کے زوال میں اپنا کردار ادا کیا) ہاں بیٹا پیدا ہوا۔ یہ مہاراجا کا ساتواں بیٹا تھا۔ سوہن لال کے مطابق برج حوت کے ملاپ والے برے شگون کے زیر اثر پیدا ہونے والے اس لڑکے کا نام دلیپ سنگھ رکھا گیا۔

نومبر 1838 کے آخری ہفتے میں فیروز پور کے مقام پر یہ ملاقات طے پائی۔ رنجیت سنگھ نے انگریز فوجی دستوں کا معائنہ کرنا تھا جبکہ گورنر جنرل نے دربار کے ان دستوں کو دیکھنا تھا جنھوں نے برطانوی فوج کے ہمراہ افغان لشکر کشی کے لیے جانا تھا۔ اس متحدہ لشکر کو سندھ کی عظیم تہذیب کی فوج کا نام دیا گیا۔

ملاقات سے ایک ماہ قبل ہی اس لشکر کشی کی بڑی وجہ دم توڑ گئی۔ ایرانی لشکر جس نے ہرات کا محاصرہ کیا تھا اور جس کی وجہ سے افغانستان میں ایرانی، روسی دراندازی کا خطرہ پیدا ہو گیا تھا نے اچانک محاصرہ ختم کر دیا۔ انگریز پھر بھی افغانستان پر قبضے کے منصوبے کو پورا کرنے پر تلے ہوئے تھے۔ اگر اس ملک کو روسیوں سے محفوظ کرنا ہے تو پھر دنیا کی باقی قوموں سے کیوں نہ محفوظ کیا جائے؟ انگریزوں کی بات تو سمجھ آتی ہے مگر دربار نے اپنی پالیسی کیوں نہیں بدلی یہ ایک معمہ ہے؟ شاید اس لیے کہ

افغانستان میں ایسے حکمران کو لانا جو دربار کا احسان مند بھی ہو ایک ایسے حکمران کی نسبت بہتر تھا جو محض انگریزوں کی کٹھ پتلی ہو۔ عظیم سندھ کے اس لشکر نے دو اطراف سے افغانستان پر حملہ کرنا تھا۔ کرنل شیخ بسوان کی سربراہی میں پنجابی فوج نے خیبر کے قلعے کی طرف سے حملہ آور ہونا تھا۔ شاہ شجاع کا لڑکا شہزادہ تیمور اس مہم میں افغانوں اور پٹھانوں کے ہمراہ تھا کیپٹن وِیڈ نے انگریز اور پنجابی لشکر کے درمیان رابطہ افسر کی ذمہ داریاں نبھانا تھیں۔ برطانوی دستوں نے سندھ کے راستے سفر کر کے کابل، قندھار اور غزنی تک پہنچنا تھا۔ شاہ شجاع نے برطانوی دستوں کے ساتھ ہونا تھا۔ دونوں فوجوں نے کابل کے مقام پر یکجا ہونا تھا۔

آکلینڈ اور اس کے افسروں نے برطانیہ کے زیرِ اثر پنجاب میں رنجیت سنگھ کے لیے بہت زیادہ احترام کے جذبات دیکھے۔ لدھیانہ میں گورنر جنرل نے ان چھوٹی توپوں کا معائنہ کیا جو رنجیت سنگھ کو اس مہم کے لیے پیش کی جانا تھیں۔ ان توپوں پر پنجاب کا ستارہ کندہ تھا اور رنجیت سنگھ کی زندگی اور کامیابیوں کا ذکر لکھا ہوا تھا۔ گورنر جنرل کی بہن ایملی ایڈن لکھتی ہے:

''ہزاروں سکھ ان چھوٹی توپوں کا نظارہ کرنے آتے ہیں اور ان کے سامنے اس طرح آداب بجالاتے ہیں گویا یہ توپیں نہ ہوں خود رنجیت سنگھ ہو''۔ 11

فقیر عزیز الدین نے آک لینڈ اور اس کے وفد کا فیروز پور میں استقبال کیا۔ جب لارڈ آکلینڈ نے کہا وہ مہاراجا سے ملاقات کا منتظر ہے تو فقیر عزیز الدین کا کہنا تھا: 'جہاں ایک آفتاب کی چمک سے افق جگمگا اٹھتا ہے دو آفتاب ایک جگہ اکٹھے ہو جائیں تو ان کی روشنی سے عام آدمی کی آنکھیں چندھیا جائیں گی'۔ انگریز وفد اس جواب پر مسکرانے لگا۔ 'مہاراجا اپنے ساتھ کون سی فوج لا رہا ہے؟' لارڈ آکلینڈ نے دریافت کیا اور جب فقیر عزیز الدین سے کوئی جواب نہ بن پڑا تو لارڈ آکلینڈ نے کہا وہ تو صرف پنجابیوں کی پریڈ دیکھنا چاہتا ہے۔ اس پر فقیر عزیز الدین نے سکون کا سانس لیتے ہوئے کہا ''ان شاءاللہ''۔ 12

پہلی ملاقات کے لیے 29 نومبر کی تاریخ طے پائی۔ اس روز رنجیت سنگھ نے صبح کا وقت عبادت میں گزارا اور گرنتھ صاحب کے حضور بڑی خیرات پیش کی یہ سب کرنے کے بعد وہ اپنے خیمے سے برآمد ہوا۔ فین اس سارے نظارے کی زبردست منظر کشی کرتا ہے: ''مہاراجا کے استقبال کرنے والوں کا جوش و جذبہ دیدنی تھا۔ اوپر بلندی سے دیکھنے پر یوں معلوم ہو رہا تھا کہ ایک سوگز کے میدان میں تقریباً اتنے ہی ہاتھی موجود تھے۔ لوگ حلق کے بل چلا رہے تھے؛ ہاتھی چنگھاڑ رہے تھے اور یوں لگ رہا تھا کہ ہاتھیوں پر نصب تختے ساتھ والے ہاتھی پر موجود شخص کی آنکھ نکال دیں گے؛ تین گز کے فاصلے پر توپیں چلائی جا رہی تھیں؛ شور شرابا اتنا زیادہ تھا کہ اس سے ہمارے ہاتھی بھی گھبرا گئے۔''

''لیکن جو آگے ہونے جا رہا تھا اس کے سامنے یہ سب شور شرابا اور بدانتظامی تو کچھ بھی نہیں تھی۔ گورنر جنرل کے خیمے کے داخلی دروازے پر عجیب سی بھگدڑ مچی ہوئی تھی۔ مناسب انتظام نہ ہونے کے باعث ہر شخص، چاہے اس کا تعلق گورنر جنرل کے حفاظتی دستے سے ہو یا وہ کمانڈر ان چیف کی ڈیوٹی پر مامور ہو چاہتا تھا کہ وہ ایک نظر دربار کو دیکھ سکے۔ اس دھکم پیل میں

لوگ ایک دوسرے کو کہنیاں مار رہے تھے، دھکے دے رہے تھے یہاں تک کہ منتظمین نے یورپی فوج کا ایک دستہ منگوا کر اُس راستے کو لوگوں سے خالی کرایا جس سے گزر کر دربار میں بیٹھنے کے اصل حقداروں نے چل کر آنا تھا۔ اس طرح دربار میں بیٹھنے والے منتخب لوگوں کے لیے بمشکل ہجوم سے گزرنے کا راستہ بنایا جاسکا اور وہ اپنی اپنی نشستوں پر بیٹھنے کے قابل ہو پائے۔''

''میں بھی ان چند لوگوں میں سے تھا۔ میری ذمہ داری دربار کے دوران گورنر جنرل کی کرسی کے پیچھے کھڑا ہونا تھا۔ یہ کرسی رنجیت سنگھ کی کرسی کے قریب رکھی گئی تھی۔ رنجیت سنگھ نے اس محفل میں بھی بہت سے سوالات پوچھنا تھے تاہم پونا گھنٹہ تک سوال کرنے کے بعد اچانک وہ اٹھ کھڑا ہوا اور تحائف کا معائنہ کرنے کے لیے چل پڑا۔ یہ تحائف ہمیشہ کی طرح بندوقوں، پستولوں، تلواروں اور اس طرح کی دوسری چیزوں پر مشتمل تھے۔ ان سب چیزوں کا اپنی اکلوتی آنکھ سے باریک بینی سے معائنہ کرنے اور ہر تحفے کو جتنا قریب سے وہ دیکھ سکتا تھا دیکھ لینے کے بعد رنجیت سنگھ اگلے خیمے کی طرف بڑھ گیا۔ یہاں نو پاؤنڈ وزنی دو خوبصورت پرانے زمانے کی توپیں موجود تھیں۔ یہ دونوں توپیں رنجیت سنگھ کے مطابق اور حقیقت میں بھی ان سب تحائف میں سب سے زیادہ قیمتی تھیں۔ یہ نو پاؤنڈ وزنی خالص پیتل کی بنی تھیں اور ان پر رنجیت سنگھ کے سر کی شبیہہ بنی ہوئی تھی۔ یہ توپیں رنجیت سنگھ کو بہترین حالت میں پیش کی گئی تھیں۔ ان کو چلانے کے لیے استعمال ہونے والی چھوٹی سے چھوٹی چیز بھی رنجیت سنگھ کو دی گئی یہاں تک کہ ہر توپ کے ساتھ ایک سو گولے بھی دیئے گئے۔ انگریز وفد نے ضعیف العمر مہاراجا کو ملکہ وکٹوریہ کی بنی ہوئی خوبصورت آئل پینٹنگ بھی دی؛ اس تحفے کو دیتے ہوئے ایک سو توپوں کی سلامی دی گئی۔ میرا نہیں خیال کہ وہ ملکہ عالیہ کی پینٹنگ کی اہمیت سمجھ رہا ہوگا اس کے ذہن میں تو یہ چل رہا ہوگا کہ ملکہ عالیہ میں خوبصورت رقاصہ بننے کی تمام خوبیاں موجود ہیں۔''[13]

ایملی ایڈن جس نے ملکہ وکٹوریہ کی پینٹنگ بنائی تھی رنجیت سنگھ کو ''ایک آنکھ اور سفید مونچھوں والا بوڑھے چوہے کی حیثیت سے بیان کرتی ہے''[14]۔ نہ وہ کوئی جواہرات پہنے ہوئے تھا اور اس کا لباس بھی نہایت عام قسم کے سرخ ریشم سے سلا تھا۔ ''اس نے اپنے پیروں پر دو لمبی جرابیں چڑھائی ہوئی تھیں جو بہت عجیب لگ رہی تھیں؛ لیکن اپنی نشست پر بیٹھنے کے بعد اس نے بڑی مہارت سے جراب اتار دی تا کہ وہ آرام سے ایک پاؤں کو ہاتھ میں پکڑے بیٹھ سکے''۔ اس کے قریب ہی ہیرے جواہرات پہنے ہوئے خوبرو نوجوان ہیرا سنگھ جلوہ افروز تھا اس کے برابر میں اس کا باپ دھیان سنگھ ''جو غیر معمولی طور پر خوش شکل تھا'' براجمان تھا۔

جنگ میں کام آنیوالے سپاہیوں کے بچے دربار میں ادھر ادھر گھٹنوں کے بل چل رہے تھے۔ ان پر دربار میں آنے پر کوئی پابندی نہیں تھی۔ ''وہ رنجیت سنگھ اور گورنر جنرل کے درمیان آزادی سے ادھر اُدھر بھاگ رہے تھے''۔ جب تعارف اور ایک دوسرے کی خیر خیریت کا مرحلہ طے پا گیا تو تحائف کی نمائش کی گئی جن میں ملکہ وکٹوریہ کی پورٹریٹ بھی شامل تھی۔ ''مہاراجا کو ابھی تک گھوڑوں سے شدید لگاؤ ہے: جب اسے کوئی گھوڑا پسند آجائے تو وہ سب کچھ بھول بھال کر دربار

سے باہر دھوپ میں دوڑ پڑتا ہے اور گھوڑے کا، اس کی ٹانگوں کا قریب سے معائنہ کرتا ہے۔''15

اگلے روز آکلینڈ نے مہاراجا کی جوابی دعوت کی۔ ایک بار پھر وہی دھینگا مشتی اور شور شرابے کی کیفیت کا نظارہ دیکھنے کو ملا۔ بینڈ کی آواز، ہاتھی گھوڑوں کی گھبراہٹ اور توپوں کی گھن گرج! رنجیت سنگھ نے گورنر جنرل کے وفد میں شامل ہر شخص کو تحائف دیئے۔

شام کے وقت مہاراجا نے گورنر جنرل اور اس کے وفد کے اعزاز میں عشائیہ دیا اور اسی دعوت میں تمام اہم معاملات طے ہونا تھے۔ یہ خفیہ ملاقات اتنی خفیہ بھی نہیں تھی۔ فین جو اس ملاقات میں موجود تھا اس کا احوال کچھ یوں بیان کرتا ہے۔'اس کانفرنس میں سب کچھ وہی ہو رہا تھا جو رنجیت سنگھ کے دربار کا معمول ہے؛ تقریباً آدھ درجن رقاصائیں مہمان خصوصی اور مہاراجا کے سامنے رقص پیش کر رہی تھیں اور حلق پھاڑ پھاڑ کر کچھ گا رہی تھیں مگر کوئی بھی ان کی طرف توجہ نہیں دے رہا تھا؛ ''آتش بازی کا خوبصورت مظاہرہ ہو رہا تھا اور سپاہی (مسرت کے عالم میں) چاروں اطراف فائرنگ کر رہے تھے؛ اور مہاراجا اپنے دائیں بائیں عظیم لوگوں کی موجودگی میں اپنی کرسی پر کچھ اس لاپروائی سے بیٹھا تھا جیسے وہ ساری زندگی وہیں بیٹھا رہا ہو۔'' ایک دوسرے کے ساتھ بحث کرنے کے لیے کچھ نہیں بچا تھا تمام معاملات پہلے ہی طے پا چکے تھے۔ رنجیت سنگھ شاہ شجاع کو تخت پر بحال کرنے کے لیے برطانوی فوج کے ساتھ تعاون پر تیار تھا۔ اس تجویز پر کہ ایک برطانوی ریذیڈنٹ افسر لاہور میں گورنر جنرل کے نمائندے کے طور پر موجود رہے اس نے صاف انکار کر دیا۔

اس کے بعد ایک دوسرے سے خوشگوار انداز میں باتیں شروع ہو گئیں۔ رقاصاؤں کو انگریز مہمانوں کی خدمت میں پیش کیا گیا۔ ان میں تین جو سب سے ماہر رقاصائیں تھیں ان کے نام خیراں، پارو اور کولن تھے۔ ان میں سے آخر الذکر اپنے حسن کی وجہ سے بہت مشہور تھی۔ جب وہ اپنا ناچ گانا کر رہی تھیں ساقی مہمانوں کے پیالوں کو خاص قسم کی شراب جس میں زمرد، انگور اور مالٹے کے اجزا شامل تھے سے بھرتے جا رہے تھے یہ شراب، ان کا کہنا تھا، ہاضمے کے لیے بیحد مفید ہے۔ رنجیت سنگھ نے آکلینڈ کا جام اس شراب سے بھرا تو عام طور پر ایک حد سے زیادہ نہ کھانے اور نہ ہی پینے والے آکلینڈ نے اپنے میزبان کے جذبات کو ٹھیس پہنچنے کے ڈر سے اسے قبول کر لیا16۔ لیکن ایملی خود کو اس 'خوفناک' چیز کو پینے پر آمادہ نہ کر سکی۔۔۔ اس کے ایک قطرے نے ہی میرے ہونٹ جلا دیئے' اور چونکہ وہ رنجیت سنگھ کی تاریک آنکھ والی طرف بیٹھی تھی اس نے باتوں کے دوران اپنا جام قالین پر اُلٹ دیا۔ رنجیت سنگھ نے ایک انگریز عورت کی مقامی شراب کو برداشت کرنے کی صلاحیت کی تعریف کرتے ہوئے کئی مرتبہ اس کا جام بھرا۔

مہاراجا کو گھوڑوں کے علاوہ شراب کے موضوع پر بات کرنا بھی بہت پسند تھا۔' اس کا کہنا تھا کہ اسے معلوم ہے کئی کتب میں شراب نوشی پر اعتراض کیا گیا ہے اور اس کے خیال میں ایسی کتب کو جن میں اس طرح کی بیوقوفانہ باتیں لکھی ہوں تلف کر دینا چاہیے۔ ایملی کو رنجیت سنگھ بہت اچھا لگا۔ ''اس نے خود کو عظیم بادشاہ منوایا ہے؛ اس نے کئی طاقتور دشمنوں کو شکست دی

ہے؛ وہ حکومت کے معاملات میں بلا کا انصاف پسند ہے؛ اس نے ایک بڑی فوج کو نظم وضبط کا پابند بنایا ہے؛ وہ بمشکل کسی کی جان لیتا ہے اور یہ کسی بادشاہ کی شاندار خوبی ہے اور اس کے عوام اس سے بیحد پیار کرتے ہیں''۔ 17

بعد ازاں اس طرح کے مزید معائنے اور دورے ہوئے۔ آکلینڈ اور اس کی پارٹی کو امرتسر گولڈن ٹمپل کی سیر کرائی گئی۔ ایملی جو رنجیت سنگھ کے ہمراہ تھی لکھتی ہے: ''جتنی محبت اس کے عوام اس سے کرتے ہیں وہ بہت متاثر کن ہے۔ اگلے روز ایک بازار سے گزرتے ہوئے ہم کیا دیکھتے ہیں لوگ اس کو دیکھ کر 'مہاراجا' کے نعرے بلند کرنے لگے۔ وہ اس کو چھونے کی کوشش کرتے اور ان تنگ گلیوں میں ایسا کرنا بہت آسان ہے۔ رنجیت سنگھ کا ہاتھی آس پاس کے مکانوں کی چھتوں پر کھڑے ہونے والوں کی پہنچ میں تھا''۔ 18

یہ وفد امرتسر سے لاہور پہنچا جو بہت ''گندا اور بدبودار شہر'' ہے۔ ایک بار پھر وہی ساری تقریبات اسی جوش وجذبے کے ساتھ دہرائی گئیں۔ یہ تقریبات رات دیر گئے جاری رہیں یہاں تک کہ ایک وقت ایسا آیا کہ رنجیت سنگھ سے مزید بیٹھا نہیں جارہا تھا۔ 24 دسمبر 1838 کی ڈائری میں ایملی لکھتی ہے: ''مہاراجا بیمار ہوگیا۔ سردی اور بخار کا شکار۔ لہٰذا تمام پارٹیاں اور تقریبات ملتوی کردی گئیں۔'' کرسمس کے روز اس کی طبیعت مزید خراب ہوتی چلی گئی۔ 'اس روز ڈاکٹر ڈی مہاراجا کو دو مرتبہ دیکھنے کے لیے آیا۔ اس کے خیال میں مہاراجا کی آواز بہت نحیف ہو چکی تھی اور قابل فہم نہیں تھی، میرے خیال میں مہاراجا ایک بار پھر فالج کا شکار ہوگیا تھا جیسا کہ چند برس پہلے اس پر اس مہلک مرض کا حملہ ہوا تھا۔'19

آکلینڈ اور اس کا وفد مہاراجا سے الوداعی ملاقات کرنے کے لیے 28 دسمبر 1838 کو اس کی خدمت میں حاضر ہوئے۔ انھیں یہ دیکھ کر خوشگوار حیرت ہوئی کہ اس روز رنجیت سنگھ کافی بھلا چنگا دکھائی دے رہا تھا۔

تاہم اسے بستر سے اٹھنے کی اجازت نہیں تھی۔ وہ اٹھ کر گورنر جنرل سے بغلگیر ہوا اور ان لوگوں کو مزید تحائف دیے: اپنی تصویر جس میں وہ ہیرے جواہرات پہنے ہوئے ہے؛ ایک تلوار، چمقاق اور ایک پٹی جس میں گورنر جنرل کے لیے ہیرے اور قیمتی نگینے جڑے تھے۔ ایملی اور اس کی بہن کے لیے قیمتی شالیں۔ جواباً گورنر جنرل نے اسے زمرد کے بنے ہوئے انگوروں کا گچھا پیش کیا اور ہیرے کی بنی ایک بڑی سی انگوٹھی۔ رنجیت سنگھ نے اپنے مہمانوں کو گرمجوشی سے رخصت کیا۔ ''معزز مہمان کو رخصت کرتے وقت رنجیت سنگھ نے اس سے پوچھا کیا وہ اس سے کوئی فرمائش کرنا چاہتا ہے۔ جواب میں گورنر جنرل نے ایک بڑی سی انگوٹھی کا تحفہ دیتے ہوئے کہا اگر مہاراجا کبھی کبھارا سے پہن لے تو اسے بہت مسرت ہوگی۔ وہ انگوٹھی اتنی بڑی تھی کہ اس نے مہاراجا کی چھوٹی سی انگلی کو چھپالیا تھا اور اس تحفے کا عمر رسیدہ مہاراجا پر بہت اثر ہو رہا تھا۔ وہ بمشکل اپنے پیروں پر کھڑا ہوا اور شمع کی روشنی میں اس انگوٹھی کو دیکھنے لگا۔ اس تحفے نے اسے خاصا حیران کر دیا تھا۔''

21

آخری باب

فقیر عزیز الدین رنجیت سنگھ کے جسمانی خدوخال کی تعریف کچھ یوں کرتا ہے: ''رنجیت سنگھ ایک بے داغ موتی تھا''۔ ''وہ شاندار صحت کا مالک تھا، روزانہ خوب کسرت کرتا، گہری نیند سوتا، سیر ہو کر کھاتا اور اس کے تمام افعالِ جسمانی بالکل ٹھیک کام کر رہے تھے۔''

یہ کوئی اتنی انوکھی بات بھی نہیں کیونکہ رنجیت سنگھ اپنے روزمرہ کے معمولات میں بہت زیادہ باقاعدہ تھا۔ وہ صبح شام گھڑسواری کرتا؛ وقت پر کھانا کھاتا، دوپہر میں ضرور سوتا اور جب اس نے کسی کی دعوت نہ کرنا ہوتی تو جلد بستر پر چلا جاتا۔ صرف ایک ایسی بداحتیاطی جس نے اس کی صحت کو نقصان پہنچایا تھا اُس کی شراب سے شدید محبت تھی۔ آخرِ عمر میں اس نے افیون بھی (اور وہ بھی زیادہ مقدار میں) لینا شروع کر دی تھی۔ دربار سے وابستہ شراب کشید کرنے والے اس کے لیے خاص طور پر تیز اثر والی شراب تیار کرتے جو خشک انگوروں کو پسے ہوئے گشتے کے ساتھ کشید کر کے تیار کی جاتی (حیرت کی بات ہے کہ اس شراب کو وہی شخص کشید [1] کرتا جو اُس کی بندوق کے لیے بارود تیار کرتا! [2])۔ مہمانوں کو اس ''مائع آتش کے ساتھ خوب مصالحہ بھر کر تلی ہوئی کوئلیں پیش کی جاتیں۔'' اکثر رنجیت سنگھ دیوالی یا ہولی کے موقع پر حد سے زیادہ پی جاتا۔ بارش کے دوران بھی وہ الکوحل پیے بغیر نہ رہ سکتا۔ بالکل ایک نوجوان کی طرح اس پر شراب کا کوئی منفی اثر ظاہر نہ ہوتا۔ تاہم آگے چل کر شراب کی یہی مقدار اس کی طبیعت خراب کرنے کے لیے کافی ثابت ہوئی۔

دعوتوں کے دوران رنجیت سنگھ اکثر شراب کے نشے میں دھت رہتا اور اس کا اثر اس کے حواس پر کئی روز قائم رہتا۔ اس کے جگر پر بھی کثرتِ مے نوشی کا برا اثر ہوا اور بیماریوں کے خلاف قوتِ مزاحمت بھی متاثر ہوئی۔ رنجیت سنگھ پر پہلا حملہ ملیریا نے کیا۔ یہ 1826 کی بات ہے جب وہ اس بیماری کا شکار ہوا۔ حکیم عزیز الدین کے مشورے پر اس نے لدھیانہ سے ڈاکٹر

مرے کو بلا بھیجا۔ ڈاکٹر نے لاہور میں سات ماہ تک قیام کیا۔ اس سال موسم سرما کی آمد سے قبل ہی رنجیت سنگھ بخار سے نجات پا کر نئے سرے سے ہشاش بشاش اپنا پرانا معمول بحال کر چکا تھا یعنی روزانہ چار سے پانچ گھنٹے کی گھڑ سواری۔ اگلے نو برس تک وہ شاندار صحت سے لطف اندوز ہوتا رہا۔

17 اگست 1835 کی رات رنجیت سنگھ پر فالج کا ہلکا دورہ پڑا جس سے اس کا چہرہ اور جسم کا دایاں حصہ مفلوج ہو گیا اور وہ کئی گھنٹے تک بولنے کے قابل بھی نہ رہا۔ اس نے ڈاکٹر ڈبلیو ایل میکگر یگر کو جو اس کے علاج کی غرض سے آیا تھا فالج کے حملے کے بارے میں بتایا۔ ڈاکٹر نے رنجیت سنگھ کی بیماری کے حوالے سے لدھیانہ کے ریذیڈنٹ کو یوں بتایا:

''اس رات مہاراجا دن بھر کام کے بعد آرام کی غرض سے اپنی خلوت گاہ میں ایسی جگہ پر جا لیٹا جہاں تیز ہوا چل رہی تھی اور اس کا پسینے سے شرابور جسم اس کی زد میں تھا۔ آدھی رات کو اچانک اس کی آنکھ کھل گئی اور اس نے محسوس کیا کہ وہ اپنی زبان کو حرکت دینے کے قابل نہیں تھا اور اس کا چہرہ بھی کافی حد تک ٹیڑھا ہو چکا تھا۔ اس کے خدام یہ تمام نشانیاں دیکھ کر گھبرا گئے اور انھوں نے رنجیت سنگھ پر مختلف نسخے آزمانے شروع کر دیئے جن میں مختلف قسم کے خوشبودار مصالحوں کا استعمال شامل تھا یہ سب فقیر عزیز الدین نے تجویز کیے تھے۔ اس وقتی علاج کے بعد مہاراجا چند الفاظ بڑبڑانے میں کامیاب ہو گیا۔ فالج کے اس حملے سے رنجیت سنگھ کی صحت کو خاصا دھچکا لگا۔ اس کی بھوک مر گئی سر بھاری ہو گیا، ہتھیلیاں اور پاؤں کے تلوے گرم ہونا شروع ہو گئے؛ بار بار پیاس لگنے لگی اور مہاراجا کا مزاج چڑچڑا اور طبیعت مضمحل ہو گئی'۔ 3

رنجیت سنگھ کبھی اچھا مریض ثابت نہیں ہوا، بیماری کے دوران وہ ایک وقت میں بہت سے ڈاکٹروں کی رائے لیتا اور اس سے چھٹکارا پانے کی خاطر نیم حکیم اور عطائیوں سے بھی علاج کروانے کے لیے تیار رہتا۔ انگریز ڈاکٹروں کی تجویز کردہ کڑوی گولیاں تو اسے زہر لگتیں۔ ڈاکٹر میکگر یگر لکھتا ہے ''مہاراجا کو گولیاں نگلنا سخت ناپسند تھا، دوائیوں کو جسم کے اندر لے جانے سے کراہت کے باعث مجھے اس کے علاج میں خاصی دشواری کا سامنا کرنا پڑا۔'' رنجیت سنگھ نے بیماری کی حالت میں بھی اپنا روزمرہ کا معمول بدلنے سے انکار کر دیا۔ اکثر ایسا ہوتا کہ رات بھر تیز بخار میں پھکنے کے بعد وہ صبح سویرے اپنی پالکی میں بیٹھ کر یا تو دریائے راوی کے کنارے چلا جاتا یا پھر کسی باغ میں سیر کر رہا ہوتا؛ وہاں سے وہ واپس دربار آتا اور لوگوں کی شکایات پر احکامات جاری کرتا یا پھر اخبار نویسوں سے مختلف رپورٹیں سنتا۔ وہ صرف اس وقت کام کرنے سے باز آتا جب اُس پر بخار کا ایک اور حملہ ہو جاتا یا پھر وہ تھک ہار کر نڈھال ہو کر بستر پر گر پڑتا۔ تاہم ڈاکٹر میکگر یگر اپنے غیر مستقل مزاج مریض پر کچھ نہ کچھ نظم وضبط لاگو کرنے میں کامیاب ہو گیا اور ایک ماہ کے علاج کے بعد رنجیت سنگھ کی طبیعت خاصی بہتر ہو گئی اور وہ ڈاکٹر میکگر یگر کو واپس لدھیانہ لوٹنے کی اجازت دینے پر رضامند ہو گیا۔

ایک اور انگریز بیرن ہیگل (Baron Hugel) کی 1836 میں مہاراجا سے ملاقات ہوئی۔ وہ مہاراجا کے بارے لکھتا ہے: 'بیماری نے مہاراجا کا حلیہ بگاڑ کر رکھ دیا تھا اس کی زبان پر بھی فالج کا اثر ہوا تھا اور اس کی بات سمجھنے میں اچھی

خاصی دشواری پیدا ہو رہی تھی۔ دو قدم پیدل چلنے پر بھی وہ نڈھال ہو جاتا اور اپنے خادم کے بازو کا سہارا لیے بغیر قدم نہ اٹھا پاتا۔ ایک روز اس نے ہگل سے اپنی بیماری کے بارے میں کہا "میں نے بڑھاپے کی دہلیز پر قدم رکھ دیا ہے اور اب میں بالکل نڈھال ہو چکا ہوں"[4]

1837 کے اوائل میں رنجیت سنگھ پر فالج کا ایک اور حملہ ہوا۔ اس مرتبہ اس کے جسم کا دایاں حصہ مکمل طور پر مفلوج ہو گیا۔ مہاراجا پر فالج کے اِس دوسرے حملے کے اثرات تقریباً چھ ماہ تک قائم رہے۔ اس کے بعد مہاراجا اپنی پرانی روش اور معاملاتِ زندگی بحال نہ کر سکا۔ وہ اپنے گھوڑے پر خود سوار نہ ہو پاتا تھا اور لوگ اس کو اٹھا کر گھوڑے پر بٹھاتے۔ 24 جولائی 1838 کو ہونے والے ایک حادثے سے مہاراجا کی کمزوری کا اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔ اُس روز صبح سویرے وہ اپنی پالکی میں سوار سیر کو جا رہا تھا کہ ایک غضبناک ہاتھی نے اس کی سواری پر حملہ کر دیا۔ مہاراجا کے محافظ اور پالکی کو اٹھانے والے خدام جان بچانے کی خاطر بھاگ کھڑے ہوئے۔ رنجیت سنگھ اتنا کمزور ہو چکا تھا کہ وہ خود پالکی سے باہر نہ نکل سکا ہاتھی نے پالکی کی کھڑکیوں میں لگے شیشے توڑ دیئے اور قریب تھا کہ وہ مہاراجا کو اپنے پیروں تلے کچل دیتا کہ اوتار سنگھ سوڈھیوالا نے اس درندے پر تلوار سے حملہ کر کے اُس کو اپنی طرف متوجہ کیا۔

فالج کا تیسرا حملہ لارڈ آک لینڈ کی آمد کے موقع پر اس کے استقبال میں منعقد کی جانے والی تقریبات کے دوران پیش آیا۔ 1838 کو کرسمس کے موقع پر مہاراجا شدید بیمار پڑ گیا اور اگلے پانچ روز موت و حیات کی کشمکش میں گرفتار رہا۔ نئے سال کی آمد پر اس کی طبیعت کچھ بحال ہوئی تو اسے واپس لاہور لے جایا گیا۔

فیروز پور میں ہونے والے فالج کے تازہ حملے نے رنجیت سنگھ کو قوتِ گویائی سے مکمل طور پر محروم کر دیا تھا۔ اب وہ صرف اشاروں کی زبان سے اپنا مدعا بیان کر سکتا تھا۔ دربار میں اس کی اشاروں کی زبان سمجھنے والے صرف دو شخص تھے بھایا رام سنگھ اور فقیر عزیز الدین، خاص طور پر فقیر عزیز الدین کی اپنے بیمار مالک سے وفاداری ایک بیٹے کے دل میں اپنے باپ کے لیے موجزن پیار کے جذبے سے بھی بڑھ کر تھی۔ وہ مہاراجا کے مشکل سے مشکل اشاروں کا بھی کوئی نہ کوئی مطلب نکال لیتا۔ مہاراجہ کے الفاظ سمجھنے کی خاطر فقیر عزیز الدین اپنا کان مہاراجا کے منہ کے قریب لے جاتا۔ مہاراجا کی بات سمجھ آنے پر وہ "آئش، آئش" کہہ کر اپنی مسرت کا اظہار کرتا اور اگر اسے الفاظ کی سمجھ نہ آتی تو وہ نفی میں سر ہلا کر "نمی فہم" کہتے ہوئے اپنی عاجزی کا اظہار کرتا۔ اس پر مہاراجا اپنی مفلوج زبان، اکلوتی آنکھ اور واحد حرکت کرتے ہاتھ کی مدد سے دوبارہ اپنا مدعا بیان کرنا شروع کرتا۔

جنوری کی شدید سردی اور بارشوں میں مہاراجا کی طبیعت مزید خراب ہوگئی۔ وہ اپنا وقت ایک گرم کمرے میں مقامی طبیبوں کی تجویز کردہ دوائیاں لیتے اور روغنِ بادام کی مالش کرواتے ہوئے گزارنے لگا۔ اسی اثنا میں شمال مغربی سرحد سے موصول ہونے والی اس خبر نے کہ اس کا دوست الرڈ دنیا میں نہیں رہا نے مہاراجا کو مزید غمزدہ کر دیا۔ فروری میں سردی کی

شدت میں کچھ کمی آئی اور مہاراجا نے خود کو دھوپ لگوانا شروع کر دی۔ اب اس کی صحت اس قدر بہتر ہوگئی تھی کہ وہ درباریوں کو اپنے کمرے میں طلب کر کے روزمرہ کے امور پر احکامات جاری کر سکتا تھا۔

مہاراجا اپنی صحت کی خاطر دعا کرنے کے لیے امرتسر دربار میں حاضری دینے گیا وہاں اس نے بڑی رقم خیرات میں دی: بہت سی گائیں جن کے سینگوں پر سونے کا پانی چڑھا ہوا تھا، ہاتھی جن پر سونے اور چاندی کی پالکیاں نصب تھیں اسی طرح سونے اور چاندی کی بیشمار مورتیاں بھی اس کی طرف سے دیے گئے نذرانے میں شامل تھیں۔ اگرچہ اس کی طرف سے دیئے گئے دان میں بڑا حصہ برہمنوں کے لیے مخصوص تھا پھر بھی ہندو، مسلمان اور سکھوں کو بھی اس خیرات سے محروم نہیں کیا گیا۔

مارچ 1839 میں مقامی خبر نگاروں نے مہاراجا کو تیزی سے صحت یاب ہوتے ہوئے ایک شخص کے طور پر بیان کیا تھا تاہم اس کی صحت میں کوئی خاص بہتری نہیں آئی اور دربار کی طرف سے ایک بار پھر لدھیانہ میں موجود ایجنٹ سے کسی انگریز ڈاکٹر کو بھجوانے کی درخواست کی گئی۔ اس درخواست کے جواب میں لدھیانہ سے دو ڈاکٹروں مرے اور سٹیل کو لاہور بھیجا گیا۔

ڈاکٹر سٹیل مہاراجا کے آس پاس کے غیر صحتمندانہ ماحول کے بارے میں یوں لکھتا ہے: 'اس کی رہائش گاہ ایک ایسی بدرو کے سرے پر واقع ہے جس میں گندا پانی بہہ رہا ہے یہ پانی قریبی سڑکوں کو بھی آلودہ کر رہا ہے نتیجے کے طور پر یہ علاقہ غلیظ اور گندے پانی کے جوہڑ میں تبدیل ہو چکا ہے۔ ایسے ماحول میں تو ایک صحت مند انسان کے بیمار ہونے کے امکانات بڑھ جاتے ہیں۔ مہاراجا ایک چھوٹے سے خیمے میں رہ رہا ہے جس کی قریبی زمین پر چاول کاشت کیے گئے ہیں۔ لہٰذا یہاں ہر وقت پانی کی موجودگی ضروری خیال کی جاتی ہے۔ میں اس دلدلی علاقے سے اٹھنے والی بو اور منجمد ہوا کو کسی طور خوشگوار نہیں کہہ سکتا۔ دن کے وقت مہاراجا جس کمرے میں آرام کرتا ہے اس میں کوئی کھڑکی موجود نہیں اور ظاہر ہے وہاں سے تازہ ہوا کا گزر نہیں ہوتا۔ گیلے فرش اور درو دیوار سے اٹھنے والی بو کے علاوہ وہ چھوٹا سا کمرہ ہر وقت درباریوں سے کھچا کھچ بھرا رہتا ہے۔' ڈاکٹر کے اصرار پر مہاراجا کو وہاں سے صحت افزا علاقے میں منتقل کر دیا گیا۔

ڈاکٹر سٹیل نے مہاراجا کے تفصیلی معائنے کے بعد گورنر جنرل کو پیش کرنے کے لیے ایک خفیہ رپورٹ لدھیانہ بھجوائی۔ رپورٹ کے آخر میں اس نے یہ سوال کیا'' کیا مہاراجا لمبے عرصے تک جی پائے گا؟'' پھر خود ہی اس کا جواب دیا'' میرے خیال میں زیادہ عرصے تک نہیں، اس وقت مہاراجا کی صحت تقریباً جواب دے چکی ہے اور بیماری کا ذرا سا جھٹکا بھی اس کے لیے فیصلہ کن ثابت ہو سکتا ہے۔ اب وہ تھوڑے عرصے کا مہمان ہے چند مہینوں کا یا زیادہ سے زیادہ ایک برس کا اگرچہ میرا انھیں خیال کہ وہ ایک برس نکال پائے گا پھر بھی مہاراجا کے اندر کچھ توانائی باقی ہے۔ اس کے اندر بیماری سے جنگ کرنے کی فطری قوت موجود ہے اور اب وہ اپنی توانائیاں جمع کر رہا ہے۔''

گرمیوں نے رنجیت سنگھ کو پہلے سے کہیں زیادہ بے چین کر دیا۔ مئی کے آخر تک اس کے ذہن میں کوئی شبہ نہیں رہا تھا کہ اس کے آخری دن قریب آ گئے ہیں۔ مہاراجا کی صحت یابی کے لیے پچاس برہمنوں کو دعا اور پوجا پاٹ کی ذمہ داریاں

سونپی گئیں۔ فقیر نورالدین کو حکم دیا گیا کہ روزانہ دس من روٹیاں غریبوں میں تقسیم کی جائیں اسی طرح بڑی مقدار میں سونا، چاندی اور بڑی تعداد میں گائے، گھوڑے اور ہاتھی مختلف درباروں اور خانقاہوں کی نذر کیے گئے۔

جون 1839 میں چھ یورپی ڈاکٹر مہاراجا کا علاج کرنے کے لیے موجود تھے۔ تین ڈاکٹر گورنر جنرل کی طرف سے بھیجے گئے تھے جبکہ تین خود رنجیت سنگھ نے منگوائے تھے اس کے علاوہ حکیموں اور ویدوں کی بڑی تعداد مہاراجا کے علاج کے لیے ہمہ وقت موجود تھی۔ مہاراجا انگریز ڈاکٹروں کی تجویز کردہ کڑوی دوائیوں کی نسبت ہومیوڈاکٹر مارٹن ہونگبر گر سے دوا لینے کو ترجیح دیتا۔۔۔ چند قطرے جو اس کی پسندیدہ برانڈی میں ملے ہوتے۔ ڈاکٹر ہونگبر گر نے مہاراجا سے درخواست کی کہ وہ قلعے میں منتقل ہو جائے جہاں آب و ہوا نسبتاً صحت بخش ہے اس حوالے سے جب ماہرینِ علمِ نجوم سے رابطہ کیا گیا تو انھوں نے مہاراجا کو 13 جون سے پہلے حرکت کرنے سے خبردار کر دیا پس مہاراجا جہاں تھا وہیں لیٹا رہا؛ چند روز بعد مہاراجا نے ہومیوڈاکٹر کی تجویز کردہ دوائیوں اور پرہیز کی ہدایتوں کو نظرانداز کرتے ہوئے ہر قسمی دوا لینی شروع کر دی۔ نہ صرف یہ بلکہ مہاراجا نے برف کا ٹھنڈا پانی پینا اور دوپہر کے وقت افیون کا استعمال بھی شروع کر دیا۔ 6

10 جون کی شام خاص طور پر گرم اور خاموش تھی۔ رات کے وقت لاہور میں شدید طوفان آیا۔ طوفان کی شدت اتنی تھی کہ اس نے شہر کے دو دروازے اور قلعے کا ایک قبضے سے اکھاڑ پھینکے۔ اُس رات رنجیت سنگھ شور اور مسلسل کھانسی کے باعث سکون سے نہ سو سکا، آدھی رات کے وقت اس کے جسم کا درجہ حرارت بڑھتا چلا گیا اور اس کے پاؤں سوجنا شروع ہو گئے۔ صبح تک بخار کی شدت میں تو کمی آ گئی مگر مہاراجا کے جسم سے خون نکلنا شروع ہو گیا اور ساتھ میں اسہال کی شکایت بھی ہو گئی۔ 13 جون کو رنجیت سنگھ کو قلعے کے اندر لے جایا گیا، اس روز کا اخبارِ لاہور لکھتا ہے: ''غروبِ آفتاب کے بعد عین اُس گھڑی جس کا ماہرینِ علمِ نجوم نے اشارہ کیا تھا مہاراجا کو قلعے کے اندر مثمن برج میں لے جایا گیا۔ مہاراجا کی سواری دھیرے دھیرے آگے بڑھتی رہی اور جونہی یہ قلعے کے دروازے سے گزری تو دیواروں پر نصب توپوں اور انارکلی کی سمت سے مہاراجا کے دستے نے گولے داغے جو اس بات کا اعلان تھا کہ مہاراجا کی سواری قلعے میں داخل ہو گئی ہے۔''

مہاراجا نے قلعے میں داخل ہو کر یہ اشیا دان کرنے کا فرمان جاری کیا: ''برہمنوں کی خدمت میں سونے کا ملمع لگے سینگوں والی گیارہ گائیں، ساٹن کے تھان کے سلے ہوئے 25 جوڑے، سونے اور چاندی کی بنی 10 مورتیاں، پانچ سونے کے بنے ہرن اور اتنے ہی چاندی کے، دو گھوڑے، ایک ہاتھی، دو ہیرے کی انگوٹھیاں، مرجان کی بنی گیارہ مالائیں اور نقد دو ہزار روپے۔ اس نے اپنے وزن سے پانچ گنا زیادہ گیہوں بھی برہمنوں کو بھجوایا۔''

بلندی پر قائم مثمن برج کی تازہ ہوا نے رنجیت سنگھ کی گری ہوئی طبیعت کو ہشاش بشاش کر دیا۔ رنجیت سنگھ نے خود کو بہتر محسوس کرتے ہوئے اپنے بڑے بیٹے کھڑک سنگھ کو بلایا اور بتایا کہ ''اس کی طبیعت خاصی بہتر ہو گئی ہے اور اگر وہ مزید پندرہ دن اسی طرح بھلا چنگا رہا تو اسے یقین ہے وہ دوبارہ کبھی بیمار نہیں ہوگا''۔

اس شام تیز بارش ہوئی اور درجہ حرارت خاصا گر گیا۔ موسم سہانا تھا مگر رنجیت سنگھ نے وہ رات ایک بار پھر جاگ کر گزاری۔ 'اس کی آنکھوں سے درد کی ٹیسیں اٹھ رہی تھیں'۔ اگلی صبح پنجاب کے تمام شہروں میں دربار کے افسران کو حکم دیا گیا کہ وہ اس بات کو یقینی بنائیں کہ پنجاب کے کسی مذبح خانے میں بھیڑیں، بکریاں یا دوسرے مویشی ذبح نہ ہونے پائیں۔

تاہم عبادات اور نذرانے بھی مہاراجا کے کام نہ آسکے اور اس کی طبیعت بگڑتی چلی گئی۔ پانچ روز بعد اس کے سارے جسم پر کپکپی طاری ہوگئی اور فقیر عزیز الدین کی ہدایت پر اس کے جسم پر سنگِ سلیمانی پھیرا گیا، یہ "دو ماشہ وزن کا ایسا سبز پتھر تھا جسے لاکھوں آنسوؤں میں پیس کر تیار کیا گیا تھا۔"

اب مہاراجا کا آخری وقت زیادہ دور نہیں تھا۔ 20 مارچ علی الصبح مہاراجا پر ایک بار پھر تیز بخار کا حملہ ہوگیا اور اس کی ناک سے خون بہنے لگا۔ اسے اپنے گھٹنوں میں بھی شدید درد محسوس ہوا۔ اس نے ماہرین علمِ نجوم کو بلوایا تاکہ ان سے دریافت کر سکے کہ اس کا مستقبل کیا ہے۔ پنڈت مدسُدن کا کہنا تھا کہ دل کھول کر نذر نیاز دینے سے اچھا نتیجہ نکلے گا اور اس سلسلے کو جاری رہنا چاہئے۔ مہاراجا نے اپنے گھوڑوں کی ضرورت سے زائد ایک خوراک بھی اس متفرق خیرات میں دیدی جو وہ پہلے سے ہی دے رہا تھا۔ تاہم وہ اتنا بیوقوف نہ تھا کہ یہ نہ سمجھ سکے کہ "ایک دن ٹھیک ہونے اور پھر اگلے دن بیمار پڑنے کا کیا مطلب ہے"۔ فقیر عزیز الدین کے مشورے پر اس نے حکومت کی بھاگ دوڑ کھڑک سنگھ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا اور راجا دھیان سنگھ کو اس کا وزیرِ اعظم مقرر کیا۔

اگلے روز کھڑک سنگھ اور راجا دھیان سنگھ نے دستوں کا معائنہ کیا اور افسروں سے سلامی وصول کی۔ بعد ازاں کھڑک سنگھ نے مُثمن بُرج پر دربار لگایا جہاں فقیر عزیز الدین نے اقتدار کی منتقلی کا فرمان پڑھ کر سنایا۔ راجا دھیان سنگھ کو "نائب سلطانِ عظمیٰ، خیر خواہِ صمیمی کبریٰ، وزیرِ اعظم و مختارِ کُل، راجا دھیان سنگھ بہادر" کا خطاب دیتے ہوئے وزیرِ اعظم کے عہدے پر فائز کیا گیا۔

نئے مہاراجا کی تاجپوشی کا یہ بالکل درست وقت تھا کیونکہ اگلے ہی روز مہاراجا رنجیت سنگھ بھرے دربار میں ہوش و حواس کھو بیٹھا۔ اسے بستر پر لٹا دیا گیا اور کسی کو بولنے کی اجازت نہیں دی گئی۔ وزراء کا پریشانی سے برا حال تھا۔ کنور کھڑک سنگھ اور راجا دھیان سنگھ نے اپنے محافظوں کو دروازوں اور گیٹ کی جانب روانہ کر دیا۔

موت کا فرشتہ مثمن بُرج کے اوپر مسلسل منڈلا رہا تھا۔ ہندوؤں کی رسم کے عین مطابق مہاراجا کو زمین پر مرنے کے لیے لٹا دیا گیا تاکہ وہ اسی دھرتی ماں کی گود میں آخری ہچکی لے سکے جس نے اسے جنم دیا تھا۔ اس کی دم توڑتی سانسوں میں ابھی کچھ حرارت باقی تھی اور اس کے معالجوں کی اس پیشگوئی کے باوجود کہ وہ محض چند گھنٹوں کا مہمان ہے وہ ایک بار پھر زندگی کی طرف لوٹ آیا اور اسے واپس بستر پر لٹا دیا گیا۔ لیکن اب زندگی کا اختتام ہوا ہی چاہتا تھا۔ 24 مارچ کی دوپہر کو اسے ایک بار پھر بیماری کا جھٹکا لگا اور 'اس خیال کے پیشِ نظر کہ وہ دنیاوی دولت سے جدا ہو رہا ہے اس نے اپنے خزانے کے تمام ہیرے

جواہرات اور دولت اپنے سامنے منگوائی: گائیں جن کے سینگوں پر سونے کی ملمع کاری کی گئی تھی، ایک سو سجے ہوئے گھوڑے پانچ بہترین نسل کے گھوڑے (کبوترہ، سندھوری، نگینہ وغیرہ) ان کے علاوہ تھے، ان تمام گھوڑوں پر سونے اور دیگر بیش قیمت ہیرے سے سجی ہوئی زین ڈالی گئی تھی، اسی طرح چار ہاتھی جن پر سونے اور چاندی کی سواری نصب تھی، ایک سنہری کرسی، بستر، پلیٹیں، موتیوں کی مالائیں، تلواریں، ڈھالیں، موتی اور بے شمار قیمتی تحائف۔ یہ تمام بیش بہا مال و متاع اور قیمتی تحائف سارے ہندوستان میں موجود ہندو مندروں اور خانقاہوں کو دان کر دیئے گئے۔ اخبار نویس اُس ایک روز دان کی گئی دولت کی مالیت تقریباً دو کروڑ روپے بتاتا ہے۔ اسی روز مہاراجا نے کوہِ نور ہیرا بھی منگوایا۔ مہاراجا کی خواہش تھی کہ وہ اس شہرۂ آفاق ہیرے کو پوری کے مقام پر واقع جگن ناتھ مندر میں دان کر دے۔ تاہم اس کے درباریوں نے اسے ایسا کرنے سے باز رکھا۔ ان کا کہنا تھا اس ہیرے کی قیمت ہندوستان کے تمام خزانوں سے زیادہ ہے اور یہ کہ برہمنوں سے اس ہیرے کو کوئی بھی نہیں خرید سکے گا۔

مہاراجا کا آخری عمل ایک سپاہی کی طرح موت کو گلے لگانے کا تھا۔ اس نے اپنے درباریوں کو بلوایا اور بسترِ مرگ پر لیٹے لیٹے اپنی تمام تلواریں، ڈھالیں، نیزے، پستول اور بندوقیں اپنے ہاتھوں سے ان میں تقسیم کیں۔

26 جون کو مہاراجا کے ہوش و حواس جاتے رہے۔ اس پر کھڑک سنگھ نے ایک خاص دربار منعقد کیا اور اپنے باپ کی طرف سے مختلف ریاستوں کے نگرانوں اور وزراء کو امداد کی فراہمی کی یقین دہانی کرائی، اس موقع پر اعلیٰ افسران نے باہمی ربط اور ہم آہنگی کی فضا قائم رکھنے کی ضرورت پر زور دیا۔ وزراء کا کہنا تھا کہ انھیں (دربار اور اس کے زیرِ انتظام ریاستوں کو) آپس میں اسی طرح کا اتحاد اور معاہدہ قائم رکھنا چاہیے جیسا سرکار برطانیہ کا اپنی ریاستوں کے والیوں کے ساتھ ہے تا کہ نہ صرف ان ریاستوں کا تحفظ یقینی بنایا جا سکے بلکہ کنور کھڑک سنگھ اور کنور نونہال سنگھ کو بھی ممکنہ بیرونی دخل اندازی سے بچایا جا سکے۔ اس پر راجا دھیان سنگھ نے مشتعل ہو کر کہا (جس سے اس کا اندرونی اضطراب ظاہر ہو رہا تھا) ''کس کی مجال ہے کہ ہماری طرف میلی آنکھ سے دیکھے؟''

27 جون 1839 مہاراجا کی زندگی کا آخری دن ثابت ہوا[7]۔ لاہور اخبار اس دلدوز منظر کو یوں بیان کرتا ہے:

''مہاراجا کی موت کی خبر سنتے ہی رانیاں، کنور کھڑک سنگھ، راجا دھیان سنگھ، جمعدار خوشحال سنگھ اور دیگر پھوٹ پھوٹ کر رونے لگے، انھوں نے اپنے بال نوچنا شروع کر دیئے اور اپنے سروں میں مٹی ڈالنا شروع کر دی مہاراجا کی موت کی خبر سن کر لوگ شدتِ غم سے نڈھال ہو کر زمین پر گر پڑے اور اینٹوں اور پتھروں سے سر ٹکرانے لگے تمام رات مہاراجا کی میت کے سرہانے یہ بین اور ماتم جاری رہا، جوں ہی ان کی مہاراجا کی میت پر نظر پڑتی ان کی چیخوں میں شدت آ جاتی۔''

کسی قسم کی سول نافرمانی یا بیرونی حملے کے سدِ باب کے لیے فوری حفاظتی اقدامات اٹھائے گئے۔ فوجی دستوں میں بڑی مقدار میں اسلحہ بارود تقسیم کیا۔ دریائے ستلج میں کشتیوں اور چھوٹے جہازوں پر تعینات فوجی دستوں اور افسروں کو خصوصاً یہ

احکامات دیے گئے کہ وہ اپنی کشتیاں دریا کے مغربی کنارے کے قریب رکھیں اور صرف ایک کشتی کو مسافروں کی آمد و رفت کی غرض سے مشرقی کنارے پر رہنے دیں۔

رات بھر مہاراجا کی میت سرکاری اعزاز کے ساتھ فرش پر پڑی رہی اُس کے چاروں طرف دیے جلائے گئے: تمام رات ماتم اور بین جاری رہا، راجا دھیان سنگھ دوسروں سے زیادہ جذباتی واقع ہوا تھا اعلان کر دیا کہ وہ مہاراجا کی چتا کے ساتھ جل کر مر جائے گا۔ اس اعلان پر کھڑک سنگھ اور دیگر اہم سرداروں نے اس کو اپنا فیصلہ بدلنے پر مجبور کرنے کے لیے اپنی پگڑیاں اس کے پیروں پر ڈال دیں۔ تاہم چاروں رانیوں اور ان کی سات کنیزوں کے سامنے ان کی ایک نہ چلی، کوئی بھی مہاراجا کی وفادار رانیوں کو اس کی چتا کے ساتھ ستی ہونے کے ارادے سے باز نہیں رکھ سکا، کانچ کی رانی گڈن نے جو کہ سنسر چند کی بیٹی تھی اس موقع پر مناسب سمجھا کہ سب لوگوں سے ریاستِ پنجاب کے ساتھ وابستگی کا حلف لے۔ اس نے راجا دھیان سنگھ کا ہاتھ پکڑ کر مہاراجا کے بے جان سینے پر رکھا اور عہد لیا کہ وہ ہمیشہ کھڑک سنگھ اور اس کے بیٹے نونہال سنگھ کا وفادار رہے گا اور ہمیشہ ریاستِ پنجاب کی فلاح و بہبود کے لیے کمربستہ رہے گا۔ اسی طرح اس نے کھڑک سنگھ سے بھی حلف لیا کہ وہ مفاد پرستوں کی باتوں میں آکر کبھی بھی راجا دھیان سنگھ کی طرف سے دل میلا نہیں کرے گا۔ 'جو بھی اس حلف کی خلاف ورزی کرے گا اسے ایک ہزار گائیوں کو جلانے کے برابر عذاب ملے گا''۔

اگلی صبح مہاراجا کی میت کو گنگا کے پانی سے اشنان کے بعد صندل کی لکڑی سے تیار چتا پر رکھ دیا گیا۔ اس چتا کو بحری جہاز کی طرز پر بنایا گیا تھا، ایسا بحری جہاز جس کے بادبان قیمتی ریشم اور کمخواب کے لیے تھے۔ وزرا اور درباریوں نے چتا کو شالوں سے ڈھانپ کر مہاراجا کا آخری مرتبہ دیدار کیا۔

مہاراجا کی ارتھی قلعے سے برآمد ہوئی تیز تیز قدم اٹھاتی ہوئی چاروں رانیاں اور ان کی کنیزیں اس کے پیچھے چلتی ہوئی آرہی تھیں۔ انھوں نے عروسی لباس زیب تن کیا ہوا تھا اور قیمتی ہیرے جواہرات پہنے ہوئے تھے۔ گاہے بگاہے وہ اپنے زیورات میں سے چوڑی، گلوبند یا کان کی بالی مہاراجا کی ارتھی کے ساتھ چلنے والے ہجوم کی طرف اچھال دیتیں یا ان برہمنوں کے حوالے کر دیتیں جو بھجن پڑھتے ہوئے جنازے کے ہمراہ چل رہے تھے۔ ارتھی کا جلوس شہر کی تنگ پر ہجوم گلیوں سے گزرتا ہوا جہاں لوگ مہاراجا کی میت کا آخری دیدار کرنے کے لیے کھڑے تھے قلعے کی دیوار کے ساتھ موجود باغ کے سامنے آکر رک گیا۔ یہ جگہ مندر کی اس جگہ سے زیادہ دور نہیں تھی جہاں سکھوں کے پانچویں گرو ارجن کو شہید کیا گیا تھا۔ ایک خبر نگار اس سارے منظر کو کچھ یوں بیان کرتا ہے: ''صندل کی لکڑی کی بنی چتا کے قریب پہنچ کر یہ جلوس رک گیا اور مہاراجا کی ارتھی کو چتا پر لٹا دیا گیا۔ رانی گڈن چتا کے قریب بیٹھ گئی اور میت کا سر اپنی گود میں رکھ لیا جبکہ دیگر رانیاں اور ان کی کنیزیں میت کے چاروں اطراف میں براجمان ہو گئیں ان کے چہروں اور رویے سے مکمل اطمینان ظاہر ہو رہا تھا۔''[8] مہاراجا کی آخری رسومات کے وقت ہندو، سکھ اور مسلمان اپنے اپنے عقیدے کے مطابق حمد و ثنا میں مصروف تھے۔ برہمن پجاری اشلوک پڑھ رہے تھے، سکھ

گرنتھ صاحب کا ورد کر رہے تھے جبکہ مسلمان ''یا اللہ، یا اللہ'' کہتے ہوئے اُن کی آواز سے آواز ملا رہے تھے 9۔ دعاؤں کا یہ سلسلہ ایک گھنٹے تک جاری رہا۔'' برہمنوں کے دیئے گئے وقت پر کنور کھڑک سنگھ نے چتا کو آگ دکھائی اور پنجاب کا مہاراجا اپنی چاروں رانیوں اور سات کنیزوں کے ہمراہ راکھ میں تبدیل ہو گیا۔ چتا کے اوپر آسمان میں بادل کی ایک ٹکڑی نمودار ہوئی اور چند بوندیں برسانے کے بعد غائب ہو گئی۔ وہاں موجود ہر شخص رب کی رضا میں راضی تھا۔ راجا دھیان سنگھ نے چار مرتبہ دہکتے الاؤ میں چھلانگ لگانے کی کوشش کی مگر وہاں موجود لوگوں نے اسے ایسا نہ کرنے دیا۔ محل میں موجود رانیوں کی آہ و بکا سن کر اور ہر عمر، عقیدے، مذہب اور صنف کے شخص کو روتا دیکھ کر دل ٹکڑے ٹکڑے ہوا جا رہا تھا۔'10

ہونگبر گر لکھتا ہے: ''چتا کو مکمل طور پر جلنے میں دو دن لگے، تیسرے روز دربار کی موجودگی میں ہڈیاں اور راکھ اٹھائی گئی اور الگ الگ کوزوں میں رکھی گئی' شہر لاہور کے لوگوں نے بھیگی آنکھوں اور بوجھل دل کے ساتھ اپنے مہاراجا اور اس کی شریکِ حیات رانیوں اور کنیزوں کی استھیوں کو الوداع کہا۔'' مہاراجا کی استھیاں لیے جلوس قلعے سے برآمد ہوا تو اس کے ہمراہ وزرا، سکھ سردار پیدل چل رہے تھے جبکہ بہت سے ایسے بھی تھے جو اپنے ہاتھیوں اور گھوڑوں پر سوار جلوس کے ہمراہ رواں دواں تھے۔ جلوس کے راستے کے دوران شہر کی سڑکوں، گلیوں، بازاروں، مکانوں کی چھتوں پر جگہ جگہ لوگ موجود تھے یہ سب لوگ جلوس پر پھولوں کی پتیاں نچھاور کر رہے تھے۔ جب یہ جلوس دہلی گیٹ سے برآمد ہوا تو قلعے کی دیواروں اور شہر پناہ پر لگی توپوں نے گرجدار آواز میں مہاراجا کو الوداعی سلامی دی''۔ 11

مہاراجا کی استھیاں مختلف مقامات سے ہوتے ہوئے بالآخر گنگا کنارے ہردوار جا کر رُک گئیں۔ لاہور سے ہردوار تک تین سو میل لمبے راستے پر لوگوں کی بڑی تعداد مہاراجا کی استھیوں کو پرنام کرنے آئی ہوئی تھی: راجے مہاراجے قیمتی چادروں اور توپوں کی گرجدار آواز کے ہمراہ آئے تھے جبکہ عام دیہاتی کسان پھولوں اور آنسوؤں کے ساتھ مہاراجا کو خراجِ عقیدت پیش کر رہے تھے

حوالہ جات

ابتدائیہ

1۔سیاراُلمکاخرین،صفحہ 403

2۔کامورخان،تذکرہ السلاطین صفحہ 178

3۔فورسٹر،ٹریولز جلد اول صفحہ 285

باب 1

1۔ رنجیت سنگھ کی تاریخِ پیدائش اور جائے پیدائش کے حوالے سے متضاد رائے پائی جاتی ہے۔گوجرانوالہ کے ایک پرانے مکان کے ایک کمرے پر اوپر دو تختیاں لگی ہیں جن پر یہ لکھا ہوا ہے کہ اس کمرے میں رنجیت سنگھ کا جنم ہوا تھا ان تختیوں پر اس کی تاریخ پیدائش بھی لکھی ہے: 2 نومبر 1780 ۔بہت سے تاریخ دان جن میں میکر یگر، ڈھفن، پریم سنگھ اور ڈاکٹر گنڈا سنگھ شامل ہیں گوجرانوالہ میں رنجیت سنگھ کے جنم کو درست تسلیم کرتے ہیں مگر تاریخ پیدائش کے حوالے سے اکثر کا خیال ہے کہ وہ 13 نومبر 1780 کو پیدا ہوا۔تاریخ دانوں کا ایک اور گروہ یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اس کا جنم سندھ سے کچھ دور بدرخن نامی علاقے میں ہوا۔ بدرخن رنجیت سنگھ کی ماں راج کور کا گاؤں تھا جو کہ جند کے راجا گجپت سنگھ کی بیٹی تھی تاہم اپنے شوہر کے گاؤں میں اسے مائی مالون یعنی مالوہ کی خاتون کہہ کر پکارا جاتا تھا۔پنجاب کے رسم و رواج کے مطابق وہ رنجیت سنگھ کو جنم دینے کے لیے اپنے ماں باپ کے گھر آئی ہوئی تھی۔

2۔ سوہن لال لکھتا ہے: "عظیم الشان شہزادے کی طبیعت ناساز ہوگئی اور سر بلند خان ماہر طبیب لالہ حاکم رائے کے ہمراہ دو سو گھڑ سواروں کی معیت میں سفر کرتا ہوا شہزادہ عالی جناب کی خدمت میں حاضر ہوا۔شہزادہ حضور کی طبیعت خسرے کی وجہ سے بگڑتی چلی گئی۔اُن کے جسم سے خاص طور پر دائیں آنکھ سے مختلف بخارات اور دیگر مواد بہت زیادہ مقدار میں

خارج ہونے کی وجہ سے مرض میں کمی کے آثار دکھائی نہیں دے رہے تھے۔ درد کی شدت کی وجہ سے ان کی آنکھ مسلسل پھڑ کنے لگ گئی' (یہاں پر تاریخ دان ایک غلطی کر گیا اور بائیں آنکھ کی بجائے دائیں آنکھ لکھ دیا)۔ دفتر II صفحہ 25

3۔ لکھپت رائے کے قتل پر بہت چہ میگوئیاں ہوئیں۔ پرنسپ، ویڈ اور لطیف اس خیال کے حامی ہیں کہ رنجیت سنگھ کی ماں اور لکھپت رائے کے درمیان مراسم تھے اور دونوں رنجیت سنگھ کے ہاتھوں قتل ہوئے تاہم نہ تو سوہن لال سری نہ امرناتھ اور نہ ہی بوٹے شاہ نے (جو رنجیت سنگھ کے دور میں انگریزوں کی جانب سے دربار میں خبر نویس تھا) کبھی اس کی تصدیق کی ہے اس طرح کی من گھڑت کہانی اس بات کا ثبوت ہے کہ مختلف تاریخ دان رنجیت سنگھ کو طرح طرح کی کردار کشی اور الزامات کا نشانہ بناتے رہے ہیں۔

باب2

1۔ سوہن لال سوری، دفتر II، صفحہ 33

2۔ ایشیاٹک اینول رجسٹر، 1799 (نمبر 28)

3۔ سوہن لال، دفتر، صفحہ 39

باب3

1۔ اس بات کا قوی امکان ہے کہ افغان فوجی توپیں جو بڑے عرصے تک ایک علمی جھگڑے کا باعث بنی رہیں، افغان فوجوں کے پسپا ہونے پر دریائے جہلم کی لہروں کی نذر ہو گئی ہوں۔

2۔ جون 1800

3۔ سکھوں نے 1764 میں لاہور کو افغانیوں کی عملداری سے آزاد کرایا۔ بھنگی سرداروں لہنا سنگھ اور گجر سنگھ رات کی تاریکی میں ایک محفل رقص سے اس وقت کے لاہور کے گورنر کو اغوا کر کے لے گئے۔ اگلی صبح انھوں نے لاہور پر قبضہ کر لیا۔ یوں شہر کو بھنگی سرداروں اور کنہیا مثل کے صوبا سنگھ کے درمیان تقسیم کر دیا گیا۔ اُس نے لاہور پر قبضے میں بھنگی سرداروں کی مدد کی تھی۔ 1799 میں انہی سرداروں کے بیٹے لاہور کے حکمران تھے۔

4۔ سوہن لال، دفتر II، صفحہ 43

5۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ رنجیت سنگھ نے لاہور پر قبضے کے بعد ایسا کیا نہ کہ اس سے پہلے جیسا کہ تاریخ کی کتب میں مورخین عام طور پر ہمیں بتاتے ہیں (ان میں پرنسپ، کننگھم، ویڈ، گرفن، لطیف اور سنہا شامل ہیں)۔ دہلی کے مقرر کردہ ریذیڈنٹ کولنز کی طرف سے مارننگٹن کے ارل کے نام اپریل 1800 تحریر کردہ دو خطوط سے یہ غلط فہمی دور ہو جاتی ہے۔ ایک خط میں وہ لکھتا ہے: 'میرے ذاتی ایجنٹ نے مجھے دلی سے خبر دی ہے کہ شاہ زمان نے لاہور پر قابض رنجیت

سنگھ جسے حال ہی میں درانی شہزادے کی طرف سے خلعت کا تحفہ ملا ہے سے گٹھ جوڑ کرنے کے لیے کوششیں شروع کر دی ہیں۔ یوں معلوم ہوتا ہے کہ شاہ ابھی تک ہندوستان پر اپنے حق سے دستبردار نہیں ہوا'۔ دوسرے خط میں وہ لکھتا ہے:
'لاہور سے پہنچنے والے مراسلوں سے معلوم ہوا ہے کہ رنجیت سنگھ نے حال ہی میں شاہ زماں کے وکیل کو پندرہ ایسی توپیں اوران کے حصے پیش کیے ہیں جو درانی شہزادہ گزشتہ برس جلدی میں پنجاب سے فرار ہوتے ہوئے دریائے چناب کی بپھری ہوئی موجوں میں چھوڑ گیا تھا'۔
رنجیت سنگھ کی طرف سے شاہ زمان کو توپوں اوران کے چند حصوں کی واپسی تاریخ میں اہم مقام اختیار کر گئی ہے کیونکہ بیشتر تاریخ دانوں نے اس کا یہ مطلب نکالا ہے کہ توپوں کو بطور تحفہ دیئے جانے کا مطلب ہے کہ شاہ زمان نے رنجیت سنگھ کو لاہور کی صوبیداری سونپ دی۔ یہ ایک غلط استدلال ہے۔ ان توپوں سے درانیوں کو نہیں بلکہ شاہ زمان اوراس کی فوجوں کو ہاتھ دھونے پڑے تھے (مگر کس دریا میں یہ واضح نہیں)۔ رنجیت سنگھ کو بعد میں ان کی بابت بتایا گیا اور لاہور پر قبضے کے تقریباً چھ ماہ بعد اس نے یہ توپیں شاہ زمان کو بھجوائی تھیں۔

6۔ بہت سے یورپی جن کی فقیر عزیز الدین سے ملاقات ہوئی ہے اس سے متاثر نظر آتے ہیں اور انھوں نے اس کی بہت تعریف کی ہے۔ لیفٹیننٹ کرنل سٹین بیک جو رنجیت سنگھ کی فوج میں شامل تھا اور فقیر عزیز کو بیشتر مواقع پر دیکھ چکا تھا اس کو 'رنجیت سنگھ کے دربار کے نمایاں ترین افراد میں سے ایک' کے طور پر بیان کرتا ہے 'ایک ایسا شخص جسے فارسی اور عربی زبان کا علم ہے اور پرانے مسودے اکٹھے کرنے کا شوق بھی۔ نہایت ہی قابلِ قبول شخص خصوصاً ایسے وقت جب اس کا کوئی براہِ راست مقصد نہ ہو (اور وہ کبھی بغیر مقصد کے بات نہیں کرتا) اس کو بہت سی حکائتیں اور اقوال زبانی یاد ہیں؛ اگر آپ کے خلاف ہو جائے تو نا قابلِ تلافی نقصان پہنچا سکتا ہے اور دھوکا دہی اور چکنی چپڑی باتوں میں کوئی اس کا ثانی نہیں'۔

7۔ 24 اپریل 1800

8۔ 30 دسمبر 1800۔ اگرچہ اس خط سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ یہ لاہور پر قبضے سے پہلے لکھا گیا یا بعد میں، یہ بات واضح ہے کہ یہ جولائی 1799 کے بعد لکھا گیا۔

9۔ لاہور کی پولیس کے پہلا سربراہ امام بخش نامی ایک شخص تھا جو ہر وقت ایک گدھے پر سوار رہتا اسی لیے لوگ اسے خر سوار کہہ کر پکارتے تھے۔

10۔ سرائے ٹیمپل کی ایک رپورٹ جو کہ جالندھر دوآبہ پر 29 دسمبر 1852 کو تیار کی گئی۔ پنجاب کی تاریخ پر مبنی دستاویز میں ایس آر کوہلی کی تیار کردہ رپورٹ ''سکھوں کے زیرِ انتظام ٹیکس و دیگر مالیاتی نظام کا انتظام و انصرام'' بھی یہی حقائق بتاتی ہے۔

11۔ حسین اور مادھو لال لاہور کے دو صوفی شاعر تھے اور ان کی ایک دوسرے سے الفت بہت سی کہانیوں کو جنم دے گئی۔

انھوں نے مشترکہ نام مادھولال حسین کے نام سے شاعری بھی کی۔ مرنے کے بعد دونوں کو شالامار باغ کے قریب ایک دوسرے کے ساتھ دفن کیا گیا ان کے سالانہ عرس کو لوگ انہی کی شاعری گا کر مناتے ہیں۔ مسلمانوں کے علاوہ ہندو اور سکھ عقیدت مند بھی اس مقام کی زیارت کے لیے آتے ہیں۔

12۔ دفتر II، صفحہ 53

13۔ دفتر II، صفحہ 54

14۔ آرسی والا سکہ (آئینہ نما انگوٹھی کا سکہ) کے بارے کہا جاتا ہے کہ یہ ایسٹ انڈیا کمپنی کے سکے کی نقل میں تیار کیا گیا جس پر ملکہ وکٹوریہ کی صورت کندہ تھی۔ جب کہ رنجیت سنگھ کے آرسی والے سکوں پر ایک طرف مور کی تصویر بنی تھی۔

باب 4

1۔ یہ (بھنگیوں کی توپ) رنجیت سنگھ کی کئی جنگی مہمات میں کام آئی اور اس کی موت کے بعد بھی انگریزوں کے ساتھ جنگ میں اس توپ کو استعمال کیا گیا۔ بعدازاں اسے 'پنشن' پر بھیج دیا گیا اور لاہور کی ایک مرکزی سڑک پر نصب کر دیا گیا۔ کپلنگ نے 'کم کی توپ' کا نام دے کر اسے دوام بخشا۔

2۔ نہنگ فارسی زبان کا لفظ ہے جس کے معنی مگرمچھ کے ہیں۔ یہ دستہ سکھوں میں بہت مشہور ہوا۔ نہنگ ہمیشہ نیلی پگڑی پہنے رکھتے اور اپنی زندگی سکھ قوم کی خدمت کے لیے وقف کی ہوئی تھی۔ آج کل یہ گروہ زوال کا شکار ہو کر بھکاریوں اور نشہ بازوں کے گروہ کی حیثیت اختیار کر گیا ہے۔ نہنگ سکھوں کو اکالی بھی کہا جاتا ہے۔ تاہم جو بھی ہو سکھوں کا یہ گروہ نہایت ہی دلچسپ ہے۔ سروانٹیز کے ''ڈان کہوتے'' کی طرح جو ہمیشہ بڑی بڑی ڈینگیں مارتا ہے۔ ایک نہنگ خود کو سوالاکھ کے برابر کہتا ہے یا ایک پوری فوج کے برابر۔ جب وہ پیشاب کے لیے جاتا ہے تو یہ نہیں کہتا کہ وہ پیشاب کرنے جا رہا ہے بلکہ یہ کہتا ہے کہ وہ چتوڑ کا قلعہ فتح کرنے یا قاضی کی پیاس بجھانے جا رہا ہے۔ اس کے نزدیک موت تو محض آگے بڑھنے کا ایک حکم ہے۔ نہنگوں کی لغت میں عام خوراک مثلاً چنے ''بادام'' ہیں؛ پیاز ''چاندی کی اشرفیاں'' اور سبز مرچ ایک ''جھگڑالو قسم کی لڑکی'' ہے اگر کسی نہنگ کی ایک آنکھ نہ بھی ہو تو اسے ''لکھ نیتر اسنگھ'' یعنی ایک لاکھ آنکھوں والا شیر کہہ کر پکارا جاتا ہے وغیرہ وغیرہ۔

پھلا سنگھ 1761 میں امرتسر کے گاؤں شینو میں پیدا ہوا اور اوائلِ عمری میں ہی نہنگ دستے میں شامل ہو گیا۔ مہاراجا نے اسے خاصی چھوٹ دی ہوئی تھی۔ ایک واقعے کے مطابق ایک مرتبہ رنجیت سنگھ اپنے سب سے بڑے ہاتھی پر سوار اس بالکنی کے پاس سے گزرا جہاں پھلا سنگھ کھڑا تھا۔ پھلا سنگھ جو رنجیت سنگھ کے جلوس کو دیکھ رہا تھا بلند آواز میں مہاراجا سے دریافت کرتا ہے ''اوئے کانے یہ بھینسا/ سانڈ کہاں سے ملا؟'' مہاراجا نے نہایت عاجزی سے دونوں ہاتھ جوڑ کر

جواب دیا' حضور نے ہی تو یہ تحفہ مجھے عنایت کیا ہے'۔

باب 5

1۔ 19 مارچ 1801

2۔ 16 اگست 1802

3۔ 14 دسمبر 1805۔ ایک مراسلے میں لیک لکھتا ہے: ''میں نے دریائے بیاس کے کنارے پڑاؤ ڈالنے کا فیصلہ کیا یہ مقام لدھیانہ سے 45 میل اور امرتسر سے 35 میل کے فاصلے پر واقع ہے۔ یہاں نہ صرف مجھے تمام ضروریاتِ زندگی حاصل ہیں بلکہ میری موجودگی سے رنجیت سنگھ کو جسونت راؤ ہولکر کے خلاف تمام ثبوت بھی مل چکے ہیں اور وہ اسے سردار بننے سے روکنے میں کامیاب ہو چکا ہے۔''

4۔ رنجیت سنگھ نے اس فرار کی بابت اپنے کئی دوستوں سے بات کی اور ان دونوں کے درمیان جو بات ہوئی اس کے حوالے سے ایک لفظ بھی نہ کہا۔ لارڈ لیک بھی اس واقعے کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔

باب 6

1۔ 29 ستمبر 1805

2۔ پٹیالہ سے جاری ایک رسالے میں جس پر 4 نومبر 1806 کی تاریخ درج ہے اس واقعے کی یوں منظر کشی کی گئی ہے: ''سرداروں کا یہ اجلاس دریا کے کنارے منعقد ہوا جس میں دونوں جانب سے تمام احتیاطی تدابیر کی گئی تھیں۔ رنجیت سنگھ کو مکمل عزت و احترام دیا گیا تھا۔ پٹیالہ کے صاحب سنگھ نے اس سے مخاطب ہو کر کہا: ''جسونت سنگھ (نابھا) نے میرے ساتھ نہایت غیر معمولی سلوک کیا ہے''۔ رنجیت سنگھ نے جواب دیا: ''وہ تمہارا بھائی ہے؛ اور تم سب میرے لیے یکساں ہو۔ میں تو صرف تمہارے باہمی جھگڑے نمٹانے آیا ہوں۔'' راجا صاحب سنگھ نے یہ سن کر کہا: ''اگر تم مجھے بھاگ سنگھ (جند) اور جسونت سنگھ کے برابر حیثیت دیتے تو کبھی مجھ پر وحشیانہ انداز میں گولی نہ چلاتے۔'' رنجیت سنگھ نے کہا: ''ایسا تمہارے بھائی اور چچا کی درخواست پر ہوا ورنہ میں تمہیں خود سے بڑھ کر گردانتا ہوں۔'' صاحب سنگھ نے جواباً کہا: ''آج سے میں تمہارا وفادار ہوں۔'' بھائی لعل سنگھ (کیتھال) نے اس موقع پر رنجیت سنگھ سے مخاطب ہو کر کہا: ''تم ہمارے قبیلے کے سردار اور امید کی کرن ہو۔ اب چونکہ تم اس علاقے میں آ گئے ہو تم اپنی اچھائی اور بہترین سوچ سے تمام فیصلے کرو گے۔'' صاحب سنگھ کے شکوک رفع ہونے کا نام نہیں لے رہے تھے۔ اخبار آگے چل کر لکھتا ہے: ''اس مکالمے کے بعد صاحب سنگھ نے رانی سے بات کرتے ہوئے رنجیت سنگھ کو بہت بڑے مکار اور دشمن کا خطاب دیا۔''

3۔ مسلمان اور انگریز تاریخ دانوں کی بڑی تعداد کے مطابق یہ بچے مہتاب کور سے نہیں تھے بلکہ نچلی ذات کی عورتوں سے

لیے گئے تھے۔ان بچوں کو ان کی ماں کی وفات کے بعد رنجیت سنگھ کے حکم پر گود لیا گیا تھا۔ان تاریخ دانوں کا یہ بھی خیال ہے کہ رنجیت سنگھ ان بچوں کو اپنے بچے ماننے پر بھی تیار نہیں تھا اور ان پر بالکل توجہ نہیں دیتا تھا۔یہ دونوں نظریات غلط ہیں۔تاریخ دان ان بچوں کو شاید اس لیے ناجائز سمجھ رہے ہیں کہ رنجیت سنگھ کے مہتاب کور اور اس کی ماں سدا کور سے تعلقات اچھے نہیں تھے۔مہتاب کور کا تو زیادہ تر وقت اپنی ماں کے ہاں گزرتا تھا۔رنجیت سنگھ نے نوجوان شہزادوں پر زیادہ توجہ نہیں دی اور بڑا بیٹا کھڑک سنگھ اس کا پسندیدہ منظور نظر رہا۔جب سدا کور کی حکومت جاتی رہی اور شہزادوں نے مہاراجا کے ساتھ آ کر رہنا شروع کر دیا کھڑک سنگھ اور اس کی ماں کی وجہ سے ان افواہوں کو تقویت ملی کہ وہ رنجیت سنگھ کی طرف سے شیر سنگھ کو ترجیح دیئے جانے کے خلاف کوئی تدبیر کریں گے (کھڑک سنگھ نے اس حوالے سے گورنر جنرل کو ایک خط بھی ارسال کیا)۔کسی کو ناجائز قرار دینا اسے ثابت کرنے یا جھٹلانے سے کہیں آسان ہے۔تاہم اگر باپ کا اولاد سے روا رکھنے والا رویہ اس کا معیار سمجھا جائے تو یہ بات واضح ہے کہ رنجیت سنگھ انھیں اپنا ہی خون سمجھتا تھا۔اس کے دربار کے تاریخ دان ہمیں بتاتے ہیں کہ ان بچوں کی پیدائش کی خبر پر رنجیت سنگھ بہت خوش ہوا تھا اور تمام دربار کا ماحول خوشگوار ہو گیا تھا۔

باب 7

1۔ سیٹن نے گورنر جنرل کے نام 18 فروری 1808 کو ایک مراسلہ بھیجا اپریل 1808 کے مراسلے میں بھی یہی بات کی گئی تھی۔

2۔ ای تھامپسن، لارڈ مٹکاف

3۔ مٹکاف کے دورے سے پہلے ایک اور انگریز کیپٹن میتھیوز ملاوہ سرداروں سے ملاقات کر چکا تھا اس کے اور سدا کور کے درمیان خفیہ مذاکرات بھی ہو چکے تھے۔اس نے اپنے مراسلے میں سدا کور کو رنجیت سنگھ کی خلاف غصے اور انتقام سے بھرا ہوا بتایا۔میتھیوز نے رنجیت سنگھ کی ذات، کردار، انتظامی فیصلوں اور فوجی قوت کے بارے میں برطانوی سرکار کو تفصیل سے لکھا۔اس کے مطابق رنجیت سنگھ کے پاس بندوق بردار فوجیوں کی چودہ بٹالین تھیں اور ہر بٹالین میں ایک ہزار فوجی تھے؛ چھ ہزار گھڑ سوار تھے اور گیارہ پیتل کی بنی چھوٹی بندوقیں تھیں۔سپاہیوں کو اچھی تنخواہوں پر رکھا جاتا تھا۔۔۔یعنی 8 روپے سے 10 روپے ماہانہ۔نو سو سپاہی ایسے بھی تھے جنھوں نے کمپنی کی نوکری ترک کر کے مہاراجا کی فوج میں شمولیت اختیار کر لی تھی۔لاہور کے انتظام وانصرام کے بارے میں میتھیوز لکھتا ہے: ''پنجاب کا یہ حصہ اور جہاں جہاں مہاراجا کی عملداری ہے وہاں پولیس اور انتظامیہ کی مکمل گرفت ہے۔یہ علاقے مسافروں کے لیے محفوظ تصور کیے جاتے ہیں اور ایسا شاذو نادر ہی ہوا ہے کہ پنجاب میں کہیں سنگین جرم کی واردات ہوئی ہو۔''

مہاراجا نے 23 جون 1808 کو میتھیوز کو شرفِ ملاقات بخشا۔ اس (میتھیوز) کی نظر میں رنجیت سنگھ شاندار انسان ہے ایک صاحبِ عقل اور کھلے ذہن کا شخص۔ رنجیت سنگھ کا دوستانہ برتاؤ اور تعصبات سے پاک سوچ اسے دوسروں سے ممتاز کرتی ہے۔

راجا نہ صرف اچھے برتاؤ کا مالک اور لگی لپٹی کے بغیر بات کر دینے والا شخص ہے بلکہ اس کی معاملات کو سمجھنے کی حس بھی قابلِ تحسین ہے۔ وہ ایک بہادر شخص ہے اور ایک سپاہی کی طرح دکھائی دیتا ہے۔ اسے فوجی مشقوں کا بھی بہت شوق ہے۔ اس کے جوان اُس سے ڈرتے مگر اس پر یقین رکھتے ہیں اور اس نے کئی قلعوں پر حملوں میں لشکروں کی سربراہی کی ہے، اسے اپنی قسمت پر مکمل یقین ہے اور اس کے مطابق جو کچھ آپ کے نصیب میں ہے وہ ہو کر رہے گا۔ وہ بہت اچھا شہسوار ہے اور روزانہ صبح سویرے ہموار زمین پر سات بجے تک گھڑ سواری کرتا ہے اس کے ہمراہ بہت کم مصاحبین ہوتے ہیں۔ اس کے پاس اچھے نسلی گھوڑوں کی بڑی تعداد ہے جو وہ ایران اور قندھار سے لایا ہے لیکن بہترین گھوڑے صرف اس ریاست میں پائے جاتے ہیں۔

4۔ 20 جون 1808

5۔ 18 اگست 1808

6۔ مٹکاف نمبر 8، 24 اگست 1808

7۔ ان مذاکرات سے رنجیت سنگھ کی ساس سدا کور کے کردار کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ سدا کور اپنے داماد کے ساتھ نہایت جذباتی حد تک وفاداری اور نفرت میں تقسیم تھی۔ انگریزوں کو سب سے پہلے یہ پیغام پہنچانے والی بھی وہی تھی کہ پنجاب پر حملے کی صورت میں انھیں اس کا مکمل تعاون حاصل ہوگا۔ اس کی بیٹی مہتاب کور خود کیپٹن میتھیوز کے پاس اپنی ماں کا پیغام لیکر گئی۔ لیکن جب جنگ کا خطرہ پیدا ہو گیا تو اپنے داماد رنجیت سنگھ کو روکنے والی بھی وہی تھی۔ سدا کور کے علاوہ دو غلے کردار کے مالک افراد میں رنجیت سنگھ کا چچا جند کا بھاگ سنگھ بھی شامل تھا۔

8۔ فرانسیسیوں کے منصوبے کے بارے کمپنی کو ملنے والی اطلاع غلط ثابت ہوئی۔

9۔ سوہن لال سوری مٹکاف کے مشن کے حوالے سے اپنی رپورٹ میں فرانس کا ذکر تک نہیں کرتا۔ وی. جی کیرنن کے خیال میں، اس کی کتاب 'مٹکاف کا مشنِ لاہور' کی روشنی میں ''رنجیت سنگھ کے ساتھ ہونے والے مذاکرات میں فرانس کا حوالہ بہت کم تھا اور نپولین کا ان مذاکرات پر اثر انداز ہونا ایک مفروضے سے زیادہ کچھ نہیں تھا۔ ان مذاکرات کا ایک مقصد کمپنی کی جانب سے پنجاب میں اپنا اثر رسوخ قائم کرنا تھا۔''

10۔ اس انگریز (مٹکاف) کی کارکردگی اتنی بری بھی نہیں تھی۔ دربارِ پنجاب اور انگریز سرکار کے درمیان تناؤ کی کیفیت ختم

ہوتے ہی مٹکاف اپنی مقامی معشوقہ کی بانہوں میں جھولنے لگا۔لیکن اُس سکھ (مہاراجا رنجیت سنگھ) کے برعکس جو اپنے اور موہراں کے معاشقے کی بابت ہر ایک کو بتاتا پھر رہا تھا مٹکاف نے اپنے تعلق کو مرتے دم تک خفیہ رکھا (صرف اپنی وصیت میں اس نے امرتسر میں اپنے معاشقوں کے نتیجے میں پیدا ہونے والی اولاد کا ذکر کیا؛ مٹکاف کے قابل فخر خاندان میں پنجاب کی کسی مقامی نسل کا گندا خون بھلا کیسے شامل ہوسکتا تھا)۔اس کی وراثت کی داستانیں اس کے ساتھ ہی دم توڑ گئیں۔یہ امر باعثِ حیرت ہے کہ اس کا سرکاری سوانح نگار کائے اس کی ہندوستانی معشوقہ کا کوئی ذکر نہیں کرتا۔اگرچہ وہ ان بچوں کا ایک دو جگہوں پر مبہم انداز میں حوالہ دیتا ہے جو اس کی معشوقہ سے پیدا ہوئے۔کائے نے رنجیت سنگھ کی کثرت مے نوشی اور عشق ونشاط کی محفلوں کا جا بجا ذکر کیا ہے لیکن اس نے مٹکاف کی ایسی عادات کا ذکر کرنے میں غیر معمولی احتیاط سے کام لیا ہے اور انھیں نظر انداز کرنے کی پالیسی پر عمل پیرا رہا ہے۔ایڈورڈ تھامسن کے مطابق مٹکاف نے دراصل ایک سکھ عورت سے ہندوستانی رسوم ورواج کے مطابق شادی رچائی تھی۔اگر وہ سکھ دھرم کے مطابق شادی کرتا تو اسے خود بھی سکھ ہونا پڑتا

11۔ مٹکاف،نمبر 42، 11 دسمبر 1808

12۔ مٹکاف نمبر 43، 12 دسمبر 1808

13۔ مٹکاف نے رنجیت سنگھ کی عجلت میں امرتسر سے روانگی کی ایک دوسری وجہ بیان کی ہے۔14 دسمبر 1808 کو لکھے گئے ایک خط میں وہ بیان کرتا ہے: ''اس کی پسندیدہ معشوقہ موہراں جو عقیدے کے لحاظ سے مسلمان تھی اور ابھی حال ہی میں ہندو کھتری دھرم اختیار کیا ہے، (اپنی مرضی سے یا زورزبردستی کی وجہ سے یہ میں نہیں جانتا)۔اس عقیدے کی تبدیلی کی بنا پر امرتسر کا قصبہ تناؤ کا شکار ہے۔یہاں کی آبادی نے اگلے روز اس محلے کی تمام مسلمان رقاصاؤں کے گھروں میں گھس کر توڑ پھوڑ کی جس سے موہراں کا تعلق تھا اور راجا کو مجبور کیا کہ انھیں شہر سے دور منتقل کیا جائے۔

14۔ مٹکاف دربار کے سرداروں کی وفاداریوں کو ہمیشہ تنازعات کے دنوں میں جانچنے کی کوشش کرتا اور ان کے بارے میں اپنی سرکار کو مسلسل باخبر رکھتا۔جن افراد کے بارے میں وہ سرکارِ برطانیہ کو باخبر رکھتا ان میں انگریزوں کے ساتھ آنے والے دنوں میں تعاون کرنے والی رنجیت سنگھ کی ساس سدا کور کا نام بھی شامل تھا۔

15۔ اس نے امرتسر دربار پر دو ہزار چھ سو پانچ روپے کا نذرانہ پیش کیا اسے کامل یقین تھا کہ دربار پر اس کا نذرانہ قبول کیے جانے کا مطلب تھا تمام سکھ برادری کی جانب سے اس کو شرفِ قبولیت بخشا جانا۔(مٹکاف، نمبر 46، 15 دسمبر 1808)۔اس کی سوچ کے بارے میں سب کو خبر ہوگئی اور جونہی وہ دربار سے باہر نکلا اس کی طرف سے دیا جانے والا چڑھاوا دربار کی عمارت سے باہر پھینک دیا گیا۔

16۔مٹکاف،نمبر48،18دسمبر1808

17۔مٹکاف،نمبر50،20دسمبر1808

18۔مٹکاف،نمبر51،22دسمبر1808

19۔لارڈ اکٹرلنی کو یہ معلومات رنجیت سنگھ کے دربار میں موجود اس کے مخبر نے پہنچائیں۔اس کے مطابق سدا کور نے رنجیت سنگھ پر زور دیا تھا کہ وہ انگریزوں کے ساتھ کسی قسم کی چپقلش سے باز رہے۔رنجیت سنگھ نے اس کے مشورے کو اس لیے بغور سنا اور اس پر عمل کیا کیونکہ یہ بات ایسی عورت کر رہی تھی جو ہمیشہ اس کے طرزِ عمل پر نالاں رہی تھی اور مسلسل شکائتیں کرتی چلی آ رہی تھی۔

20۔مٹکاف،نمبر58،12جنوری1809

21۔ان ملاقاتوں میں سے ایک میں محکم چند نے خبردار کیا تھا: ''تم نے کبھی سکھ سپاہیوں کو جنگ کرتے نہیں دیکھا'' جواباً مٹکاف نے کہا ''تم نے بھی انگریز سپاہیوں کو لڑتے نہیں دیکھا''

22۔مٹکاف،نمبر63،26جنوری1809

23۔اکٹرلنی کے دستوں کے پیدل مارچ کے دوران رونما ہونے والا ایک واقعہ اس وقت انگریزوں کی نفسیات پر بہتر روشنی ڈالتا ہے: ''رنجیت سنگھ کے دو پیغام رساں اکٹرلنی کو ناٹھی گاؤں کے قریب ملے اور مٹکاف کے غصیلے اور مغرور رویے کے خلاف دربار کی طرف سے عرض داشت پیش کی انھوں نے یہ بھی کہا کہ مٹکاف نے رنجیت سنگھ کو اس کے زیرِ اثر علاقوں کے حوالے سے کسی قسم کی یقین دہانی یا صفائی دینے سے انکار کر دیا ہے۔اکٹرلنی ان کی شکایات کا خلاصہ برطانوی حکومت تک پہنچانے پر رضامند ہو گیا اور دو روز کے لیے وہیں رک گیا تا کہ رنجیت سنگھ کے نمائندے دربار کو اس کی اطلاع دے سکیں۔اس نے یہ بھی نہ سوچا کہ اس طرح رکنے سے اس کی حکومت کو کوئی خاص فرق نہیں پڑنے والا کیونکہ وہ پہلے ہی جنگ نہ کرنے کی یقین دہانی کرا چکی ہے۔اُدھر مٹکاف نے دربار کے اس اقدام کو اپنی توہین گردانا۔گورنر جنرل نے اکٹرلنی کی سرزنش کرتے ہوئے اسے اپنا سفر جاری رکھنے کا حکم دیا۔اس پر اکٹرلنی نے اپنے عہدے سے استعفیٰ دے دیا اور بعد ازاں اسے استعفیٰ واپس لینے پر مجبور کیا گیا۔

اکٹرلنی کو یوں لگا گویا مٹکاف کی یہ رپورٹیں کہ رنجیت سنگھ کا ملاوا میں کوئی اثر و رسوخ نہیں غلط ہیں۔جوں جوں وہ اس علاقے میں آگے بڑھتا گیا اس نے ستلج کے پار بھی رنجیت سنگھ کا اچھا خاصا اثر رسوخ دریافت کیا اور اسے اس پر بہت حیرت ہوئی۔اس کے خیال میں یہ بات سرکارِ برطانیہ کے لیے پریشانی کا باعث ہو سکتی ہے۔اس کے علاقے کے چند سردار خاص طور پر جودھ سنگھ کالسیہ اپنے علاقے چھوڑ کر دریا کے پار رنجیت سنگھ کی سلطنت میں جانے کا فیصلہ کر چکے

تھے۔انھوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ میں رنجیت سنگھ کی مدد کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

24۔مٹکاف،نمبر72، 7مارچ1809

25۔نہ ہی یہ داستان برطانوی مورخ نے گھڑی تھی کہ اگر چہ سپاہی تعداد میں کم تھے مگر انھوں نے اکالی دستوں کا خوب رگڑا نکالا تھا۔رنجیت سنگھ ان کی کارکردگی سے اتنا متاثر ہوا کہ اس نے اپنی فوج کو یورپی طرز پر استوار کرنے کا فیصلہ کرلیا۔اس کی فوج نے 1803 سے یورپ کی افواج کی طرز پر استوار ہونا شروع کر دیا تھا۔

26۔رنجیت سنگھ کے نقاد بھی اس کی طرف سے مٹکاف، اکٹرلی، ویڈ، جیک مونٹ اور سر الیگزنڈر برنز کے ساتھ آبرومندانہ رویہ اپنانے پر اس کے گرویدہ نظر آتے ہیں۔

باب8

1۔ سوہن لال کی رائے قدرے مختلف ہے۔اس کے مطابق عطا محمد نے شجاع کو اس کے بھائی جہاں داد کے گھر سے دعوت کے بہانے اپنے پاس بلوایا اور پھر اسے قید خانے میں ڈال دیا۔سوہن لال کے مطابق اُس کے الفاظ یہ تھے: ''اگر تم نے ہمارا ساتھ دینے کا فیصلہ کیا تو ہمارے تمام مقاصد پورے ہو جائیں گے اور ہماری خواہشات کی رانی ہمارے پہلو میں جلوہ گر ہوگی۔''

2۔ 21فروری1812

باب9

1۔ دلہن کے باپ جیمال سنگھ کو بارات کے کھانے پر صرف اس ایک روز کے لیے 15,000 روپے صرف کرنا پڑے جب بارات لاہور سے روانہ ہوئی۔اس کے علاوہ اس نے رنجیت سنگھ کو دُلہے کی طرف سے دی جانے والی دعوت کے لیے 50000روپے الگ سے دیے۔

باب10

1۔ سوہن لال یہ بات واضح طور پر بیان کرتا ہے: وفا بیگم کا دکھ اور پریشانی سے برا حال تھا۔اس نے مہاراجا کو یہ پیغام بھجوایا: ''اگر مہاراجا کوشش کر کے عزت مآب شاہ کو بازیاب کروا کر لاہور لے آئے تو اس کے معاوضے کے طور ایک انمول ہیرا مہاراجا کی نذر کیا جائے گا۔''

2۔ برنز،ٹریولز صفحہ 237

3۔ اس معاہدے کے اصل مندرجات کا کسی کو علم نہیں۔برطانوی ذرائع کے مطابق رنجیت سنگھ کو سالانہ گیارہ لاکھ روپوں یا آدھے کشمیر کی پیشکش کی گئی تھی (مٹکاف کا گورنر جنرل کے نام مراسلہ 8 جنوری، 1813)

4۔ 26مارچ1813

5۔ بعض حوالوں کے مطابق شیر گڑھ کا گورنر شجاع کے آگے ہتھیار ڈال چکا تھا اور اور قلعے پر قبضہ کیے جانے سے پہلے ہی جان بخشی کی درخواست کر چکا تھا اور وزیر فتح خان نے شجاع کا بھاری تاوان ادا کیا۔ شاہ نے خود یہ پیش کش کی کہ ایک بار شیر گڑھ اس کی اطاعت قبول کر لے تو وہ جہاں مرضی آئے جا سکتا تھا اور اس نے لاہور جانے کا فیصلہ کیا جہاں اس کا خاندان مقیم تھا سوہن لال اس سے پہلے والے خیال کا حامی ہے۔

6۔ برطانوی حکومت نے اس قلعے پر افغانیوں کی بجائے پنجابیوں کے قبضے کو خوش آئند قرار دیا۔ اس سے افغانیوں کی طرف سے یا کسی بھی غیر ملکی قوت کی طرف سے ہندوستان پر چڑھائی مشکل ہوگئی تھی۔ سوہن لال کے مطابق مٹکاف نے رنجیت سنگھ کو مبارکباد کا ایک خط بھی لکھا اور یہ نصیحت کی کہ اس قلعے پر اپنا قبضہ کبھی ترک نہ کرے اس نے رنجیت سنگھ کو اشاروں کنائیوں میں ضرورت پڑنے پر برطانوی فوج کی مدد کا بھی یقین دلایا۔

7۔ کوہِ نور یعنی 'روشنی کا پہاڑ'۔ شاید دنیا کے تمام ہیروں سے زیادہ قیمتی یہ پتھر گولکنڈہ کی مشہورِ زمانہ کان سے نکالا گیا تھا سب سے پہلے یہ مغل شہنشاہوں کے ہاتھ لگا۔ ایران کا نادر شاہ 1739 میں دہلی کو تہس نہس کرنے کے بعد تختِ طاؤس اور کوہِ نور ہیرے کو مغل بادشاہ محمد شاہ سے چھین کر اپنے ہمراہ ایران لے گیا۔ نادر شاہ کے قتل کے بعد یہ ہیرا احمد شاہ ابدالی کے ہاتھ لگا اور اس کی موت کے بعد اس کے بیٹے اور جانشین تیمور کے ہاتھوں میں آ گیا۔ تیمور کے بہت سے بیٹے تھے جو باپ کے مرتے ہی تخت پر قبضے کی خاطر ایک دوسرے کے مقابلے میں صف آرا ہو گئے۔ اس کی وفات کے وقت اس کا پانچواں بیٹا شاہ زمان دارالحکومت کابل میں موجود تھا۔ اس نے موقع سے فائدہ اٹھا کر حکومت پر قبضہ کر لیا اور تمام شاہی خزانوں پر بھی۔۔ جن میں کوہِ نور ہیرا بھی شامل تھا۔ افغانستان پر اس (شاہ زمان) کا سات سالہ دورِ حکمرانی جس میں ہندوستان پر قبضہ کرنے کی کوششیں بھی شامل تھیں اس وقت اختتام پذیر ہوا جب اس کے ایک بھائی محمود نے اس کی آنکھیں نکلوا کر اندھا کر دیا اور اسے تمام مال و دولت سے محروم کر دیا۔ زمان سے یہ ہیرا ایک اور بھائی شاہ شجاع اور اس کی بیوی وفا بیگم کے قبضے میں آ گیا۔ شاہ شجاع سے ہی کوہِ نور رنجیت سنگھ کی ملکیت میں آیا۔

8۔ وہ تمام تاریخ دان جو رنجیت سنگھ سے بغض رکھتے ہیں جان بوجھ کر کوہِ نور ہیرے کا تذکرہ نہیں کرتے۔ خوش قسمتی سے شاہ شجاع نے خود یہ واقعہ تفصیل سے بیان کیا ہے۔ شاہ شجاع شیر گڑھ سے رہائی پانے کے بعد اس واقعے کو یوں بیان کرتا ہے: 'رنجیت سنگھ کی طرف سے محکم سنگھ ہم سے ملا اور ہم کو اطلاع دی کہ اس کا مالک لاہور کی جانب ہماری جلد از جلد واپسی کا منتظر ہے اور چاہتا ہے کہ ہم وہاں زنان خانے میں جا کر بیگمات سے ملیں۔ اس (محکم چند) کے مطابق ہمارے وہاں جانے سے اس کے مالک کی شہرت میں اضافہ ہوگا۔' شاہ زمان محکم چند کے ہمراہ لاہور پہنچا۔ وہ آگے چل

کر لکھتا ہے: ''دوسرے روز صبح سویرے، رام سنگھ ہمارا منتظر تھا اس نے اپنے آقا رنجیت سنگھ کی طرف سے ہم سے کوہِ نور ہیرا اسے دینے کا مطالبہ کیا۔ ہم نے اعتراف کیا کہ یہ ہیرا ہمارے پاس موجود ہے اور رنجیت سنگھ کی مہمان نوازی اور مدد کے پیشِ نظر ہم اس کی درخواست پر ضرور غور کریں گے۔ رام سنگھ پورا ایک دن وہیں موجود رہا اور اگلے روز اس نے پھر وہی مطالبہ کیا اور ہماری جانب سے اس کو وہی جواب ملا۔ اس واقعے کے بعد ہمیں ضروریاتِ زندگی سے محرومی کا تجربہ ہوا اور ہماری رہائش کے باہر پہرہ بٹھا دیا گیا۔'' رنجیت سنگھ کی طرف سے شاہ شجاع کو 40 ہزار سے 50 ہزار روپے دیئے جانے کی پیش کش ہوئی مہاراجا نے اسے کھوئے ہوئے علاقے واپس لینے میں مدد دینے کی پیش کش بھی کی اور شاہ زمان اس پیش کش کو قبول کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ پھر مہاراجا نے شاہ زمان کو پگڑیوں کے تبادلے کی تجویز دی۔ سکھ دھرم میں پگڑیوں کا تبادلہ ہمیشہ کی دوستی اور تعلق کو قائم رکھنے کے عہد کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ ''اس تجویز کے سامنے آنے کے بعد ہم نے وہ ہیرا رنجیت سنگھ کے حوالے کر دیا۔ ہیرا دیے جانے کے دو روز بعد ہی ہم پر لگی پابندیاں ہٹا دی گئیں اور اب ہمیں اپنے خاندان والوں سے ملنے سے کوئی نہیں روک سکتا تھا'' (کلکتہ ماہانہ رسالہ، 1839) شاہ زمان نے اپنی سوانح کے حوالے سے ایک مضمون میں یہ تفصیلات بیان کی ہیں۔ اس نے 1826-1827 میں لدھیانہ میں اپنے قیام کے دوران یہ مضمون تحریر کیا جس کا توپ خانے کے لیفٹیننٹ بینٹ نے ترجمہ کیا۔

یہ تمام حقائق مل کر بھی رنجیت سنگھ کی ذاتی حیثیت کو گہنا نہیں سکتے۔ اگر وہ پناہ گزینوں کو زبردستی کوہِ نور ہیرے سے محروم کرنا چاہتا تو اسے روکنے کی مجال کسی میں نہ ہوتی۔ اسے اچھی طرح علم تھا کہ کوہِ نور ہیرا ان کے پاس فروری 1810 سے موجود تھا جب وفا بیگم اس کی زندگی میں داخل ہوئی تھی اور 1813 میں ہی نایاب پتھر اس کی ملکیت میں چلا گیا۔ اگر اس امر کو مدِ نظر رکھا جائے کہ آخر کتنے لوگوں کا خون بہا کر کوہِ نور ہندوستان سے باہر لے جایا گیا تو زبردستی اس نایاب پتھر کا حصول بھی جائز سمجھا جاتا لیکن جس طریقے سے رنجیت سنگھ نے یہ ہیرا حاصل کیا ایسا کوئی عزت دار شخص ہی کر سکتا ہے۔

9۔ شجاع نے بذاتِ خود اکٹرلنی کو خط لکھا اور اس کے منصوبے کا حصہ بننے کے لیے اپنی رضامندی ظاہر کرتے ہوئے اپنے میزبان سے بے وفائی کرنے کا فیصلہ کیا۔ مندرجہ بالا منصوبے کی روشنی میں اس نے اپنے سابق دشمن وزیر فتح خان کو لکھا کہ وہ آ کر پنجاب پر قبضہ کر لے۔ نومبر 1813 کے خط کے مطابق: ''دو ماہ پہلے میرے بھائی محمود کا پیغام لے کر محمود حسین خان یہاں لاہور آیا۔ دراصل اس نے آگے آپ کی خدمت میں پیش ہونا تھا۔ اس کے لاہور پہنچتے ہی مہاراجا کے آدمیوں نے وہ خفیہ خطوط برآمد کر لیے (جن میں ہم نے مہاراجا کو تخت سے ہٹانے کا منصوبہ بنایا تھا) اور نتیجتاً محمود حسین کو دو ماہ جیل کی سزا ہو گئی۔'' شجاع نے اپنا مدعا بیان کرنے کے لیے اپنا خاص ایلچی محمد عامر اکٹرلنی کے پاس بھجوایا

اس کے خط کے مطابق: ''چونکہ ہم (ہندو اور مسیحی قوم) ایک خدا کی عبادت کرتے ہیں یہ ہماری مشترکہ ذمہ داری ہے کہ ہم رنجیت سنگھ کے دربار میں بڑی تعداد میں موجود کافروں اور ملحدوں کے قبیلے کو جڑ سے اکھاڑ پھینکیں۔ جونہی جنگ کا شعلہ بھڑکے گا اور وزیر فتح خان کا لشکر دشمن کے خلاف حرکت میں آئے گا، خدا نے چاہا تو ہم دشمن کو تتر بتر کرنے کے بعد پنجاب کو آپس میں تقسیم کر دیں گے'۔ اصل میں منصوبہ یہ تھا کہ جب لاہور کی فوجیں وزیر فتح خان سے نبرد آزما ہو رہی ہوں گی اس کا بھائی عظیم خان جو کہ اس وقت کشمیر کا گورنر تھا لاہور پر چڑھائی کر دے گا اور کافروں کا مسئلہ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے حل ہو جائے گا۔

لدھیانہ آمد کے بعد وفا بیگم نے گورنر جنرل کو کئی خطوط بھیجے اور ان حالات کے بارے تفصیلاً بتایا جن میں اسے لاہور آنا پڑا تھا اپنے خطوط میں وفا بیگم نے گورنر جنرل سے درخواست کی کہ وہ اس کے شوہر کو رہائی دلوانے کے لیے مداخلت کرے۔ اس نے لکھا: 'ہمارا رنجیت سنگھ سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا تاہم جب ہم اس کے علاقے میں پناہ لینے پر مجبور ہوئے تو اس نے بادشاہ کی رہائی کو ممکن بنانے میں ہماری مدد کی اور مختار الدولہ (وزیر فتح خان) کے بیٹوں سے بادشاہ (شاہ شجاع) کو نجات دلوائی۔ ان دونوں خطوط میں وفا بیگم نے اس بات کا کہیں ذکر نہیں کیا کہ رنجیت سنگھ نے اس سے کوہِ نور ہیرا زبردستی حاصل کیا۔ تیسرے خط میں اس نے یہ بات تسلیم کی کہ اس کا شوہر رنجیت سنگھ کا مہمان ہونے کے باوجود اس کے خلاف سازشوں میں مصروف رہا۔ ''بادشاہ سلامت آپ سے ملنا چاہتے تھے اور اس بات پر تبادلہء خیال کرنا چاہتے تھے کہ دونوں ریاستوں کے حق میں کیا بہتر ہے۔ تاہم خدا کو کچھ اور منظور تھا اور اس منصوبے کی مہاراجا رنجیت سنگھ کو خبر ہوگئی اور اس نے بادشاہ سلامت پر پہرہ بٹھا دیا۔''

یہ بات واضح ہے کہ شجاع نے ایک ہی وقت میں وزیر فتح خان (جس نے محمود کا تختہ الٹنے اور شجاع کی مدد کرنے کا فیصلہ کیا تھا) اور انگریزوں دونوں کے ساتھ مذاکرات شروع کر دیئے تھے۔ وزیر نے تجویز دی تھی کہ پنجاب پر دونوں اطراف سے چڑھائی کی جائے۔ اپنے خط میں اس نے شاعرانہ انداز میں اپنے منصوبے کو کچھ یوں بیان کیا تھا۔

'میں گہرے پانیوں میں ڈوبنے کو تیار ہوں مگر اپنی خواہش کے موتی کو حاصل کرنے کے لیے پوری طرح تیار، میرا ارادہ مضبوط ہے اور میں اس پر عمل پیرا ہو کر رہوں گا، یا تو میری خواہش کی تکمیل کا قرمزی رنگ میرے چہرے پر چمکے گا یا پھر میری زندگی سے بے جان رگوں میں جم جائے گا۔ اس کے علاوہ کوئی راستہ نہیں'۔

10۔ اُس کا فرار بالکل ڈرامائی انداز میں ہوا۔ شاہ شجاع اور اس کے کارندوں نے مبارک حویلی سے شہر کی مرکزی بدرو تک سرنگ کھودی۔ پھر ایک رات اس کا ایک غلام شاہ کے کپڑوں میں ملبوس اس کی نشست پر جلوہ گر رہا جبکہ شاہ اس سرنگ کے ذریعے شہر کی سرحد سے باہر چلا گیا جہاں ایک سواری اس کا انتظار کر رہی تھی۔ جب تک اس کے فرار کا کسی کو علم ہوتا

شاہ شجاع رنجیت سنگھ کے چنگل سے باہر جا چکا تھا۔ رات کے وقت سفر کرتے ہوئے شاہ شجاع سیال کوٹ سے کشمیر اور پھر وہاں سے پہاڑ پار کرنے کے بعد کولو وادی پہنچا اور پھر شملہ سے میدانی راستہ اختیار کرتے ہوئے لدھیانہ میں موجود وفا بیگم اور اپنی چھ سو بیویوں کے پاس پہنچ گیا۔

باب 11

1۔ سر اولف کرو نے اس جنگ کو مختلف انداز سے بیان کیا ہے، پٹھان، صفحہ 289

2۔ 6 اگست 1813

3۔ پرنسپ کے بیان سے کہیں یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ عظیم خان نے رام دیال کے دادا دیوان محکم چند سے اپنی ذاتی عقیدت کے باعث لاہوری فوج کو بغیر کوئی نقصان پہنچائے واپس جانے دیا۔ اس بات کا کوئی ریکارڈ نہیں اور دوسرا یہ کہ آپ اس طرح کے رویے کی ایسے لوگوں سے بھلا کیسے توقع رکھ سکتے ہیں جو سکھوں کو ''بے دین'' لوگوں کی فوج سمجھتے ہوں اور ہتھیار ڈالنے کے باوجود انھیں معاف کرنے پر تیار نہ ہوں۔

4۔ لاہور دربار، صفحہ 13

5۔ دینا ناتھ نے رنجیت سنگھ کے بہترین اور باصلاحیت منتظم کی حیثیت سے جگہ بنائی تھی۔ اسے دیوان کے درجہ پر ترقی دی گئی اور بعد ازاں راجا کا خطاب دیا گیا۔

6۔ اٹریا والہ خاندان کی روایت کے مطابق جب ڈاکٹروں نے مہاراجا کے ٹھیک ہونے سے مکمل مایوسی کا اظہار کیا تو نہال سنگھ نے اس کے بستر کے گرد تین چکر لگائے اور خدا سے دعا کی کہ مہاراجا کو ٹھیک کر دے اور اس کی جگہ اس کی جان لے لے۔ اس واقعہ کے چند روز بعد ہی مہاراجا بالکل ٹھیک ہو گیا جب کہ نہال سنگھ کا انتقال ہو گیا۔
تاہم سوہن لال نے اس واقعے کا کبھی حوالہ نہیں دیا بلکہ اس نے لکھا ہے کہ سردار کی موت چوب چینی نامی ایک نشہ آور دوا کی زیادتی کی وجہ سے واقع ہوئی۔ یہ کہانی بابر کی اس کہانی سے ملتی جلتی ہے جس میں اس کے اپنے بیمار بیٹے ہمایوں کے بستر کے گرد اسی طرح کے چکر لگانے اور اس کی جگہ اپنی جان کا نذرانہ پیش کرنے کی بات کی گئی ہے۔

باب 12

1۔ غلام جیلانی، جنگِ ملتان

2۔ پھلا سنگھ کے جارحانہ حملوں کو بہت سے لوگوں نے خراجِ تحسین پیش کیا ہے جن میں پریم سنگھ بھی شامل ہے۔ سوہن لال نے درست کہا ہے کہ اس وقت پھلا سنگھ اٹک کے مقام پر تھا۔ رنجیت سنگھ نے بھی انگریز سیاح ولیم مور کرافٹ کو بتایا کہ نواب مظفر خان کے پانچ سو سپاہیوں کو دربار کی فوج نے گھیر لیا تھا تاہم ان کی جان بخش دی گئی۔ گریفن (رنجیت سنگھ،

صفحہ 187)اس پر یقین کرنے کو تیار نہیں اس کے مطابق تمام پانچ سو سپاہیوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا گیا تھا۔اس نے یہ بھی لکھا ہے کہ ملتان میں دربار کی فوج نے خوب لوٹ مار کی اور تقریباً20لاکھ سٹرلنگ دربار کے ہاتھ لگے جن میں پانچ لاکھ واپس لے لیے گئے۔

3۔ سوہن لال کے مطابق ملتان کو 6لاکھ روپے سالانہ کے عوض پشاور سے تعلق رکھنے والے دیوان شام سنگھ نامی شخص کے حوالے کر دیا گیا؛ایک لاکھ روپے انتظامی امور پر اٹھنے والے اخراجات کی مد میں طے پائے۔سیتارام کوہلی کے مطابق ملتان سے حاصل ہونے والی اصل آمدن 6لاکھ 80ہزار نوسو75روپے تھی (مہاراجا رنجیت سنگھ،صفحہ 148)

باب13

1۔ پنجاب اور شمال مغربی سرحدی صوبے میں یہ روایت عام ہے کہ جونہی رنجیت سنگھ کے ہاتھی نے دریا میں قدم رکھا دریا کا سیلابی پانی سکون میں آ گیا۔اس روایت یا داستان کا مقامی قبائل پر بہت نفسیاتی اثر ہوا:'خدا ہم خالصہ شد'یعنی خدا سکھوں کی طرف ہے۔

2۔ اکٹرلی بنام گورنر جنرل(1819)

3۔ دفترII،صفحہ 247

4۔ یہ دونوں 1811 میں مرنے والے گجرات کے صاحب سنگھ بھنگی کی بیوائیں تھیں،رنجیت سنگھ نے ان کے سر پر چادر ڈالی (چدر اندازی) جیسا کہ اس زمانے میں پنجاب کی جاٹ برادری کی رسم تھی۔

5۔ مورکرافٹ،جلد69،29جولائی 1821

6۔ 27اکتوبر 1821

7۔ مہاراجا نے مورکرافٹ کے خلاف کارروائی کرنے پر گورنر جنرل کا شکریہ ادا کیا(خط بنام گورنر جنرل،2فروری 1822،فارسی میں لکھے گئے خطوط،جلد 70)۔مہاراجا نے لکھا:''دوستی کو شبنم کے تازہ قطروں سے تازگی ملی۔اس سے مجھے اتنی ہی مسرت ہوئی جتنی بلبل کو گلاب کی پتی اپنی چونچ میں پکڑ کر ہوتی ہے۔''

باب14

1۔ رنجیت سنگھ کو آس پاس کی ریاستوں میں موجود اس کے کارندوں نے ان یورپی باشندوں کی لاہور کی طرف پیش قدمی کے بارے میں بتایا۔اس نے 12مارچ 1822 کو ایک خط میں پشاور میں موجود سرکاری مخبر کی سرزنش کرتے ہوئے دریافت کیا کہ اس نے دربار کو ان فرنگیوں کی آمد سے بے خبر کیوں رکھا اسی طرح رنجیت سنگھ نے لاہور میں موجود سرکاری مخبر سے یہ وضاحت بھی طلب کی کہ وہ شاہدرہ میں دو فرنگیوں کی آمد کے بارے میں دربار کو باخبر رکھنے میں کیوں ناکام رہا۔

2۔ الرڈ کا مکان ابھی تک لاہور میں موجود ہے۔ مشرقی بازار میں موجود یہ گھر ورسائی کا منی ایچر لگتا ہے۔ یہیں پر اس کی بیٹی شارلٹ کی قبر موجود ہے جبکہ الرڈ کو شہر سے باہر قبرستان میں دفن کیا گیا۔

باب 15

1۔ جہانگیریہ میں ایک ڈرامائی صورتحال پیدا ہوگئی جب جے سنگھ اتریاوالہ جو دو برس قبل لاہور چھوڑ کر افغانوں کے ساتھ مل گیا تھا اچانک قلعہ میں آن پہنچا۔ اسے مہاراجا کے حضور پیش کیا گیا تو وہ مہاراجا کے قدموں میں گر گیا اور معافی کا خواستگار ہوا۔ مہاراجا نے بگڑے ہوئے سردار کو سینے سے لگاتے ہوئے معاف کر دیا۔ جے سنگھ نے افغان کیمپ چھوڑنے کی وجہ کچھ یوں بیان کی کہ وہ پشاور میں عظیم خان کے دربار میں موجود تھا جب تیس سکھوں کے سر ایک طشتری میں رکھ کر افغان دربار میں پیش کیے گئے۔ وہاں موجود ایک درباری نے نفرت سے ایک سر کو ٹھوکر لگائی۔ جے سنگھ پر اس واقعے کا بہت اثر ہوا اور موقع ملتے ہی وہ افغان دربار چھوڑ کر اپنے ہم وطنوں سے آن ملا۔

2۔ 29 اکتوبر 1824

3۔ سر اولف کرو اس جنگ کی مختلف تصویر پیش کرتا ہے، پٹھان صفحہ 269

4۔ 11 اکتوبر 1822

5۔ رام آنند کی خطرناک شہرت نے اسے دیومالائی حیثیت دے ڈالی اور لوگ صبح کے وقت اس کا نام لینے سے بھی ڈرنے لگے کہ کہیں انھیں بھوکا رہ کر دن نہ گزارنا پڑ جائے۔

6۔ رنجیت سنگھ کی طرف سے فتح سنگھ کو قلعے کی تعمیر سے روکنے کا حکم اس کا علاقہ چھوڑ کر جانے کی وجہ بنا۔ فتح سنگھ ایک قلعہ تعمیر کر رہا تھا جبکہ مہاراجا کو اپنے سرداروں کا قلعوں کا تعمیر کرنا بالکل پسند نہیں تھا۔

باب 16

1۔ سوہن لال سوری کو بہادر سنگھ کا معاون مقرر کیا گیا تاہم اس کا کوئی تحریری ثبوت موجود نہیں۔

2۔ ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر، انڈین مسلمان، صفحہ 14

3۔ عطیاتِ طیبہ میں مرزا حیرت دہلوی لکھتا ہے کہ سید احمد شاہ نے مولانا شاہ محمد اسمٰعیل کی مشاورت کے بعد الہٰ آباد کے شیخ غلام علی رئیس کے ذریعے شمال مغربی سرحدی صوبے کے لیفٹیننٹ گورنر کو آگاہ کیا کہ وہ سکھوں کے خلاف جہاد کی تیاری کر رہا ہے اور اسے امید ہے کہ انگریز سرکار کو اس پر کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔ گورنر نے جواباً یہ واضح کیا کہ جب تک اس کے علاقوں میں امن عامہ کی صورتحال کو کوئی مسئلہ درپیش نہیں آتا انھیں اس کی سرگرمیوں پر کوئی اعتراض نہیں۔ گنڈا سنگھ،

اینگلو سکھ جنگیں، خفیہ خط و کتابت، صفحہ 30

4۔ سوہن لال لکھتا ہے کہ یار محمد لیلی کی ملکیت سے دستبردار ہوگیا، یہ مہاراجا کے اصطبل کا سب سے مشہور گھوڑا تھا۔ لیلی اکتوبر 1827 کو لاہور پہنچا۔ دیگر مورخین کے مطابق یار کے بھائی سلطان محمد نے یہ گھوڑا جنرل ونچر کے حوالے کیا تھا (گریفن صفحہ 102، جلد 1957)

5۔ 6 جون 1827

6۔ میمائرز آف الیگزنڈر گارڈنر، صفحہ 171، سراولف کرو نے اس جھڑپ کی مختلف تصویر پیش کی ہے، پٹھان، صفحہ 301

7۔ امدات التوارخ، دفتر III، حصہ اول، صفحہ 35

باب 17

1۔ بخارا کے سفر، جلد اول، صفحہ 119

2۔ برنز کی شیخوسکھوں کے بارے میں ایک اور رائے قابلِ توجہ ہے: ''اس میں کوئی شبہ نہیں کہ سکھ جدید ہندوستان کی سب سے ابھرتی ہوئی قوم ہے۔ اگر چہ 400 برس پہلے انھیں کوئی جانتا نہیں تھا، آج اس قوم کے خدوخال اپنے ہمسائیوں سے اتنے ہی مختلف ہیں جتنا کہ ہندوستانیوں کے چین کے باشندوں سے۔ جسمانی خدوخال میں ایک خاص قسم کی یکسانیت اور لمبوترے چہرے بشرے کی وجہ سے وہ دوسری قوموں اور قبیلوں سے ممتاز نظر آتے ہیں۔ کوئی بھی قوم یا قبیلہ خاص قسم کے خدوخال اور رسوم و رواج کی بنا پر دوسروں سے مختلف نظر آتا ہے اور یہ بات قابلِ فہم بھی ہے مگر تھوڑے عرصے ہی میں ایک لاکھ کے قریب لوگوں کا ایک ہی طرح برتاؤ کرنا اور اپنی علیحدہ قومی شناخت بنانے میں کامیاب ہو جانا، جیسا کہ ہم اسرائیل کی قوم کے بچوں میں دیکھتے ہیں، بہت غیر معمولی بات ہے، بخارا کے سفر، 1839، جلد اول صفحہ 76

3۔ بخارا کے سفر، جلد اول صفحہ

4۔ بخارا کے سفر، جلد اول، صفحہ 132

5۔ جلد اول، صفحہ 133

6۔ بخارا کے سفر، جلد اول، صفحہ 140

7۔ بخارا کے سفر، جلد اول، صفحہ 143

8۔ اسی سفر کے دوران یہ واقعہ پیش آیا کہ ایک انگریز نے عزیز الدین سے دریافت کیا کہ مہاراجا کی کون سی آنکھ بے نور تھی۔ فقیر عزیز نے جواب دیا، ''مہاراجا کے چہرے کی روشنی ہی اتنی زیادہ ہے کہ میں نے کبھی اس کی بے نور آنکھ کے

بارے میں جاننے کی کوشش نہیں کی۔"

9۔ ان کے نزدیک لاٹ صاحب کمپنی کے ملازم تھے اور کمپنی تاج برطانیہ کے ماتحت تھی پس کسی مہاراجا کے شایانِ شان نہیں تھا کہ وہ کسی ماتحت کے ساتھ برابری کی سطح پر ملاقات کرے۔ امرناتھ، ظفرنامہ، صفحہ 205

10۔ اس ملاقات کا احوال جیمز سکنر یا 'بوڑھے سکندر' کی دی گئی معلومات پر مبنی ہے۔ سکنر ایک اینگلوانڈین تھا جو اپنے مشہور دستے سکنر کے گھوڑے کے ہمراہ پریڈ کیا کرتا تھا انھیں "زرد لڑکے" بھی کہا جاتا تھا (انکی جلد کے رنگ کی وجہ سے) ملٹری میمائرز، لیفٹیننٹ کرنل جیمز سکنر، بیلی فراسر، جلد 2، صفحہ 1851

11۔ سوہن لال، دفتر II، صفحہ 89

12۔ سوہن لال لارڈ ولیم کی طرف سے لیڈی بنٹنک کو کشتی سے اترنے میں مدد دینے پر مہاراجا کا ردِعمل بیان کرتا ہے:
'جونہی بیگم لیڈی صاحبہ نے دریا عبور کیا، نواب صاحب (لارڈ بنٹنک) خود آگے بڑھا اور اس کا ہاتھ پکڑ کر کرسی پر بیٹھنے میں مدد دی۔ جس طرح سے اس نے یہ سارا عمل کیا اس سے صاف ظاہر تھا کہ اس کا دل لیڈی بنٹنک کے لیے دھڑکتا ہے۔ مہاراجا نے بھی یہ نظارہ دیکھ کر کہا کہ یہ سب دیکھ کر اسے بی بی موہراں یاد آگئی۔ وہ بھی موہراں کے لیے ایسا ہی پیار محبت محسوس کرتا تھا اور اس سے ایک گھڑی کی جدائی بھی برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ سوہن لال، دفتر III، صفحہ 93

13۔ سکنر، جلد I

14۔ سوہن لال، دفتر III، صفحہ 93

15۔ ڈاکٹر رنجیت سنگھ سے ہرگز خوفزدہ نہیں تھا۔ لاہور پہنچنے پر اس نے پہلا کام یہ کیا کہ شہر کی دیواروں پر پوسٹر لگوا دیے جن میں کافروں کو جہنم کی آگ سے خبردار کیا گیا تھا اور حضرت عیسیٰؑ کو واحد نجات دہندہ قرار دیا گیا تھا۔ رنجیت سنگھ نے ایک پیغام کے ذریعے نرم لب و لہجے میں انکی سرزنش یوں کی: "ایسے الفاظ کو بولنے یا سننے سے اجتناب برتنا چاہیے" اور اسے دربار آنے کی دعوت دی کیونکہ مہاراجا کو لوگوں کا خدا اور مذہب کے موضوع پر بولنا اچھا لگتا تھا۔ ڈاکٹر بڑھی ہوئی داڑھی (جو مختلف سفروں کے درمیان بڑھ گئی تھی) کے ساتھ دربار پہنچا (اس کا ساتھی الرڈ اسے خبردار کرچکا تھا کہ رنجیت سنگھ کو لمبی خوبصورت داڑھیاں پسند ہیں)۔ جب وہ دربار پہنچا تو رنجیت سنگھ دل بہلا رہا تھا۔ یہ ناچ گانا پکے مسیحی شخص کو پسند نہیں آیا۔ وہ ایک فقیر ضرور تھا مگر انگریز فقیر تاہم اس نے رنجیت سنگھ کی طرف سے پیش کی گئی شراب ضرور پی۔ "نہایت ہی فضول مشروب؛ وہسکی سے بھی زیادہ گرم بلکہ سچ پوچھیں تو آگ کی طرح جل رہا تھا" ڈاکٹر وولف کے سفر اور مہمات، جلد II، صفحہ 68

16۔ وولف کے سوانح نگار کے مطابق جب وولف نے یہ آخری اطلاع شملہ میں موجود لارڈ بنٹنک کو دی تو گورنر جنرل نے

جواب دیا،''بدقسمتی سے ہندوستان کے تمام مقامی لوگوں کی یہی رائے ہے۔''

وولف کو مذہب کے معاملے پر رنجیت سنگھ کی آزاد خیالی اور یہ سوچ کہ زبردستی کسی کا مذہب تبدیل کرنا نہایت غلط اقدام ہے بہت پسند آئی۔رنجیت سنگھ نے مسلمانوں پر یہ بات اچھی طرح واضح کر دی تھی کہ تلوار کی نوک کسی مذہب کے سچے یا جھوٹے ہونے کا ثبوت نہیں:''رندجد سنگھ کو ہی لیجیے۔اس کا نام لاہور سے بخارا تک دہشت گردی کی علامت بنا ہوا ہے۔اس کی تلوار مسلمانوں کو ہر چھوٹی بڑی جنگ میں شکست سے دوچار کر چکی تھی۔''

وولف کی مہاراجا سے ایک اور قدرے غیر متوقع ملاقات بھی ہوئی۔چونکہ وہ اپنی جانب سے مہاراجا سے دوبارہ نہ ملنے کا سوچ کر اپنی داڑھی صاف کروا چکا تھا اور لاہور سے روانہ ہو کر امرتسر سے گزرتا ہوا برطانوی علاقوں کی جانب رواں دواں تھا۔رنجیت سنگھ کے ایک پیغام رساں نے اسے راستے میں جالیا اور بتایا کہ رنجیت سنگھ اس سے ملنا چاہتا ہے۔مسیحی مبلغ تشویش کے عالم میں واپس لاہور کی طرف روانہ ہوا۔رنجیت سنگھ نے اسے دیکھ کر قہقہہ لگایا''ارے تم اپنی داڑھی چھوڑ آئے؟''،''حضورِ والا کے فوجی جنرل کے گھر میں اس کی خاطر خواہ دیکھ بھال کی گئی ہے''۔''اگر ایسا ہے تو جس روز بھی وہ مجھے ملا میں اس کی ناک کٹوا دوں گا۔''ڈاکٹر وولف کے سفر اور مہمات، جلد II، صفحہ 72

17۔ ڈاکٹر وولف کے سفر اور مہمات، جلد II، صفحہ 7

18۔ بخارا کا سفر، جلد II، صفحہ

پنجاب کے بارے میں برنز کی سوچ بہت خیال آفریں ہے۔''ہم بہت سے دیہاتوں سے ہو کر گزرے۔وہاں مکانات بالکنی نما کچی مٹی اور سوکھی لکڑی سے بنائے گئے ہیں۔ان مکانوں میں بسنے والے اچھے کپڑوں میں ملبوس خوش دکھائی دے رہے تھے۔'' پٹی کے مقام پر برنز کو رنجیت سنگھ کے اصطبل میں جانے کا اتفاق ہوا جہاں اس نے رنجیت سنگھ کے دھانی نسل کے عمدہ تھارو پریڈ گھوڑے دیکھے۔اس نے سکھوں کو اپنے مسلمان ہم وطنوں سے کچھ تحقیر آمیز سلوک برتتے ہوئے بھی دیکھا۔گھوڑوں کو کوئی بیماری لاحق ہو چکی تھی اور ایک مسلمان ڈاکٹر ان کا علاج کر رہا تھا۔سکھوں نے اِس اچھے برتاؤ پر اس کی عبادت گاہ کو خوبصورت بنا دیا تھا۔''سکھ قوم دوسرے مذاہب کے ماننے والوں کے لیے بہت روشن خیال ثابت ہوئے ہیں اور ہندوستان میں ان کی اس عادت کا میں نے کئی بار تذکرہ کیا ہے۔''

19۔ بخارا کے سفر، جلد II، صفحہ 18

20۔ بخارا کے سفر، جلد II، صفحہ 19

21۔ بخارا کے سفر، جلد II، صفحہ 23

22۔ جب برنز لاہور سے افغانستان کے لیے روانہ ہوا اس کے دوست ایم کورٹ نے ایک تفصیلی دستاویز اس کے حوالے کی

اور چند علاقوں کے بارے میں یہ کہہ کر خبردار کیا ''لاہور کے علاوہ ان علاقوں میں مے نوشی سے اجتناب کرنا۔ مے نوشی کے لیے یورپ آنے کا انتظار کرو۔''

23۔ بخارا کے سفر، جلد II، صفحہ 28

24۔ بخارا کے سفر، جلد II، صفحہ 28

25۔ یہاں دیئے گئے اقتباسات وکٹر یاکموں کی کتاب اے ٹریول ان ٹو انڈیا سے لیے گئے ہیں (1835 ایڈیشن) جلد II

26۔ 'جب تک میری یہ خواہش پوری نہیں ہو جاتی کہ برطانوی حکومت اپنی سرحدوں کو دریائے ستلج سے دریائے سندھ تک وسیع کر دے اور دریا کی دوسری طرف روسی آ کر قبضہ کر لیں میں لوگوں پر مسلط موجودہ نظام حکومت برداشت نہیں کر سکتا'۔ جلد اول، صفحہ 335

27۔ یاکموں، جلد II، صفحہ 24

28۔ یاکموں، جلد II، صفحہ 24

29۔ دربار کے ریکارڈ میں اسے افلاطونِ زماں کا خطاب دیا گیا ہے۔

30۔ یاکموں، جلد II، صفحہ 47

31۔ یاکموں، جلد II، صفحہ 22

32۔ یاکموں، جلد II، صفحہ 25

33۔ یاکموں، جلد II، صفحہ 25

34۔ سوہن لال، دفتر III

35۔ شاہی حرم میں بہت سی عورتیں موجود تھیں ان میں سے کچھ تو باقاعدہ رسم کے بعد حرم میں شامل کی گئی تھیں جبکہ دیگر (جن میں اکثریت بیواؤں کی تھی) خاموشی سے حرم میں آ کر رہنے لگ گئی تھیں۔ مہاراجا نے ان پر اپنی چادر ڈال دی تھی (چدر اندازی)؛ دیگر عورتوں میں وہ ملازمائیں شامل تھیں جو آئیں تو مہاراجا کے محل میں کام اور نوکری کی غرض سے مگر مہاراجا کی نظر ان پر پڑی اور اس نے انھیں اپنے حرم کے لیے منتخب کر لیا۔ مہاراجا کے ساتھ تعلق رکھنے والی عورتوں کی فہرست میں مندرجہ ذیل نام شامل ہیں:

i) مہتاب کور (شادی 1796، انتقال 1813)۔ مہتاب کور سے مہاراجا کے تین لڑکے پیدا ہوئے: ایشر سنگھ (جو بچپن میں ہی فوت ہو گیا)، شیر سنگھ اور تارا سنگھ۔

ii) راج کور (مائی نکیاں) شادی 1798، راج کور عرف مائی نکیاں کھڑک سنگھ کی ماں تھی۔ مائی نکیاں کا انتقال 1818 میں ہوا۔

(iii موہراں (شادی:1802)

(iv.v رتن کور اور دیا کور، یہ دونوں گجرات کے صاحب سنگھ بھنگی کی بیوائیں تھیں۔ ان کی شادی 1812 میں ہوئی۔ رتن کور ملتانا سنگھ کی ماں تھی جبکہ دیا کور نے کشمیرا سنگھ اور پشورا سنگھ کو جنم دیا۔

(vi چاند کور (شادی:1815)

(vii لچھمی (شادی:1820) لچھمی گوجرانوالہ کے دیسا سنگھ سدھو کی بیٹی تھی۔

(viii مہتاب کور (شادی:1822)

(ix. x گڈاں اور اس کی بہن بانسو، یہ دونوں بہنیں کانگڑہ کے راجا سنسر چند کی بیٹیاں تھیں۔

(xi شمن کور (شادی:1832)

(xii گلبہار بیگم۔

(xiii جنداں، یہ دلیپ سنگھ کی ماں تھی۔

دیگر ناموں میں گلاب کور، رام دیوی، رانی دیوی، بنت، ہر دیوی اور دانو شامل ہیں۔

برطانوی حکومت 1852 میں جند کلاں کو رنجیت سنگھ کی بیوہ کی حیثیت سے ماہانہ پنشن ادا کر رہی تھی۔ جند کلاں اور اس کی ماں کو رنجیت سنگھ نے 1832 میں طلب کیا تھا تاکہ ان کی شکایت کا ازالہ کیا جا سکے۔ انھیں عبدالسلام خان نامی ایک شخص سے شکایت تھی جس کے بیان کے مطابق جند کلاں کی ماں نے اس کی منگنی عبدالسلام سے کر دی تھی مگر اب اس کی شادی پر تیار نہیں۔ رنجیت سنگھ نے عبدالسلام کا دعویٰ خارج کرتے ہوئے ماں بیٹی کو اپنی داشتاؤں کے لیے قائم کوارٹروں میں رکھ لیا۔ جند کلاں، گل بیگم اور مہجراں کے علاوہ رنجیت سنگھ کی مسلمان داشتائیں بھی تھیں جن میں تیبو، جنت بی بی اور گوبی کے نام شامل ہیں۔

شہزادہ دلیپ سنگھ نے 1889 میں 'لاوالتیغ' کو ایک انٹرویو دیتے ہوئے کہا تھا: 'میں اپنے باپ کی 46 بیویوں میں سے ایک کی اولاد ہوں'۔

36۔ نظام نے ہیروں سے جڑی ایک چھتری مہاراجا کو بھجوائی جو اس نے گولڈن ٹیمپل کی نذر کر دی۔ آج بھی یہ چھتری گولڈن ٹیمپل کو سجائے ہوئے ہے۔

باب 18

1۔ آج بھی پٹھان عورتیں اپنے بچوں کو یہ کہہ کر ڈراتی ہیں: 'چپ ہو جاؤ، نہیں تو نلوا آ جائے گا'

2۔ 'اگر اپنی مغرور اور خودسر طبیعت کے باعث مہاراجا نے میری درخواست پر توجہ نہیں دی تو میں (دوست محمد) کمر کس کے

جنگ کے لیے تیار ہو جاؤں گا اور تمہارے پھولوں کے گلشن میں کانٹا بن کر دکھاؤں گا۔ میں ایسے جنگجوؤں کی فوج کی قیادت کرتا ہوا آؤں گا جنھیں مرتے دم تک لڑتے رہنے کا جنون ہے۔ اور اگر ایسا ہوا تو (مہاراجا دیکھے گا) میں کس طرح ہر طرف تباہی اور بربادی پھیلاتا چلا جاتا ہوں۔"

اس کے خط کا رنجیت سنگھ نے یہ جواب دیا: "ہم نے سرکش سرداروں کے سر توڑے ہوئے ہیں اور اپنے دشمنوں کو لوہے کی بیڑیاں پہنائی ہیں۔ اگر دوست، لالچ اور حرص میں اندھا ہو کر اپنی چھوٹی سی فوج کے ہمراہ جنگ کرنا چاہتا ہے تو اسے آلینے دو ہم اس کا سامنا کرنے کے لیے تیار ہیں۔" لاہور دربار، صفحہ 178۔

3۔ یورپین ایڈونچرز ان نارتھ انڈیا، صفحہ 257۔

4۔ لاہور دربار، صفحہ 140۔

5۔ 6 مارچ 1837۔

6۔ افغانیوں کے پاس اس اقدام پر اکڑنے کے لیے کچھ خاص نہیں تھا۔ اگرچہ اکبر خان خود کو فاتح کہتا رہا۔ سکھوں نے بھی خاموشی سے شکست تسلیم کر لی اور ان کیلئے ان کے سردار کی موت کا نقصان ناقابلِ تلافی تھا۔ میسن جلد II، باب 16۔

7۔ 29 مئی 1837۔

باب 19

1۔ فین، صفحہ 120

باب 20

1۔ 11 ستمبر 1837

2۔ میسن جو برنز کے ساتھ موجود تھا لکھتا ہے، "اس طرح برطانوی حکومت کا ایک نہایت ہی غیر معمولی مشن اختتام پذیر ہوا؛ اپنے طریقِ کار اور نتائج کے حوالے سے ایک غیر معمولی مشن۔ اس میں کوئی شبہ نہیں کہ دونوں اطراف نے ایک دوسرے پر الزامات لگائے۔ حکومت نے ایک شخص کو اپنا نمائندہ بنا کر بھیجا جس کے پاس کوئی اختیار نہیں تھا نہ ہی اسے کوئی ہدایات دی گئی تھیں۔۔ جلد II، باب 17۔

3۔ 12 مئی 1838

4۔ اوسبارن کا قول سیسل گپتا لمیٹڈ کے زیر انتظام چھپنے والی "دا کورٹ اینڈ کیمپ (1952)" سے لیا گیا ہے۔

5۔ اوسبارن صفحہ 29

6۔ صفحہ 31

7۔ صفحہ 35

8۔ صفحہ 38

9۔ شہامت علی، صفحہ 23 تا 35۔ شہامت علی کے مطابق اتنی بڑی فوج پر اٹھنے والا خرچہ تقریباً ایک کروڑ 27 لاکھ 96 ہزار چار سو 82 روپے سالانہ تھا یعنی ریاست کی آمدن کے ایک تہائی سے زیادہ۔ اس کے علاوہ جاگیرداروں کے پاس پیدل سواروں کی 9 رجمنٹیں، گھڑسواروں کی پانچ، 87 توپیں اور 6 ہزار چار سو 60 نجی سپاہی تھے۔

10۔ لاہور دربار نے بڑے پیمانے پر تیاریاں کی تھیں۔ ایک لاکھ مرغ، بیس ہزار من گندم، 700 من شراب، گورنر جنرل کی پارٹی کے لیے راشن روزانہ چار ہزار مرغوں اور پندرہ ہزار انڈوں پر مشتمل تھا۔ پنجاب کی تمام مشہور رقاصاؤں کو اس پارٹی میں مدعو کیا گیا تھا۔ اس ملاقات کے بہت سے چشم دید گواہ ہیں، دربار کی طرف سے سوہن لال؛ انگریزوں کی جانب سے نوجوان لیفٹیننٹ فین، اوسبارن، لارڈ آک لینڈ کی بہن عزت مآب ایملی ایڈن۔ ایملی ایڈن نہ صرف بہترین مصورتھی بلکہ ہلکے پھلکے موضوعات پر بہت اچھا لکھتی تھی۔ اس بیان کو بھی ان سب کی تحریروں سے اخذ کیا گیا ہے۔

11۔ ایملی ایڈن، اپ دا کنٹری، جلد ا، صفحہ 127

12۔ جزل آف اپر ہندوستان، فرنچ، 1854 صفحہ 80

13۔ فین جلد ا، صفحہ 320

14۔ اپ دا کنٹری، جلد ا، صفحہ 284

15۔ اپ دا کنٹری، جلد ا، صفحہ 286

16۔ اس سے قبل میکناٹن کے ساتھ ایک ملاقات میں رنجیت سنگھ نے اس سے دریافت کیا تھا کہ کیا لارڈ نواب صاحب اچھے مے نوش ہیں۔ لارڈ میکناٹن نے پارٹی کا لطف لینے کے لیے اثبات میں جواب دیا۔

17۔ اپ دا کنٹری، جلد ا، صفحہ 298

18۔ فرانسیسی سیاح امرتسر کے شاندار نظاروں سے بہت متاثر ہوا۔ 12 دسمبر 1838 کو اپنی ڈائری میں وہ لکھتا ہے: 'رنگ برنگی چیزیں میری نظروں کو لبھاتی ہیں، اور خود بخود مشرقی حسن پر مبنی چیزوں کی جانب مڑ جاتی ہیں جس سے مجھے خاص خوشی حاصل ہوتی ہے، مختلف رنگوں میں ملبوس لمبی قطاریں اور چمکدار کرپانوں اور سمور کی بنی جیکٹیں دیکھ کر میں دیوانہ ہوا جاتا ہوں۔

19۔ اپ دا کنٹری، جلد II، صفحہ 25 تا 35

باب 21

1۔ ہنگری کا ہومیو پیتھک ڈاکٹر مارٹن ہونگبر گر۔

2۔ ''وہ برانڈی جس میں تیز ترین مرکبات شامل ہوتے ہیں اور ہر طرح کے جانور کے گوشت کی آمیزش سمیت خوشبوئیں، قیمتی پتھر، افیون، مختلف قسم کے پودوں کا عرق شامل ہوتا ہے اتنی تیز ہوتی ہے جتنا کہ شراب! مجھے شیطان کے اس جام کا تجربہ گزشتہ شام ہوا اور اس کا ذائقہ کافی بہتر پایا تاہم اگلی صبح میں نے خود کو خاصا بددل اور کبیدہ خاطر محسوس کیا''۔ بیرن ہگل، ٹریولزان کشمیر اینڈ پنجاب، صفحہ 298

3۔ فقیر عزیز الدین کا بیرن ہگل کو دیا گیا موقف کچھ مختلف ہے۔ ''اس نے (فقیر عزیز نے) مجھے بتایا کہ ایک نہایت گرم اور لُو والے روز مہاراجا تمام دن گھوڑے پر سوار گھومتا رہا۔ سارے دن کی گھڑ سواری نے مہاراجا کو بہت تھکا دیا اسے لُو بھی لگ گئی۔ اپنی عادت کے مطابق مہاراجا نے خوراک کے بارے میں کوئی فکر نہیں کی اور سارا دن تربوز کھاتا رہا (مہاراجا کو تربوز بہت پسند تھے)۔ اسی روز شام کو تیز طوفان آیا اور کشمیر سے چلنے والی سرد ہواؤں نے درجہ حرارت گرا دیا جس سے اچھی خاصی سردی ہوگئی۔ اس طوفان میں مہاراجا کافی دیر تک گھوڑے پر سوار گھومتا رہا تاہم طوفان کی شدت کے باعث اس کے گھوڑے کی رفتار زیادہ نہیں تھی۔ گھومتے گھومتے مہاراجا ایک جھونپڑی کے سامنے آکر رک گیا مگر اس خستہ حال مکان یا جھونپڑے نے مہاراجا کو بارش سے بچنے میں کوئی مدد نہ دی اور وہ گیلے کپڑوں سمیت جھونپڑے کی دیوار کے قریب بیٹھا ٹھٹھرتا رہا۔ تیز اور سرد ہوا کے تھپیڑے مسلسل اس کے جسم کی کپکپی میں اضافہ کر رہے تھے۔ اپنے خیمے تک پہنچتے پہنچتے مہاراجا کو آدھی رات ہوگئی خیمے میں پہنچ کر بھی مہاراجا نے اپنی طبیعت اور صحت کو کوئی اہمیت نہیں دی۔ کوئی بھی اسے دوا لینے یا کچھ احتیاطی تدابیر کرنے پر مجبور نہیں کر سکتا تھا۔ تمام رات وہ معدے کے درد کی وجہ سے تڑپتا رہا اور جب وہ کسی کو مدد کے لیے پکارنے کی کوشش کی تو اسے منہ میں موجود اپنی زبان بھاری محسوس ہوئی اسے اپنا بایاں ہاتھ اور بایاں پاؤں بھی بے جان لگے۔ جب ایک ملازم نے اس کی یہ حالت دیکھی تو فوراً فقیر عزیز الدین کو اطلاع دی۔ فقیر عزیز الدین نے آکر دیکھا کہ مہاراجا کا چہرہ ایک طرف کھچ گیا تھا اور وہ کوشش کے باوجود بھی کوئی جملہ ادا کرنے سے قاصر تھا۔ مجھے بالکل علم نہیں کہ مہاراجا کی صحت کی فوری بحالی کے لیے کونسے اقدامات اٹھائے گئے لیکن ہندو رسم و رواج کے مطابق کستوری استعمال کی گئی ہوگی اور وہ بھی خاصی مقدار میں۔ اسے واپس لاہور لایا گیا جہاں اس کی طبیعت قدرے بہتر ہوئی اور ڈاکٹر میکگر یگر کو لدھیانہ سے بلوایا جانے لگا اور رنجیت سنگھ کو اس کی نگرانی میں دے دیا گیا۔

4۔ بیرن ہگل، ٹریولزان کشمیر اینڈ پنجاب، صفحہ 327

5۔ الرڈ کی موت کی خبر کا احوال سوہن لال کی 30 جنوری 1839 کی ڈائری میں ملتا ہے۔ ڈائری کے مطابق: ''الرڈ

صاحب نے اس فانی دنیا کو الوداع کہا اور نا قابلِ علاج قبض کے باعث سفر آخرت پر روانہ ہو گئے۔''

6۔ سوہن لال 22 اپریل 1939 کی ڈائری میں لکھتا ہے ایک فرانسیسی ڈاکٹر نے ایسی دوا تجویز کی جو اس کے بقول فالج کے خلاف بارود کا کام دے گی۔ اس دوا کو پہلے ہاتھی سدھانے والے ایک مفلوج شخص پر آزمایا گیا اور نتیجہ سو فیصد درست نکلا۔ تاہم اس دوا کا مہاراجا پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اسے ابرق، الائچی، تباشیر (جو رنجیت سنگھ کے بقول ایک سو برس سے بھی زیادہ پرانی تھی) اور دیگر میوہ جات سے تیار کردہ کشتہ دیا جاتا رہا۔ اس دوا کا بھی رنجیت سنگھ پر کوئی اثر نہیں ہوا۔

7۔ یہ نہایت ہی عجیب اتفاق ہے اور ایسا اس کے لاہور میں بطور فاتح داخل ہونے کے ٹھیک چالیس روز بعد ہوا (ان تاریخوں کا حساب بکرمی کیلنڈر کے مطابق کیا گیا ہے)۔

8۔ لاہور اخبار جون 1939

9۔ ہونگبر گر، تھرٹی ایئرز ان دا ایسٹ، صفحہ 102، امدات التواریخ، دفتر III، صفحہ 156

10۔ لاہور اخبار، جون 1839

11۔ ہونگبر گر، تھرٹی ایئرز ان دا ایسٹ، صفحہ 103

''مہاراجا رنجیب سنگھ'' خشونت سنگھ کی تحریر ہے جسے زبیر قریشی نے اُردو میں منتقل کیا ہے ترجمے کے حوالے سے یہ ان کی پہلی کاوش ہے مگر میں یقین سے کہہ سکتا ہوں کہ زبیر قریشی اگر کتاب سے ترجمے کا لفظ ہٹا دیں تو جو بھی یہ کتاب پڑھے گا اُسے یہی گمان گزرے گا کہ یہ کتاب لکھی ہی اُردو میں گئی ہے۔ انہوں نے اصل کتاب کو حرزِ جاں بنا کر ہی اس کا ترجمہ کیا ہے کچھ یوں کہ یہ اب ان کی اپنی تخلیق بن گئی ہے۔ اِس کتاب کا کوئی بھی حصہ اچھے شعر کی طرح پڑھنے والے کے دل میں اُتر جاتا ہے اور بہت دیر تک اپنے ہونے کا احساس دلاتا رہتا ہے۔ زبیر قریشی نے اِس تاریخی وتہذیبی دستاویز کی کڑیاں کچھ اِس انداز سے جوڑی ہیں کہ کہیں بھی کوئی جھول نہیں آنے دیا۔ یہ اب خشونت سنگھ کی نہیں بلکہ زبیر قریشی کی کتاب لگتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ خشونت سنگھ اگر آج زندہ ہوتے تو وہ خود بھی یہی کہتے۔ میں وثوق سے کہہ سکتا ہوں کہ زبیر قریشی کی اِس کتاب میں زندہ رہنے کی بھرپور صلاحیت موجود ہے یہ ان کے نام کو بھی زندہ رکھے گی اور ہمیشہ ان کی نمائندگی کا فریضہ انجام دیتی رہے گی۔

طارق نعیم

نومبر 2014ء

رنجیت سنگھ: پنجاب کا مہاراجا

تاریخ محض قوموں یا معاشروں کی میزان نہیں ہوتی۔ یہ افراد کے کم وبیش کا حساب بھی رکھتی ہے۔ یہ جنگیں جو عوام کی محفوظ بیٹھکوں سے دور کہیں میدانوں، سمندروں یا فضاؤں میں لڑی جاتی ہیں، یہ حکومتیں جو کبھی عدل کا ترازو تو کبھی جبر کا ڈنڈا تھام کر چلتی ہیں، یہ خارجہ پالیسیاں جو بیٹھے بٹھائے دوستوں کو دشمن اور دشمنوں کو دوست ثابت کر دیتی ہیں، بظاہر ہم عوام کی روزمرہ زندگیوں سے دور کہیں اور کارفرما ہوتی ہیں لیکن ان کے اثرات ہمارے جینز تک بدل دیتے ہیں۔ فلسفی اسے ارتقا کہیں یا محض تغیر۔ حقیقت یہ ہے کہ تاریخ ہماری ذات اور شعور ذات دونوں پر اسی شدت سے اثر انداز ہوتی ہے، جس طرح غذا اور آب وہوا ہماری جسمانی صحت پر۔

پچھلی تین چار صدیوں سے ہم انسان سائنس اور ٹیکنولوجی کے گرد باد میں اس طرح رقصاں رہے ہیں کہ انسانی اور سماجی علوم ہمارے ترجیحات کے زینے سے گرتے چلے گئے۔ نتیجہ یہ نکلا ہے کہ پوسٹ ہیومن ازم کے دعوے دار انسان کو مشین بنا دیکھ رہے ہیں۔ اب تو ہمیں بھی اپنے اردگرد گوشت پوست کے ڈھانچے چلتے پھرتے نظر آنے لگے ہیں۔

نہ تصور، نہ تفکر، نہ تکلم، نہ خیال

ایسے میں اگر کوئی انھی بھولے بسرے گم گشتہ علوم کو عام کرنے کی ٹھان لے جو انسان کو اپنا مرکز مان کر اس کے خدو خال پہچاننے کی کوشش میں مصروف ہوں، تو اسے مبارک باد دینا لازم آتا ہے اور یہ سطریں گویا ایک فرض کفایہ کے طور پر لکھی جا رہی ہیں۔

یہ کتاب محض مہاراجا رنجیت سنگھ کی فتوحات اور اس کی شخصیت کا احاطہ نہیں کرتی بلکہ خطۂ پنجاب کے ایک اہم دور کی ان حقیقتوں کو بھی بے نقاب کرتی ہے جسے ہم ہمیشہ دوسروں کی لکھی ہوئی تاریخوں میں کسی اور طرح سے پڑھتے آئے ہیں۔ بے شک کہا جا سکتا ہے کہ یہ بھی کسی اور کی لکھی ہوئی تاریخ ہے اور اس کے نقطۂ نظر سے بھی اختلاف کیا جا سکتا ہے۔ لیکن

اگر ایسا کہا جائے تو یہ اور بھی مبارک بات ہو گی کیوں کہ ایسی صورت میں لازم ہے کہ اس کے جواب میں اپنا نقطۂ نظر پیش کیا جائے۔

مجھے کئی مقامات پر خشونت سنگھ صاحب کے اخذ شدہ نتائج اور تبصروں سے اتفاق نہیں لیکن بہت سے مقامات ایسے بھی ہیں جو مجھے اپنے گزشتہ تصوراتِ تاریخ سے رجوع کرنے اور تائب ہونے کا موقع فراہم کرتے ہیں۔ خطۂ پنجاب کے باسیوں کو بھی سنجیدہ ہو کر اپنی تہذیبی و سماجی تاریخ پر غور کرنے کی ضرورت ہے۔ حیاتیاتی سطح پر جینے والے، ان گروہوں اور جتھوں میں بٹی ہوئی قومیتوں کے افراد تہذیب و تمدن کی نزاکتوں اور لطافتوں تک پہنچنے کے لیے کن کن منزلوں سے گزرتے ہیں، مجھے یقین ہے کہ ہماری یہ داستان انسان کی تمدنی تاریخ کا ایک اہم اور دلچسپ باب بن سکتی ہے۔

زبیر قریشی نے اس کتاب کا بہت عمدہ ترجمہ کیا ہے۔ وہ ایک متحرک نوجوان ہیں اور کچھ کر گزرنے کے جذبے سے مالا مال۔ کسی قوم کو اپنی افرادی قوت سے اور کیا درکار ہو سکتا ہے۔ انھوں نے خشونت سنگھ صاحب کی زندگی ہی میں اس کتاب کا ترجمہ شروع کر دیا تھا لیکن اب جب یہ مکمل ہو کر چھپ رہی ہے تو خشونت سنگھ اس دنیا میں نہیں ہیں۔ ان کی یاد منانے کا اس سے بہتر کوئی طریقہ نہیں ہو سکتا۔ دوسری اہم بات یہ ہے کہ تاریخ کی طرح ترجمہ کاری بھی، کم از کم پاکستانی معاشرے میں، بری طرح نظر انداز کیا جانے والا ہنر ہے۔ شاید اسی لیے ہمارے معاشرے سے برداشت، رواداری اور دوسروں کو سمجھنے اور ان سے ہم آہنگ ہونے کی صلاحیت روز بروز کم ہوتی جا رہی ہے۔ زبیر نے ترجمے کے میدان میں قدم رکھ کر اپنی اس ترجیح کا اعلان کیا ہے کہ وہ دیوار نہیں، پل بنانے پر یقین رکھتے ہیں اور اس جذبے پر وہ مبارک باد کے مستحق ہیں۔

نجیبہ عارف
نقاد، محقق، مترجم، صدر نشین، شعبۂ اردو (خواتین کیمپس)
بین الاقوامی اسلامی یونیورسٹی اسلام آباد